بالاکوٹ

تاریخ اسلام کا ایک لرزہ خیز اور خونیں ورق ناول کے پیرایہ میں

از

رئیس احمد جعفری

ناشرین

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز

لاہور حیدر آباد کراچی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

طابع — شیخ نیاز احمد

مطبع — علمی پرنٹنگ پریس، لاہور

اشاعت دوم — اکتوبر ۱۹۶۲ء

اشاعت چہارم — ۱۹۶۷ء

قیمت — [redacted]

850

SH. GHULAM ALI & SONS
PRICE
15/-
LAHORE

ناشرین

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز، ادبی مارکیٹ چوک انارکلی لاہور

HN/11
WEST WHARF

یہ سطریں میں بالاکوٹ میں بیٹھا لکھ رہا ہوں ——————— بالاکوٹ
جس کی سرزمین سے مرتبہ پست آسماں کا ہے، !

ایبٹ آباد سے بالاکوٹ تک کا راستہ نہایت دشوار گزار ہے، صرف دشوار گزار ہی نہیں خطرناک بھی، لیکن ذوق وشوق اور وجد وکیف کی حالت راستہ کی دشواریوں کو آسان بنا دیتی ہے، میں وہاں پہنچا اور عین مزار کے سامنے لوگوں سے پوچھتا رہا کہ اس سید خونین کفن کا مزار کہاں ہے ؟ کسی نے شمال کی طرف اشارہ کر دیا کسی نے جنوب کی طرف، کسی نے مغرب کی جانب، کسی نے مشرق کی جانب، اور کچھ ایسے صاف گو بھی تھے، جنہوں نے برملا، لاعلمی کا اعتراف کر لیا۔ آخر میں مزار پر پہنچا۔ قدآدم گھاس نے راستہ روکا، میں اسے چیرتا اور بہت سی تازہ اور کہنہ قبروں کو پھلانگتا ایک نسبتہً نمایاں قبر پر جا کر رُک گیا ——————— یہی سید احمد شہید کا مزار تھا، جس نے مسلمانوں کی سربلندی کے لئے کفر کے استیصال اور اعلائے کلمۃ الحق کے لیے اپنی گردن کٹا دی تھی۔ لیکن آج جس کی قبر پر نہ چھت ہے نہ سائبان، نہ سایہ دار درخت، نہ کوئی مجاور ۔

بر مزارِ ما غریباں نے چراغے نے گُلے
نے پرِ پروانہ سوزو نے صدائے بُلبلے

باچشمِ پُرنم فاتحہ پڑھا اور باہر نکل آیا۔
جی چاہا سید والا گہر کے دستِ راست اور جیش مجاہدین کے سالارِ اعلےٰ اور خاندان ولی اللہی کے گوہر شب چراغ اسمٰعیل شہیدؒ کے مزار کی زیارت بھی کر لوں۔

تحقیقِ بسیار کے بعد پتہ چلا، وہ یہاں سے ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ نا واقف لوگ خطرناک راستہ، کہیں دریاؤں کے پیچ وخم، کہیں کوہستانی نالوں کا زور شور کہیں نشیب کہیں فراز، قدم قدم پر پتھر، روڑے، سنگریزے، دوپہر کا وقت چلچلاتی دھوپ بار بار حوصلہ نے جواب دیا۔ ہمت نے ہار مانی، لیکن دل نے پوچھا: نہ گیا تو

عاشقوں کو روزِ محشر منہ نہ دکھلائے گا کیا؟

آخر گرتا پڑتا، لڑھکتا پھسلتا ایک ٹیلہ پر پہنچا۔ یہاں بھی وہی منظر نظر آیا۔ ایک سادہ سی قبر، نہ چھت نہ سائبان، نہ مجاور نہ پاسبان، دل نے کہا کیا راہِ اسلام میں سرفروشی کا صلہ یہی ہے، فدائے سرفروش نے جواب دیا۔

طمعِ فاتحہ از خلق نداریم نیاز
عشقِ من از پسِ من فاتحہ خوانم بانفیت

رئیس احمد جعفری
ڈاک بنگلہ۔ بالاکوٹ

فہرست مضامین

	صفحہ
نشۂ غفلت	۱۱
زمانہ بدلے گا ایک بار اور بھی	۱۵
مسجد کے زیر سایہ خرابات	۲۰
یہاں پگڑی اچھلتی ہے اسے میخانہ کہتے ہیں	۳۰
ابھی کیا تھا اور کیا سے کیا ہوگیا ؟	۳۸
فیض یہ کس کا ہے کرامت کس کی تھی ؟	۵۱
پنجاب پکار رہا تھا	۶۲
کوہ نور ہیرا	۷۰
یہ تھے مجاہد	۷۷
رنجیت سنگھ	۸۴
کرتار سنگھ	۸۹
مسلمان جاسوس	۹۷
حبیب خاں	۱۰۲
امرت کور	۱۱۴
قیدی	۱۲۰
قیدی مرگیا	۱۲۷

التفات	۱۳۲ صفحہ
سروجنی اور امرت کور	۱۳۶
سروجنی کی شرارتیں	۱۴۰
وہ جھکی جھکی نگاہیں	۱۴۹
لٹ گئی نگری دل کی	۱۵۳
پردہ کیا کچھ ہے کہ جی کو بھا گیا	۱۶۰
کوئی تدبیر بن نہیں آتی	۱۶۳
آنکھیں چار ہوئیں اور جھک گئیں	۱۶۶
میں ہوں اور آفت کا ٹکڑا وہ دل وحشی	۱۷۲
چل پگلی	۱۷۷
بوڑھا عشق	۱۸۰
سروجنی نے کیا کہا	۱۸۵
لاڈو	۱۹۰
ریشماں پر کیا گزری	۱۹۷
رنجیت سنگھ کا غصہ	۲۰۳
دولت رام کی گھبراہٹ	۲۱۰
بیچاری سروجنی	۲۱۳
سروجنی میں بالکل بے بس ہوں	۲۱۹
آخر آپ کیا چاہتے ہیں؟	۲۲۵
حبیب خاں اور کرتار سنگھ کی ملاقات	۲۳۱
وہ مہارانی کس جرم میں بنائی گئی	۲۳۷

زلیخا	۲۴۳ صفحہ
فقیر کا سفر بادشاہ کے دربار میں	۲۴۸
میں نے اپنا کام کر لیا	۲۵۳
دتورا	۲۵۸
آنے والا طوفان	۲۶۲
جوش جنوں	۲۶۸
انہیں کچھ نہ کہو	۲۷۳
سروجنی نے جان دے دی	۲۷۷
کرامت	۲۷۹
دو مجاہد	۲۸۲
ایک مورچہ	۲۸۶
ہم لڑیں گے	۲۹۰
ایک شبہ ایک شکایت	۲۹۴
عہد	۲۹۸
پس منظر	۳۰۳
سید بادشاہ کا آستانہ	۳۰۷
زلیخا اور فاطمہ	۳۱۴
پھر وہی باتیں	۳۲۰
بے کلی	۳۲۹
گلباز خاں	۳۳۴
کشمکش خیال	۳۴۰

زلیخا مجھے تم پر فخر ہے۔ صفحہ ۳۴۷
یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے ۳۵۲
ایک سردار، ایک فقیر، ایک درویش ۳۵۹
دوٹوک ۳۶۳
فتح شکست سے بدل گئی ۳۷۰
ہری سنگھ نلوہ ۳۸۰
یار محمد کا انجام ۳۸۸
کفر کا فتویٰ۔ نیا جال ۳۹۴
اب پڑھاؤ نماز ۴۰۶
نہیں بھولتا آہ رخصت کا وقت ۴۱۸
بالاکوٹ ۴۲۶
توبہ ۴۳۷
شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ ۴۴۴
بھائی کے آنسو۔ ۴۴۸

باب ۱

نشۂ غفلت

سارے ہندوستان پر تاریکی چھائی ہوئی ہے! ——— گھُپ اندھیرا!

ہندوستان کے مسلمان اب بھی حکمران ہیں، لال قلعہ اب بھی خاندان تیموری کے قبضہ میں ہے۔ تختِ طاؤس نادر شاہ اپنے ساتھ لے گیا، لیکن تختِ شہریاری اب بھی موجود ہے اور اس پر ایک مسلمان ——— بہادر شاہ ——— ہی متمکن ہے۔ لیکن اس تیموری حکمران میں وہ روح نہیں ہے، جو بابرؔ میں تھی، جو ہمایوں میں تھی۔ جو اکبر میں تھی، جہانگیر اور شاہجہان میں تھی جو اورنگ زیب میں تھی۔ بابر اس ملک میں پردیسی کی حیثیت سے آیا تھا، لیکن اس شان سے آیا تھا کہ بھارت کے دشت و در اس کے نام سے لرزنے لگے تھے۔ وہ آیا اور اس غیر اور اجنبی ملک کو اپنا نشیمن بنانے میں کامیاب ہو گیا۔

اس نے اس وسیع و عریض ملک پر اپنی شوکت کا جھنڈا لہرایا اور پھر یہ جھنڈا لہراتا ہی رہا۔ رانا سانگا کو اس نے جو نہ بھولنے والی شکست دی تھی۔ وہ آج تک تاریخ کے خزانہ میں کوہ نور کی طرح جگمگا رہی ہے۔ ہمایوں کو اس کے بھائیوں نے بہت تنگ کیا، تخت حکومت چھن گیا۔ شیر شاہ سوری مالک تاج و نگین بن گیا۔ لیکن ہمایوں کے عزم و استقلال میں فرق نہ آیا، وہ ایک شہر سے دوسرے شہر میں بھاگتا رہا۔ لیکن اس کے تیور وہی تھے دم خم وہی تھا اور بالآخر اس نے اپنی چھنی ہوئی حکومت واپس لے لی۔ وہ پھر ہندوستان کا بادشاہ بن گیا

اکبر نے نو عمری میں تختِ حکومت پر قدم رکھا، لیکن اقبال یاور تھا۔ بڑے بڑے

راجپوتوں کی شان کو خاک میں ملانے اور آن کو توڑنے کا سہرا اسی کے سر کلک قدرت نے لکھ دیا تھا۔ بغاوتوں، سازشوں، دراندازیوں اور فتنہ انگیزیوں سے سابقہ پڑا۔ لیکن یہ باتیں اس کے سمند عزم کے لئے مہمیز ثابت ہوئیں۔ وہ نئے ولولے نئے جوش اور نئے حوصلے کے ساتھ میدان میں ڈٹا رہا۔ آخر یہ بادل چھٹ گئے، اور وہ "مہابلی" مان لیا گیا۔ جہانگیر رندمزاج، اور لاابالی طبیعت کا آدمی تھا حسن پرست جام صہبا میں مست، نور جہان کا متوالا، لیکن اس کی شان بھی یہ تھی کہ جب دشمن کی خبر سنتا تو جام شراب پھینک دیتا۔ بزم آرائیوں سے دامن کھینچ لیتا۔ شراب ارغواں اور حسن جواں سے منہ موڑ لیتا، ایک بانکے سپاہی کی طرح گھوڑے پر بیٹھتا اور میدان جنگ میں ایک سورما کی طرح اس وقت تک ڈٹا رہتا۔ جب تک میدان مار نہ لیتا، شاہجہان نے عالم شہزادگی اور دور شہریاری میں ہر طاقت سے ٹکر لی، ہر حریف کا مقابلہ کیا، ہر دشمن کے سامنے ہمالہ بن کر کھڑا ہوگیا۔ اس کا دبدبہ اور تجمل سب سے آگے بڑھ گیا پھر اورنگ حکومت پر عالمگیر رونق افروز ہوا، عالمگیر ——————

ترکش مارا خدنگ آخریں!

اس کے عہد میں فتنوں نے سر اٹھایا، طوفانوں نے کروٹ لی، ہنگامے ابھرے لیکن وہ مرد مجاہد، سب سے لڑتا اور سب کو کچلتا رہا۔ کامل ۵۰ سال تک اپنی راجدھانی سے دور دکن میں، دشمنوں کی سرکوبی کرتا رہا۔ ——————

لیکن آج ——————؟

آج حالات بدل چکے تھے۔ لال قلعہ کے محلات میں جہاں پناہ" اب بھی رونق افروز تھے، لیکن شاہ شطرنج کی طرح نہ ان میں بابر کا عزم تھا نہ ہمایوں کی استقامت، نہ اکبر کا تدبر نہ جہانگیر کا حوصلہ، نہ شاہجہان کا طنطنہ، نہ عالمگیر کی شان! جہاں پناہ کٹھ پتلی کی طرح لال قلعہ کی چار دیواری میں محصور تھے۔ حکومت دوسروں کے ہاتھوں میں تھی اور یہ انگریز

تھے ، جو تاجر کے رُوپ میں یہاں آئے تھے اور اب اس ملک کی قسمت کے مالک بن بیٹھے تھے۔

ہر دیکھنے والی آنکھ دیکھ رہی تھی، مسلم اقتدار چراغِ سحری کی طرح جھلملا رہا ہے۔ لیکن کسی کو بھی نہ اپنے فرض کا احساس تھا، نہ حالات کی ابتری کا!

یہ بڑا نازک اور بے انتہا کٹھن دور تھا!

کئی قوتیں تھیں، جو مسلمانوں کے خلاف برسرِ پیکار تھیں، مرہٹے تھے - جو اپنی تگ و تاز سے باز نہ آتے تھے، جاٹ تھے جو اپنی ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے - انگریز تھے جو ایک کامیاب شاطر کی طرح اپنا کھیل کھیل رہے تھے، سکھ تھے - جنہوں نے سارے پنجاب اور سرحد پر قبضہ کر رکھا تھا، ان کے ہاتھوں نہ مسلمانوں کی جان محفوظ تھی - نہ مال نہ آبرو، نہ مذہب، یہ مسلمان عورتوں کی بے حرمتی کرتے تھے، مسجدوں کی توہین کرتے تھے اذان تک سننے کے روادار نہ تھے، مسلم امراء کی جائدادیں اور جاگیریں ضبط کر لیتے تھے۔ عام مسلمان اس طرح کچل دیے گئے تھے کہ ان میں سر اٹھانے کا حوصلہ باقی نہیں رہا تھا۔ اور پنجاب سے باہر انگریز چھائے ہوئے تھے، لال قلعہ بھی ان کا باج گزار تھا۔ اور لال قلعہ میں رہنے والا شہنشاہ ہندوستان بھی ان کا تابع فرمان تھا!

اور مسلمان ان تمام باتوں سے بے پروا تھے، انہیں نہ حال کی فکر تھی نہ مستقبل کا اندیشہ ،

اب تو آرام سے گذرتی ہے ، عاقبت کی خبر خدا جانے !

طوائفوں کے کوٹھے آباد تھے۔ رقص و سرود کی مجلسیں گرم تھیں۔ ہاؤ ہو کے شور سے کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی، بے خانوں کا جمگھٹ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا مرغ بازی بٹیر بازی کبوتر بازی کے اڈے شہر میں جگہ جگہ موجود تھے ، عیاشی سرمستی اور فسق و فجور کی کارفرمائی کہاں نہ تھی؟ عالی شان مکانوں میں سر بہ فلک حویلیوں اور خس پوش جھونپڑوں

میں، ہر جگہ ـــــــــ . اور بہت زیادہ ـــــــــ بازار اور گلیاں
کوچے اور ناکے ، شاہراہ ، اور چوراہے ، جدھر سے گذر جایئے . بس ایک ہی رنگ
تر دامنی اور آلودگی کا رنگ

یہاں پگڑی اچھلتی ہے اسے میخانہ کہتے ہیں .
مولویوں کو اپنے حلوے مانڈے سے کام . صوفیوں کو حال وقال سے فرصت نہیں . عالموں کو مناظرہ اور تکفیر باہمی کا مشغلہ ایسا ہاتھ آگیا تھا کہ وہ سب کچھ بھول بیٹھے تھے . امراء نشۂ دولت ، نشۂ غفلت اور نشۂ عیش میں سرشار . غربا اپنے حال میں مست ، بادشاہ بے بس ، حریف چوکس !

یہ قوم مسلمان تھی ، اس قوم کے ارباب اقتدار مسلمان تھے . اس قوم کا بادشاہ مسلمان تھا شہزادے مسلمان تھے . اور ان کو اپنے اسلام پر فخر بھی تھا لیکن یہ اسلام کی بے بسی دیکھ رہے تھے . اور خاموش تھے ، یہ اسلام پر ستم ٹوٹتے دیکھتے تھے . مگر کچھ نہ کر سکتے تھے . شاید کچھ کرنا چاہتے بھی نہ تھے ، اسلام ان سے فریاد کرتا تھا مگر یہ کانوں میں انگلیاں دے لیتے تھے ، یہ اسلام کو لٹتے دیکھ سکتے تھے لیکن اپنی تباہی نہیں برداشت کر سکتے تھے . اپنا لٹنا کسی طرح بھی گوارا نہ تھا . خواہ اسلام پر کچھ ہی کیوں نہ گزر جائے حالانکہ ان کے ٹھاٹھ اسلام کے بخشے ہوئے تھے . یہ حکمران قوم کے فرد تھے اور حکمران قوم ، بہ ظاہر سہی . لیکن اب تک مسلمان تھی .

باب ۲

زمانہ اَور بھی بدلے گا ایک بار ابھی

ہاں مسلمانوں کا عروج زوال سے بدل رہا تھا، ان کا دورِ اقتدار ختم ہو رہا تھا، ان کی حکومت چراغِ سحر کی طرح ٹمٹا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے ہوا کے ایک جھونکے میں یہ چراغ بجھ جائے گا۔

لیکن اسی زمانہ میں کچھ منچلے ایسے بھی تھے، جو ان مخالف حالات کا مقابلہ کر رہے تھے، یہ نہتے تھے، بے زر تھے بے مایہ تھے، نہ ان کے پاس فوج تھی۔ نہ اقتدار لیکن ان کے دل نورِ ایمان سے منوّر تھے، ان کے سینہ میں اسلام کی چنگاری بھڑک رہی تھی، یہ اپنی نیت میں مخلص اور اپنے ارادہ میں پکے تھے، یہ جان لینا جانتے تھے. تو جان دینے کے فن سے بھی واقف تھے، یہ مٹانا جانتے تھے، تو مٹنا بھی نہیں آتا تھا۔ یہ اپنے مقصد کے لئے قربانی دے سکتے تھے، قربان ہو سکتے تھے یہ نتائج سے بے پروا ہو کر میدانِ جہاد میں اترنے کی تیاریاں کر رہے تھے، ان کے پیشِ نظر نہ جاہ و منصب تھا، نہ دولت و ثروت، نہ اعزاز و اقتدار، نہ حکومت اور بادشاہی، یہ عجیب لوگ تھے یہ اپنے لئے کچھ نہیں چاہتے تھے، ان کا منتہائے نظر اسلام کی سربلندی تھی. اسلام سربلند ہو، یہ بلا سے مٹ جائیں، خدانخواستہ اسلام فنا ہو جائے اور خود زندہ رہیں یہ انہیں منظور نہ تھا۔

یہ اندھیرے میں چراغ لے کر نکلے تھے!

یہ بہروں کو سچائی، اور حقیقت کا پیام سنانے باہر آئے تھے!

یہ آنکھ والے اندھوں کو راہِ ہدایت پر دیکھنا چاہتے تھے!

یہ ان لوگوں کو جن کے دماغ ماؤف ہوچکے تھے، جن کے خیالات جامد تھے جن کے سینے عزم و حوصلہ سے خالی تھے، غازی، مجاہد اور شہید بنانے کا ارادہ کرکے اپنا گھر چھوڑکر اپنی خانقاہ سے رشتہ قطع کرکے، اپنے زاویہ کو تج کر میدان عمل میں کود ے تھے۔

لیکن یہ سب کچھ کرنے سے پہلے انہوں نے خود اپنا امتحان بھی لیا تھا اور اس میں یہ کامیاب ہوئے تھے۔

مئی جون کی تپتی ہوئی دھوپ میں ٹھیک دوپہر کے وقت جامع مسجد کے پتھریلے فرش پر، یہ چہل قدمی کرتے تھے ــــــــ یہ جہاد کی تیاری تھی جب تک ہر طرح کی تکلیف و اذیت جھیلنے کی استعداد نہ پیدا ہو جاتے، آدمی مجاہد کس طرح بن سکتا ہے؟

اس زمانہ میں مسلمانوں کی ناک" اسلام سے بھی بڑی تھی ــــــــ اسلام کے رسولؐ نے عقد بیوگان کی ہدایت فرمائی ہے، اسلام راہبوں کا مذہب نہیں ہے اسلام صرف مردوں کا بھی مذہب نہیں ہے کہ وہ مریں تو عورت کو مجبوراً ستی ہونا پڑے اسلام فطرت سے جنگ کرنے والوں کا بھی مذہب نہیں ہے کہ نوجوان عورت بیوہ ہوجائے مگر اس کی شادی نہ ہوسکے، اسلام دین فطرت ہے؛ وہ انسانوں کا مذہب ہے۔ لیکن مسلمانوں نے ہمسایہ قوموں سے جو غلط باتیں سیکھیں، ان میں ایک یہ بھی تھی کہ وہ بیوہ عورتوں کی شادی شان شرافت کے خلاف سمجھتے ان کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی توہین انگیز بات ہی نہیں تھی کہ اپنی بیٹی یا اپنی بہن یا اپنی کسی عزیزہ کا عقد ثانی کر دیں۔

وہ مجاہد، میدانِ جنگ میں کیا لڑے گا، جو اپنے گھر کو فسق وعصیاں سے نہ بچا

سکے۔اس کی تلوار دشمن کے سروں پر کیسے چمک سکے گی، جو اپنے گھر کی برائیوں کا استیصال نہ کر سکے؟ وہ دشمن کو کیا زیر کر سکے گا، جو اپنے نفس کو نہ کچل سکے؟

یہ منچلے مجاہد جو سر بلندیٔ اسلام کا جھنڈا اُٹھائے کراٹھے تھے، اس حقیقت سے واقف تھے، انہوں نے میدانِ جہاد میں قدم رکھنے سے پہلے اپنے نفس سے جہاد کیا، جو بڑا سرکش اور موٹا ہو گیا تھا۔انہوں نے ان روایات سے جنگ کی جو غیر اسلامی تھیں، اور مسلمانوں کے گھروں میں جگہ پا چکی تھیں۔انہوں نے وہ "ناک" کاٹ کر رکھ دی، جس کی درازی اسلام سے ٹکر لیتی تھی، انہوں نے ان تمام رسموں کو چھوڑ دیا۔ جو اسلام کے خلاف تھیں، ان تمام اصولوں سے بغاوت کی۔جو اسلام سے ٹکراتے تھے۔ان تمام قدروں کو پاؤں تلے کچل دیا، جو اسلام سے بیگانہ تھیں۔انہوں نے اپنی بیوہ بہنوں کی دوسری شادیاں کیں اور انگشت نمائیٔ خلق کی ذرا پروا نہ کی۔انہوں نے لوگوں کے طعنے تشنے لیکن اپنے اصول سے نہ ہٹے!

دُنیا نے اپنی جگہ فیصلہ کر لیا تھا کہ مسلمان،

اپنی بغلوں میں دبائے ہوئے قرآن گئے۔

ہندوستان کی ابھرتی ہوئی قوتوں نے یہ یقین کر لیا تھا مسلمانوں کا دمِ خم رخصت ہو چکا۔خود مسلمان اسلام سے وابستگی کے باوجود یہ سمجھ چکے تھے۔کہ گرتی ہوئی عمارت سنبھل نہیں سکتی مرجھایا ہوا پھول دوبارہ نہیں کھل سکتا۔جس پر ایک مرتبہ موت طاری ہو جائے۔پھر وہ زندہ نہیں ہو سکتا سوکھی ہوئی زمین پر ہریالی نہیں لہلہا سکتی بے آب و گیاہ میدان میں گلاب و یاسمین کی فصلیں نہیں پیدا ہو سکتیں۔مسلمانوں کا دور ختم ہو گیا اب وہ نہیں ابھر سکتے، حریف طاقتیں، ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، منہ چڑا چڑا کر صاف الفاظ میں کہہ رہی تھیں۔" دورِ مجنوں گزشت نوبت ماست"۔

مسلمان ختم ہو گئے مِٹ گئے، اب وہ دنیا کے اسٹیج پر نمودار نہیں ہو سکتے۔اب

ہماری باری ہے، ہم آئیں گے، ہم ابھریں گے، ہم حکومت کریں گے ہمیشہ یہی ہوتا آیا ہے۔ ایک جاتا ہے، ایک آتا ہے۔——— جاڑے کے بعد گرمی اور گرمی کے بعد جاڑا بہار کے بعد خزاں اور خزاں کے بعد بہار، دن کے بعد رات، اور رات کے بعد دن، یہ دنیا کی پرانی ریت ہے۔ مسلمانوں کی خاطر اس میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ مسلمان ہمیشگی کا پٹہ لکھا کر نہیں آئے ہیں۔ جس طرح دوسری قومیں اور ملتیں ابھریں اور مٹ گئیں اسی طرح مسلمان بھی ابھرے، اور اب مٹ رہے ہیں اور بہت جلد بالکل مٹ جائیں گے یہ قدرت کا ایسا عمل ہے، جو ہمیشہ سے جاری ہے، اور ہمیشہ جاری رہے گا۔ اس میں کوئی استثنا نہیں ہے، جو کچھ سب کے ساتھ ہوا وہی مسلمان کے ساتھ بھی ہوگا۔ وہ قدرت کے نظام سے الگ نہیں ہو سکتے!——— کسی طرح بھی نہیں!

لیکن یہ سرفروش، یہ مٹھی بھر مجاہد، جو اسلام کے عروج کے لئے کفن سر سے باندھ کر عرصہ گاہ شہادت میں آنے کے لئے پر تول رہے تھے، ان کے نزدیک موت اصل زندگی اور یہ زندگی ——— زندگی کا صرف ایک حصہ

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے

یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

یہ زندگی کو اپنی چیز نہیں سمجھتے تھے، خدا کی امانت سمجھتے تھے، یہ اس امانت میں خیانت کرنا نہیں چاہتے تھے، واپس کر دینا چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ نہ یہ باطل کے جاہ و جلال سے مرعوب تھے نہ ناحق کی شوکت و طاقت سے، نہ یہ مور و ملخ کے سے لشکر کو خیال میں لاتے تھے، نہ ان کی نظر میں شکوہ پرویز اور جام جمشید کی کوئی وقعت تھی، یہ خدا کے سوا کسی کے سامنے جھکنے پر تیار نہیں تھے یہ مجاہد تھے،——— اور مجاہد کی شان یہ ہے کہ وہ ہنستا کھیلتا موت کا استقبال کرتا ہے۔

نشانِ مردِ مومن باتو گویم
چو مرگ آید تبسّم برلبِ اوست

انہوں نے اپنے کردار اور عمل سے دنیا کو بتا دیا تھا کہ تم نے جو کچھ سمجھ رکھا ہے وہ غلط ہے، دھوکا ہے، فریب ہے نگاہِ مردِ مومن سب کچھ کر سکتی ہے اور تم بہت جلد دیکھ لو گے۔

زمانہ اور بھی بدلے گا ایک بار ابھی!

باب ۳

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات

بلقیس کا بالاخانہ صرف ایک طوائف کا بالاخانہ نہ تھا، بلکہ وہ شہر کے غنڈوں موالیوں لچوں، شہدوں اور ساتھ ہی ساتھ تماشبیں، رئیسوں اور دولت مندوں کا مرکز بھی تھا، بلقیس شہر کی سب سے زیادہ خوبصورت اور دولت مند طوائف تھی۔ اس کے گھر میں من برستا تھا ہر روز ہزاروں روپیہ نذرانہ کے طور پر اس کی جھول میں پڑتا تھا وہ بہترین مغنیہ تھی، بہترین رقاصہ تھی، بہترین طوائف تھی، اس کے در پر ہر روگ کا علاج موجود تھا، عشق باز لوگ، اس کی اداؤں اور عشوہ طرازیوں پر نقد جاں نثار کرتے تھے۔ رقص و سرود سے دلچسپی رکھنے والے اس کے رقص بے محابا اور نغمۂ جانفزا پر جان چھڑکتے تھے۔ اس کے پھندے سے کوئی بچ کر نہ نکل سکا، جسے اس نے چاہا شکار کر لیا، شکار خود اس تک آتا تھا۔ اور اپنے شکار ہونے پر فخر و مسرّت کا اظہار کرتا تھا، سیٹھ اور ساہوکار ہوں یا نوسلاطین اور شہزادے، امراؔ رؤسا ہوں، یا راجہ اور مہاراجہ سب اس کے حلقۂ گیسو کے اسیر، اس کے طرۂ خمدار کے بیمار اس کی چشم عالم آشوب کے گنہگار اس کی نگاہ التفات کے طلب گار تھے۔

وہ سب کو خوش رکھتی تھی، سب سے خوش رہتی تھی، وہ مزاج شناس بھی تھی اور قیافہ شناس بھی، شہر میں دوسری طوائفیں بھی تھیں اور وہ بھی خوب صورت تھیں، بلکہ بعض تو ایسی تھیں کہ خوب صورتی میں یکتا، اور خوبروئی میں یگانہ تھیں، ایسی بھی تھیں، جن کی نغمہ طرازی ناہید تک سے خراج تحسین حاصل کرتی تھی، اور جن کا رقص سارے شہر کو اپنی انگلیوں پر نچاتا تھا۔ لیکن بلقیس مجموعی حیثیت سے کچھ ایسی تھی کہ وہ سب پر بازی لے گئی تھی۔ سب

کے چراغ اس نے گل کر دیتے تھے۔ اس کے سامنے سب کی گرمیٔ بازار ماند پڑ گئی تھی لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہ دوسری طوائفوں کے مقابلہ میں اس عورت کے اندر پر وہ کیا کچھ تھا کہ جی کو بھا گیا!

لیکن بہرحال کچھ نہ کچھ تھا ضرور! لوگ جہاں اس کے حسن فتنہ گر سے مرعوب تھے، وہاں اس کی نگاہِ فتنہ زا سے ڈرتے بھی تھے، وہ غنڈے اور موالی، جو اس بازار پر راج کرتے تھے۔ اور ہر طوائف جن کے سامنے سر جھکا کر حاضر ہوتی تھی، بلقیس کے دربار میں سر جھکا کر حاضر ہوتے تھے، اس لئے جانتے تھے اگر یہاں اکڑے، تو پھر نہ جان کی خیر ہے نہ عزت و آبرو کی، وہ جہاں دولت مندوں اور رئیسوں کو قابو میں رکھنے کا گر جانتی تھی وہاں اسے یہ فن بھی آتا تھا کہ بدمعاشوں اور غنڈوں کی سرکوبی کس طرح کی جا سکتی ہے! اس کے ٹکڑوں پر پلنے والے موالی اس کے ایک اشارہ پر جان قربان کرنے کو تیار رہتے تھے، اور جب موقعہ پیش آ جاتا تھا۔ تو اس کام سے دریغ بھی نہیں کرتے تھے۔

سورج کا دَورِ حکومت ختم ہو چکا تھا، اور رات کا اندھیرا تختِ حکومت پر متمکن ہو چکا تھا۔ حویلیوں میں شمعیں جل رہی تھیں، گھروں میں چراغ ٹمٹما رہے تھے۔ بلقیس کے بالا خانہ پر روزِ روشن کا عالم تھا۔ کچھ اس کے حسن کی آب، کچھ شمعوں کی روشنی، کمرہ کیا تھا بقعۂ نور بنا ہوا تھا، لالہ جگت رام سیٹھ جگل کشور، راجہ پرمانند، نواب اعتماد خاں، اور عنایت حسین سوداگر، اس محفل کی زینت بنے بیٹھے تھے۔ بلقیس نے ابھی ابھی گانا ختم کیا تھا۔ اور اپنی جھولی میں سیم و زر کا انبار لے کر اٹھی تھی۔ اب رقص و نغمہ کی محفل برخاست ہو چکی تھی، لطفِ کلام اور بحث و گفتگو کی محفل جمی تھی، لالہ جگت رام بڑے دلچسپ آدمی تھے، موٹے، تازے، سیاہ رو، لیکن دولت مند بڑے بڑے رئیس اور امیران کے قرضدار تھے۔ صرف سود کی مدد سے لاکھوں روپیہ سالانہ کی آمدنی تھی انہوں نے اپنے توند پر ہاتھ پھیرا اور بلقیس کی طرف للچاتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا:

"کیوں بائی جی تمہیں وہ اپنا وعدہ تو یاد ہوگا؟"

بلقیس نے ایک ادائے جاں ستاں کے ساتھ لالہ جی کی طرف دیکھا، اور زیرِ لب تبسم کے ساتھ کہا۔

"ہاں یاد ہے، وہی سالگرہ والی دعوت نا؟"

لالہ جگت رام:۔ ہاں وہی ——— بس اب صرف ایک ہفتہ باقی رہ گیا ہے اگر تمہارا مجرا نہ ہوا تو محفل سونی رہے گی۔

بلقیس:۔ میں نے آپ سے وعدہ ہی کرلیا تھا، سرآنکھوں پرآتی اور بڑے شوق سے حاضر ہوتی، لیکن

لالہ جگت رام:۔ لیکن کیا؟ ——— نہیں بھئی لیکن ویکن سے کام نہیں چلے گا تمہیں آنا پڑے گا!

بلقیس:۔ مشکل یہ ہے کہ اس دن نواب (نواب اعتماد خاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) صاحب کا غسلِ صحت ہے ——— خدا نے بڑی خیر کی ہمارے نواب صاحب اچھے ہوگئے ورنہ جان کے لالے پڑ گئے تھے!

لالہ جگت رام:۔ نواب صاحب اچھے ہوگئے، اس کی ہمیں بھی خوشی ہے، لیکن سالگرہ نہیں ٹل سکتی وہ تو ایک مخصوص تاریخ ہی کو ہوسکتی ہے۔ غسلِ صحت ہر وقت ہو سکتا ہے۔

نواب اعتماد خاں:۔ ہمیں کسی سے کہنے سننے کی کیا ضرورت تھی، ہم نے تو بائی (بلقیس) سے کہا تھا، اور انہی سے کہہ رہے ہیں۔

بلقیس:۔ میں تو آپ حضرات کی کنیز ہوں، جو آپ دونوں فیصلہ کرلیں۔ مجھے منظور ہے

لالہ جگت رام:۔ میں مجرے کا تمہاری ماں سے سودا بھی کرچکا ہوں، ایک ہزار نقد دے چکا ہوں۔ دو ہزار سالگرہ کے دن دوں گا۔

بلقیس :۔ (تیوری پربل ڈال کر) اپنی دولت کی دھونس نہ جمایئے، آپ تے ایک ہزار نہیں
ایک لاکھ دیا ہو، میں تو اپنی مرضی کی پابند ہوں ۔

لالہ جگت رام :۔ ارے بھئی تم خفا کیوں ہوگئیں، ہم تو نواب صاحب سے کہہ رہے تھے ۔

نواب اعتماد خاں :۔ آپ نے ایک ہزار دیا ہے تو میں دو ہزار دے سکتا ہوں، آپ تین
ہزار دیں گے تو میں پانچ ہزار دوں گا۔لیکن بلقیس کو میرے یہاں آنا پڑے گا!

لالہ جگت رام :۔ نواب صاحب، اگر یوں بولی دوگے تو پھر تمہیں کو ہار ماننا پڑے گی۔

نواب اعتماد خاں :۔ ہار ماننے والے وہ کوئی اور لوگ ہوتے ہوں گے، بولی بولنا ہے تو بول
کر دیکھ لیجئے ۔!

لالہ جگت رام :۔ میں پندرہ ہزار دوں گا، بیس ہزار دوں گا، پچیس ہزار دوں گا۔اب بتایئے
آپ کیا فرماتے ہیں ؟

نواب اعتماد خاں :۔ میں پچاس ہزار دوں گا، لیکن بلقیس میرے ہاں آئے گی اور ضرور
آئے گی ۔

لالہ جگت رام :۔ اجی نواب صاحب میں ایک لاکھ دوں گا (منیم سے) ایک لاکھ کے توڑے
گن دے، ابھی بائی جی کے سامنے (بلقیس سے مخاطب ہوکر) بات پکی ہونی چاہیئے بتاؤ
اب کیا کہتی ہو۔؟

بلقیس :۔ (ایک لاکھ روپیہ سامنے دیکھ کر) آپ مجھ سے کیا پوچھتے ہیں ؟

نواب اعتماد خاں :۔ میں دو لاکھ دوں گا، اور ابھی دوں گا، کیا تم نے مجھے کنگال سمجھ رکھا ہے
میں تمہاری طرح گھر سے روپیہ لے کر نہیں چلا تھا لیکن ابھی چاہوں تو دس لاکھ منگا سکتا ہوں!
یہ کہکر نواب صاحب نے اپنے مختار کو ایک پرچہ لکھ کر دیا ـــــ اور کہا ابھی لے آؤ جاکر یہ روپیہ
مختار صاحب وہ پرچہ لے کر سیدھے لالہ بنواری لال کے ہاں پہنچے ۔ یہ نواب صاحب کی
جائیداد کا کافی حصہ اپنے پاس رہن رکھ چکے تھے اور خوب سُود وصول کر رہے تھے اس چھٹی میں

نواب صاحب نے دولاکھ روپیہ نقد بطور قرض مانگا تھا اوراپنی بقیہ جائیداد ان کے پاس گرو رکھ دی تھی، لالہ بنواری لال نے فوراً دولاکھ روپیہ گن دیا، مختار صاحب لے کر پہنچے، تو لالہ جگت رام سانپ کی طرح بل کھا رہے تھے انہیں یقین تھا، اس قدر جلد، اتنی بڑی رقم ہرگز فراہم نہیں ہوسکتی اور وہ بلقیس کو ایک لاکھ روپیہ کے عوض جیت لیں گے، لیکن جب مختار صاحب روپیہ لے کر پہنچے تو وہ انگشت بدنداں رہ گئے انہوں نے اپنا روپیہ سمیٹتے ہوئے بلقیس کی طرف دیکھا وہ مسکرا کر بولی۔

"لالہ جی، اطمینان سے اٹھایئے، اتنی جلدی کی کیا ضرورت ہے ——— کوئی خدانخواستہ ڈاکہ پڑ رہا ہے ———؟

نواب اعتماد خاں نے زور کا ایک قہقہہ لگایا اور کہا۔

بھئی بنیا روپیہ سے زیادہ کسی چیز کو عزیز نہیں رکھتا، نہ ان کو، نہ آبرو کو، ہاں لالہ صاحب روپیہ سنبھالئے اور تشریف لے جائیے!"

لالہ جی نے روپیہ سنبھالا اور تشریف لے گئے۔ تھوڑی دیر میں محفل برخاست ہوگئی صرف نواب اعتماد خاں رہ گئے، اب یہ دونوں عاشق اور محبوب کی حیثیت رکھتے تھے دونوں میں باتیں شروع ہوگئیں۔

نواب اعتماد خاں:۔ دیکھا بلقیس تم نے ——— کس طرح بھاگا ہے دم دبا کے، لالہ جگت رام ———؟

بلقیس:۔ نواب صاحب کہاں آپ، کہاں وہ؟ وہ اتنا بڑا دل کہاں سے لائے گا جتنا آپ کا ہے؟ جب اس نے ایک لاکھ کہا ہے، میں تو حیران رہ گئی تھی، بھلا ایک لاکھ روپیہ اس کے لئے گن دینا، کچھ آسان تھا؟ میرا تو خیال ہے آپ نے اس کی جان بچالی، بڑا احسان کیا بیچارے پر!

نواب اعتماد خاں:۔ میں نے اس کی جان بچالی؟ یہ کیا کہا تم نے؟

بلقیس :۔ جی اور کیا ——— یہ روپیہ دے کر اگر وہ چلا جاتا تو رستہ ہی میں اس غم سے مر
جاتا، گھر پہنچنا بھی نصیب نہ ہوتا بیچارے کو ———!
نواب صاحب نے ایک فلک فرسا قہقہہ لگایا، اور فرمایا،
"خوب، بہت خوب ہو، بھئی بڑی ذہین ہو بلقیس، تم میں یہی تو بات ہے جو ہم تم
پر جان دیتے ہیں،

ہم جس پہ مرتے ہیں وہ کوئی بات ہی ہے اور
عالم میں تم سے لاکھ سہی تم مگر کہاں ؟

خُدا نظر بد سے بچائے تمہیں !
بلقیس :۔ قدر دانی اور ذرہ نوازی ہے آپ کی !
نواب اعتماد خاں :۔ یہ غسل صحت والی تقریب تو ہو جائے گی، مگر یہ بتاؤ تم نے فیصلہ کیا
کیا ؟
بلقیس :۔ کیا اب بھی کچھ فیصلہ باقی ہے —؟
نواب اعتماد خاں :۔ بات کو غلط نہ سمجھو، ہمارا مطلب یہ ہے کہ ہم نے تم سے کچھ کہا تھا ؟
بلقیس :۔ مجھے نہیں یاد آپ نے کیا فرمایا تھا،
نواب اعتماد خاں :۔ یہ کہ ہم سے یہ دوئی اور جدائی نہیں برداشت ہوتی، ہماری غیور
طبیعت کسی طرح اسے گوارا نہیں کر سکتی کہ تمہارے پاس دوسرے لوگ بھی آئیں
ہماری غیرت و حمیت تڑپ اٹھتی ہے، جب یہ خیال آتا ہے، تم صرف ہماری نہیں
دوسروں کی بھی ہو!
بلقیس :۔ سنجیدگی سے، آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟
نواب اعتماد خاں :۔ شادی ———
بلقیس :۔ تو مجھے انکار کب ہے ؟

نواب اعتماد خاں :۔ گویا تم نے ہماری درخواست مان لی؟

بلقیس :۔ آپ کی بات ٹالی جا سکتی ہے بھلا؟

نواب اعتماد خاں :۔ شکریہ، بہت بہت شکریہ، تم نے ہماری جان رکھ لی، تم نے ہمیں نئی زندگی دی ———— تو پھر کب ———؟

بلقیس :۔ دیکھئے نواب صاحب میں نے آپ کا ارشاد مان لیا، یہ مان لیا کہ آپ کی ہو رہوں گی، سب کو آپ کے لئے چھوڑ دوں گی،

نواب اعتماد خاں ۔ ہاں، تمہارے الفاظ میرے کانوں میں اب تک گونج رہے ہیں، میں تمہارا بے حد شکر گزار ہوں۔

بلقیس :۔ لیکن یہ کام اتنی جلدی نہیں ہو سکتا، جتنی جلدی آپ کر رہے ہیں۔

نواب اعتماد خاں :۔ یہ کیوں؟ ———— جب تم راضی ہو تو پھر دیر اور تامل کے کیا معنی؟

بلقیس :۔ میرے راستہ میں کچھ دشواریاں بھی ہیں، ان سے عہدہ برآ ہوئے بغیر میں کچھ نہیں کر سکتی،

نواب اعتماد خاں :۔ تو اپنی دشواریاں ہم سے چھپاؤ گی، بتاؤ ہم ان کا تدارک کریں گے ہم انہیں رفع کریں گے، یہ ہمارا وعدہ ہے!

بلقیس :۔ یہ آپ کی بندہ نوازی ہے سب سے پہلی دشواری، تو اماں جان کی منظوری ہے، ان کی پونجی میرے سوا کون ہے؟ وہ ہر بات پر رضامند ہو سکتی ہیں، لیکن میں گھر آباد کر کے بیٹھ جاؤں، اس پر وہ راضی نہیں ہو سکتیں۔ انہیں راضی کرنا لوہے کے چنے چبانا ہیں، لیکن آپ کی خاطر یہ لوہے کے چنے چباؤں گی۔ مگر ذرا مہلت!

نواب اعتماد خاں :۔ ان کو میں رضامند کروں گا، میں انہیں راضی کرنے کا گُر جانتا ہوں!

بلقیس:۔ یہ کام اگر آپ کر سکتے ہیں تو راضی ہوں، آج وہ رضا مند ہوں کل ہی قاضی بلاکر دو بول نکاح کے پڑھا لیجئے!

نواب اعتماد خاں:۔ (بیخودی کے عالم میں) سچ کہتی ہو بلقیس؟

بلقیس:۔ (مسکراکر) جھوٹ ——————!

اس ادا پر نواب صاحب نیم بسمل ہو گئے! —————— ان کا بس چلتا تو شاید مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگتے۔!

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ گھڑیال نے بارہ کا گھنٹہ بجایا،

بلقیس اٹھ کھڑی ہوئی،

"افوہ —————— بارہ بج گئے بڑی نیند آ رہی ہے!"

نواب صاحب بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"ہاں بڑی دیر ہو گئی، تم آرام سے سوؤ۔ میں غسل صحت کی تقریب سے فارغ ہو کر تمہاری اماں سے سارے معاملات طے کر لوں گا!"

بلقیس مسکراتی رہی اس نے کوئی جواب نہ دیا، نواب صاحب محبت کی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے تشریف لے گئے۔

ادھر نواب صاحب گئے ادھر بلقیس کی اماں جان تشریف لائیں۔ اپنے زمانہ میں یہ بھی قیامت سے کم نہ ہوں گی، لیکن اب بڑھاپا غالب آ چکا تھا، اور ان کی وہی حالت ہو گئی تھی۔ جو ایک شاندار عمارت کی کھنڈر بن جانے کے بعد ہوتی ہے — کہنے لگیں،

"بیٹی! کئی دفعہ میں نے کہا ہے، لوگوں کو زیادہ دیر تک مت بٹھایا کر، لیکن تو سنتی ہی نہیں، دیکھ بارہ بج گئے، پھر خدانخواستہ طبیعت خراب ہو گئی تو؟

بلقیس نے ماں کی چہیتی بیٹی بن کر کہا۔

"اماں تم تو خواہ مخواہ بولتی ہو، مجھے کچھ نہیں ہونے کا —— ہاں کچھ اور بھی سُنا؟

وہ بولیں ،

"لالہ جگت رام خفا ہوگئے اور نواب صاحب نے دو لاکھ روپے دے دیئے ———
خدا تجھے سلامت رکھے ایسے ایسے کروڑوں روپے تیرے قدم چومیں گے !"

بلقیس نے شوخ آنکھوں سے ماں کو دیکھا اور بولی ،

"نہیں یہ نہیں ، دوسری بات !"

اَب تو ماں کو بھی اشتیاق پیدا ہوا ، انہوں نے سراپا انتظار بن کر کہا ،

"تو آخر کہتی کیوں نہیں ؟

بلقیس :۔ نواب صاحب مچلے ہوئے ہیں کہ شادی کریں گے !"

ماں نے بجلی کی طرح تڑپ کر دریافت کیا -

"پھر تو نے کیا کہا ؟"

بلقیس :۔ کہتی کیا وعدہ کر لیا ——— وہ تم سے بات چیت کریں گے ۔ تم جانو اور وہ جانیں !"

ماں نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا -

"میں سمجھ لوں گی ، اب اس کے پاس رکھا ہی کیا ہے ؟ میں سب جانتی ہوں ، یہ دو لاکھ روپے جو تجھے دیئے ہیں ، یہ بھی قرض منگا کر دیئے ہوں گے ۔

بلقیس :۔ ہاں اماں یہی بات ہے ، میں جانتی ہوں یہ ساری ٹیم ٹام ظاہری ہے ، اندر سے قرض لیتے لیتے نواب صاحب بالکل کھوکھلے ہوچکے ہیں !"

ماں نے یاد دلایا ،

ابھی اسی دن لالہ پکوڑی مل تار ہے تھے ، جائیداد کا بہت بڑا حصہ ان کے پاس رہن ہے ؟

بلقیس :۔ میں جانتی ہوں اچھی طرح ! ——— لیکن صاف جواب نہ دے دینا -

ماں نے ذرا کڑی نظروں سے بیٹی کو دیکھا اور پوچھا ،

تو کیا اقرار کر لوں؟ تاریخ مقرر کر دوں؟
بلقیس نے ذرا خفا ہوتے ہوئے کہا۔
"اونھ تم تو واقعی سٹھیائی جاتی ہو، ہاتھی لاکھ لٹا جب بھی سوا لاکھ ٹکے کا، ایسے ایسے دو لاکھ ابھی ان سے کئی مرتبہ وصول کئے جا سکتے ہیں"
بیٹی کی یہ بات سن کر ماں کا دل پھول کی طرح کھل گیا، اس کم سنی میں سمجھداری کا جب یہ عالم ہے۔ تو واقعی آگے چل کر یہ قیامت کے کان کترے گی، انہوں نے کچھ جواب نہیں دیا، مسکرانے لگیں، اور اس تبسم میں مہر مادری اور فخر و ناز کا سمندر لہریں لے رہا تھا!

باب ۴

یہاں پگڑی اُچھلتی ہے اُسے میخانہ کہتے ہیں

شام کا وقت ہے، مسجدوں سے مغرب کی اذان کا آوازہ بلند ہو رہا ہے جنہیں خدا سے کچھ بھی تعلق ہے، وہ اپنے کام کاج چھوڑ ہر مصروفیت سے منہ موڑ، خانۂ خدا کی طرف ادائے فرض کے لئے لپک رہے ہیں۔ لیکن جو زندگی کے نشہ میں سرشار ہیں وہ "صلاح" و فلاح" کی طرف دعوت دینے والوں کی آواز سُنی کی ان سُنی کر کے لہو و لعب اور عیش و عشرت میں مشغول ہیں۔ نہ انہیں نماز کی فکر ہے، نہ خدا کا ڈر۔ بلقیسؔ کے بالاخانہ پر نغمہ و سرود کی محفل جمی ہے، اور اس شور ہاؤ ہو میں اذان کی آواز دب چکی ہے لالہ جگت رام، لالہ پکوڑی مل، عنایت حسین سوداگر اور دوسرے تماشبین بیٹھے دادِ عشرت دے رہے ہیں، دورِ شراب چل رہا ہے اور بلقیس گا بھی رہی ہے اور ساقی گری کی خدمت بھی انجام دے رہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ رقص کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ حاضرین پر ایک محویت طاری ہے، کچھ شراب کے نشے میں بیخود ہیں۔ کچھ بلقیس کے حسن و جمال کے نشہ میں سرمست ہیں، اس کے ہونٹ نغمہ برسا رہے ہیں اس کے پاؤں کی ہر دھمک، دل کی دنیا تہ و بالا کر دیتی ہے، اور اس کے ہاتھ کا جام شراب، اپنے اندر کئی بوتلوں کا نشہ رکھتا ہے۔

اور چلے اور چلے ساقیا ؛ دَور چلے دَور چلے ساقیا! ———— کا ایک عجیب عالم مدہوشی سب پر طاری ہے۔

یکایک، زینہ کی سیڑھیوں پر کسی کے آنے کی آوازِ پا محسوس ہوئی۔ اب محفل جم چکی تھی بلکہ شباب پر تھی۔ اس وقت اگر نواب اعتماد خاں، یا سکندر بخت بھی آجائے تو حاضرین ان

کا استقبال چڑھی ہوئی تیوریوں ہی کے ساتھ کرتے، پھر بھی سب نے تجسس کی نظروں سے آنے والے کو دیکھا، یہ آنے والا نہ کوئی سیٹھ تھا، نہ ساہوکار، نہ دولت مند، نہ امیر کبیر، نہ شہزادہ نہ سلطان، نہ سوداگر، نہ کوئی سرکاری عہدہ دار، یہ ایک مولوی تھا، سیاہ داڑھی، شرعی پاجامہ، تن زیب کا سفید لمبا کرتا، سر پر چوگوشیہ ٹوپی، کاندھے پر رومال، جس وقت یہ مولوی صاحب تشریف لائے ہیں، بلقیس پیکر ناز و عشوہ بنی، جام شراب لالہ پکوڑی مل کی طرف بڑھا رہی تھی مولوی صاحب کو دیکھ کر اس کے قدم کانپے، ہاتھ تھرآیا اور جام شراب فرش پر گر کر چکنا چور ہو گیا!

پھر وہ کھڑی نہ رہ سکی گاؤ تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی،

حاضرین محفل کو مولوی صاحب کی یہ اچانک، خلاف توقع اور بے موقع تشریف آوری بہت ناگوار گزری، سب نے چین پیشانی کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔آخر عنایت حسین سوداگر سے ضبط نہ ہو سکا۔انہوں نے طنز بھرے لہجہ میں کہا۔

اجی مولانا، آج آپ ادھر کا راستہ کہاں بھول پڑے، کیا آپ کو معلوم نہیں۔ یہاں پگڑی کی اچھلتی ہے اسے میخانہ کہتے ہیں،

مولانا نے جواب دیا۔

"جانتا ہوں میرے بھائی، اسی لئے آیا ہوں کہ تم میری پگڑی اچھالو، اور جتنا ثواب کما سکتے ہو کما لو!"

یہ جواب سن کر عنایت حسین شرمندہ ہو گئے۔ پھر کچھ نہ بول سکے۔گردن جھکالی۔ اور چپ چاپ بیٹھ گئے، لیکن نواب فتح الملک کے اکلوتے اور خوبصورت صاحبزادے سکندر بخت کی چلبلی طبیعت نے انہیں خاموش نہ رہنے دیا۔ کہا اور بڑے طنز کے ساتھ کہا۔

"مولانا ہم تو سمجھتے تھے، یہ معصیت کدہ ہم جیسے سیہ کاروں ہی کے لئے ہے، یہ نہ معلوم تھا کہ آپ جیسے مقدس لوگ بھی یہاں قدم رنجہ فرماتے ہیں، آج آپ کا پول بھی کھل گیا،

بے بس نہ اپنے آپ کو صوفی جتائیے
معلوم ہے حقیقت ہو حق جناب کی
نکلے ہو میکدے سے ابھی منہ چھپاکے تم
دابے ہوئے بغل میں صراحی شراب کی

یہ کہہ کر سکندر بخت نے جواب کا انتظار کئے بغیر ایک لاجواب قہقہہ لگایا لیکن بہت جلد یہ قہقہہ مولانا کی باوقار آواز سے دب گیا، انھوں نے فرمایا،

"میرے بھائی، تم نے مؤمن سمجھ کیوں لیا؟ میں تم سے زیادہ گنہگار انسان ہوں، تم جو کچھ کرتے ہو، خدا ہی بہتر جانتا ہے، چوری چھپے سے مجھ سے کتنے گناہ سرزد ہو چکے ہیں ——!

سکندر بخت بھی چپ ہوگیا، لالہ جگت رام اب تک خاموش بیٹھے تھے، اب چپ نہ رہ سکے کہنے لگے۔

اُستاد ذوقؔ نے خوب کہا ہے اور بہت خوب کہا ہے،

رات اک پگڑی ہوئی تھی میکدہ میں رہن سے
ذوقؔ وہ تیری ہی دستارِ فضیلت ہو تو ہو

آخر اس میکدہ میں آپ کی تشریف آوری کا مقصد کیا ہے؟

ایک طرف سے آواز آئی،

"رنگ میں بھنگ کرنے ——!"

پھر ایک قہقہہ لگا، دوسرے گوشہ سے آواز آئی،

مئے ریاضؔ آپ بھی پیتے ہیں بایں ریش سفید
ہائے یہ نور کی شکل اور گنہگاروں میں؟

ایک اور آواز گونجی۔

"مولانا یہاں آئے ہیں تو آؤ دوستو ہم مسجد کا رُخ کریں۔"

اس جملہ نے پھر قہقہہ کا سامان پیدا کر دیا، اور ہر طرف سے قہقہوں کی آواز گونجنے لگی
بلقیس اب تک خاموش بیٹھی یہ باتیں سن رہی تھی۔
اب وہ بھی بولی، اُس نے مولانا کو مخاطب کر کے کہا۔
"مولانا آپ یہاں کیوں تشریف لائے ہیں ؟"
مولانا نے کہا۔
"بہن میں تمہارے ہی پاس آیا تھا۔ دو باتیں کرنے !"
سکندر بخت نے کہا۔
"بہن ——————————"
اور پھر قہقہہ لگاتے ہوئے کہا
"رشتہ تو آپ ہی کی طرح بڑا مقدس نظر آرہا ہے مولانا صاحب، لیکن نہ جانے کیوں حافظ کا وہ شعر یاد آرہا ہے،

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بخلوت می روند کار دیگر می کنند

اور پھر ساتھیوں کی طرف اور خاص طور پر بلقیس کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھ کر ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا، اس مرتبہ بلقیس کی تیوری چڑھ گئی۔ اس نے ذرا ترش لہجہ میں کہا،
"جو صاحب تہذیب و متانت کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتے۔ بہتر یہ ہے کہ وہ مجھے بداخلاقی کے مظاہرے پر مجبور نہ کریں، اور خود ہی تشریف لے جائیں —— !"
ان الفاظ نے جادو کا اثر کیا، ساری محفل پر سناٹا چھا گیا، سکندر بخت کا منہ اتر گیا، پھر بلقیس نے مولانا صاحب سے مخاطب ہو کر کہا۔
"آپ مجھ سے کیا فرمانا چاہتے ہیں کہئے میں سن رہی ہوں !"

مولانا نے فرمایا ،

صرف ایک بات کہنے آیا ہوں ، سُن لوگی تو احسان ہوگا ، نہ سنوگی تو بھی شکریہ ادا کر کے چلا جاؤں گا ــــــــ !

بلقیس نے ہمدردی کے لہجہ میں کہا ،

" شاید آپ کسی مدرسہ کے لئے چندہ مانگنے آئے ہیں . لیکن اس کا یہ وقت نہیں ، کسی اور وقت تشریف لائیے ، حسب مقدرت جو کچھ ہو سکے گا پیش کر دوں گی - "

مولانا نے پُر جلال لہجہ میں کہا ،

" نہیں میں چندہ مانگنے نہیں آیا ہوں ، تم سے کچھ لینے نہیں آیا ، تمہیں کچھ دینے آیا ہوں اس دولت پر ، جو تم نے جمع کر لی ہے ، غرور نہ کرو ، یہ مٹنے والی چیز ہے ، جب بادشاہتیں مٹ جاتی ہیں ، تو یہ دولت تو ہاتھ کا میل ہے ، یہ زیور جو تمہارے بدن کی زینت بنا ہوا ہے ایک دن آئے گا ، کہ تم خود اس سے نفرت کرنے لگوگی ، یہ بڑی بی جو تمہارے پاس بیٹھی ہیں غالباً تمہاری ماں ہیں جب تک تم زندہ ہو ، ہر طرح کا زیور پہن سکتی ہیں . لیکن نہیں پہنتیں وہ دَور ختم ہوگیا . جب یہ زیور پہنا کرتی تھیں ، اور ہاں یہ حُسن و جمال جس پر تمہیں اتنا ناز ہے فخر ہے ، غرور ہے ، ایک دن اسی طرح مٹ جائے گا . جس طرح تمہاری ماں کا مٹ گیا . یہ تمہاری شمع حُسن کے پروانے ، جو آج تمہارے ایک اشارے پر دولت کونین قربان کرنے پر تلے ہوئے ہیں آج اگر کسی حادثہ سے بدصورت ہو جاؤ اور کل جب بوڑھی ہو جاؤگی ، تو تمہاری طرف رُخ نہیں کریں گے . ایک دن آئے گا ، اور شاید بہت دیر میں نہ آئے کہ تم بوڑھی ہو جاؤگی تمہارے بال سفید ہو جائیں گے . اس عارض گلگوں پر جھریاں پڑ جائیں گی ، حسن کی یہ تمکنت ، بڑھاپے کی بے بسی سے بدل جائے گی . پھر تمہارا کون ساتھ دے گا ؟ پھر تمہارا کون ساتھی بنے گا ؟ پھر کون تمہارے کام آئے گا . اور ہاں یہ بھی تو سوچو موت سے کسی کو مفر نہیں ، جو یہاں آیا ہے وہ ضرور مرے گا آج نہیں تو کل ، بڑے بڑے انبیا ، اولیا ، اصفیا ، علما ، دولت مند

امراء، رؤسا، بادشاہ ذی جاہ، شہنشاہ، جہاہ، وزیر باتدبیر، سفیر خوش تقدیر، کون ہے، جو نہ مرے اور مرکر سب ایک ہی سی قبر میں دفن کئے جاتے ہیں، قبر کے اندھیرے میں اگر کوئی چیز کام آتی ہے تو حسن عمل کا توشہ ساتھ لے کر جاتا ہے اس کے عمل کی روشنی اس اندھیرے کو دُور کر دیتی ہے، جس کا کیسۂ عمل خالی ہوتا ہے، یہ اندھیرا اس کے لئے اور بڑھ جاتا ہے، یہ زندگی جو تم گزار رہی ہو، ہم سب گزار رہے ہیں، عارضی ہے، فانی ہے اور مختصر بھی ہے اور اس کے بعد جو زندگی شروع ہوگی، وہ کبھی ختم نہ ہوگی۔ کتنا خوش قسمت ہے، وہ جو ہمیشگی کی زندگی کی تیاری، اس مختصر سی زندگی کے وقفہ میں کر لیتا ہے، اور کتنا بدقسمت ہے وہ جو اس عارضی زندگی کو عیش وطرب، لہو ولعب اور رنگ رلیوں میں بسر کر دیتا ہے اور پھر جب ہمیشگی کی زندگی میں داخل ہوتا ہے، تو نہ اس کا کوئی ساتھی ہوتا ہے، نہ یا ور، نہ معین نہ مددگار، یا دردِ دولت، نہ ہمدرد ——— میری بہن بتاؤ، کیا زندگی کی تیاری تم نے کچھ کی ہے، اگر نہیں کی تو اب کر لو۔ اب بھی وقت ہے۔ میں کہتا ہوں، اس معصیت کی زندگی کو ترک کر دو، یہ لوگ جو آج تم پر زر و جواہر نثار کرتے ہیں، وہاں تمہاری ذرا بھی مدد نہ کر سکیں گے، وہاں تو یہ خود مدد کے محتاج ہوں گے، میں تم سے روپیہ نہیں چاہتا، صرف یہ چاہتا ہوں کہ نیک بنو، مسلمان بنو، اپنی زندگی کو سدھار دو، اپنی عاقبت نہ بگڑنے دو ——— یہ میں تم ہی سے نہیں کہتا، ہر اس شخص سے جو یہاں موجود ہے، یہی کہتا ہوں، ابھی میں نے تمہیں بہن کہا ہے تو ایک صاحب نے طنز کیا تھا، میں نے ان کے طنز کا بُرا نہیں مانا، میں انہیں بھی اپنا بھائی کہتا ہوں اور ان سے بھی یہی کہتا ہوں ———

کارے بکن اے فلاں و غنیمت شمار عمر
زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نماند

کچھ کرتے کا یہی زمانہ ہے، اسے رائیگاں نہ کرو، ضائع نہ ہونے دو!

مولانا نے یہ کہا، اور خاموش ہو گئے۔

بلقیس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے، معلوم ہوتا تھا ان چند الفاظ نے اس کے قلب کی ماہیت ہی بدل دی ہے، دوسرے حاضرین کی بھی یہ کیفیت تھی کہ وہ دم بخود تھے، جیسے سکتہ ہوگیا ہو!

مولانا نے کہا،

"میں نے اپنا پیام پہنچا دیا، اپنا فرض ادا کر دیا، اس کے سوا مجھے کچھ نہیں کہنا ہے، اب میں جاتا ہوں ـــــ!

بلقیس اٹھ کھڑی ہوئی، اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

آپ نہیں جا سکتے ـــــ میں تائب ہوتی ہوں، خدا کو گواہ کر کے آپ سے عہد کرتی ہوں کہ اب گناہ کی زندگی بسر نہ کروں گی، میں چاہتی ہوں اپنے ہاتھ پر مجھے بیعت کر لیجئے ـــــ!

مولانا نے فرمایا۔

"یہ سب باتیں رسمی ہیں، تم نے خدا سے عہد کیا ہے، وہ تمہارے عہد کا گواہ ہے اور یہ کافی ہے، میں دعا کرتا ہوں، خدا تمہیں اس عہد پر قائم رہنے کی توفیق دے۔! میں خدا سے دعا کرتا ہوں، ہم سب کو راہِ ہدایت دکھائے اور راہ ہدایت پر چلنے کی توفیق دے!"

یہ کہہ کر مولانا اٹھ کھڑے ہوئے، عنایت حسین سوداگر نے مولانا سے عرض کیا۔

"میں بھی تائب ہوتا ہوں، اور آپ سے معذرت خواہ ہوں کہ میرے منہ سے ناشائستہ الفاظ نکلے ـــــ!"

مولانا نے فرمایا۔

"میں نے آپ کی بات کا بُرا نہیں مانا، اور اگر مانا بھی تھا تو وہ اس سعادت مندی سے دُور ہوگیا ـــــ!"

عنایت حسین نے کہا:۔

"کیا میں آپ کا اسمِ گرامی معلوم کر سکتا ہوں ؟"

تھوڑے سے تامل کے بعد مولانا نے جواب دیا،

"بندے کو اسماعیل کہتے ہیں !"

مولانا چلے گئے ——————— !

اور ان کے تشریف لے جانے کے بعد ہر شخص سکتے میں آگیا ——————

یہ مولانا اسمٰعیل تھے ! ——————— شاہ عبدالعزیز کے بھتیجے، شاہ عبدالغنی کے بیٹے شاہ ولی اللہ کے پوتے، جن کے تقدس اور جن کی عظمت کے آگے صرف وہی ہی نہیں سارا ہندوستان بلکہ سارا عالمِ اسلام سرِ عقیدت خم کرتا ہے ! ——————— ؟

باب ۵

ابھی کیا تھا اور کیا سے کیا ہوگیا؟

مولانا کے تشریف لے جانے کے بعد بڑی دیر تک بلقیس کی محفل پر سناٹا سا چھایا رہا ہر شخص مہر بلب اور انگشت بدنداں تھا کسی کو وہم وگمان بھی نہ تھا کہ یوں آناً فاناً رنگِ محفل بدل جائے گا، بلقیس پر کچھ ایسا تاثر طاری تھا کہ وہ سنجیدگی اور متانت کا پیکر بنی بیٹھی تھی اور نہ جانے کیا سوچ رہی تھی، اس کی ماں تک دہشت زدہ اور مبہوت بیٹھی تھی، یہ عالم دیکھ کر لوگ کھسکنے لگے اور رفتہ رفتہ سوا سکندر بخت کے سب چلے گئے، بلقیس کا یہ معمول تھا کہ اپنی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جانے والوں کو روکتی تھی، اصرار کرتی تھی، کچھ دیر اور تشریف رکھیے وعدہ لیتی تھی کل ضرور تشریف لائیے گا۔ لیکن آج اس نے کسی جانے والے کو نہ روکا کسی سے کل آنے کا وعدہ نہ لیا، کسی سے اصرار نہ کیا کہ تھوڑی دیر اور بیٹھیے، رات اپنی ہے چلے جائیے گا۔

البتہ سکندر بخت اپنی جگہ چٹان کی طرح جمے بیٹھے تھے، ان کا وطن لال قلعہ تھا ان کا دعویٰ تھا کہ ان کی رگوں میں بھی وہی خون دوڑ رہا ہے، جو بابر اور عالمگیر کی رگوں میں گردش کرتا رہتا تھا یہ "سلاطین" کہلاتے تھے، تیموری خاندان کے ایک فرد تھے۔ اور کسی جنت آرام گاہ بادشاہ کے پرپوتے ہوتے تھے، باپ کافی دولت چھوڑ کر مرے تھے، وثیقہ الگ تھا، بادشاہ سلامت بھی مہربان تھے، خیر خبر لیتے رہتے تھے۔ اور یہ دونوں ہاتھوں سے دولت لٹا رہے تھے، جو کچھ باپ جمع کرکے چھوڑ گئے تھے یہ بھی اور جو کچھ بادشاہ سلامت کے خزانے سے ملتا تھا وہ بھی،

سکندر بخت دِلّی کے کنہیا مانے جاتے تھے، ہر ڈیرہ اور بالاخانہ کی سیر کر چکے تھے ہر طوائف کا نسب نامہ انہیں ازبر تھا، ہر رقاصہ اور مغنیہ کی سات پشتوں سے واقف تھے دل پھینک بھی تھے، اور نظر باز بھی، مزاج شناس بھی تھے۔ اور طبیعت دار بھی، تماشبین بھی تھے اور عاشق مزاج بھی، لہٰذا آج یہاں، کل وہاں آج اس پر جان دے رہے ہیں، کل اس کے لئے فرہاد و مجنوں بننے پر تیار ہیں، چونکہ آدمی دولت مند تھے، لہٰذا جہاں جاتے تھے سر آنکھوں پر بٹھائے جاتے تھے، ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے تھے، کچھ خاندان شاہی کے توسل کا رعب، کچھ ذاتی دولت و ثروت کا اثر، کون تھا جو ان کے جذبات کی پذیرائی نہ کرتا، ایک دن نہ جانے کس طرح اُن کی نظر بلقیس پر پڑ گئی، اور وہ نگاہِ اولین دل میں ترازو ہو گئی، بس پھر کیا تھا، آنا شروع کر دیا، یہاں تو ایسے قیمتی لوگوں کی مانگ تھی، آئے تو اس تپاک اور گرم جوشی سے سرفراز کئے گئے اور افسوس کرنے لگے۔ اب تک دوسری جگہوں پر وقت کیوں ضائع کیا؟

لیکن آج سکندر بخت کو اپنے پاؤں کے نیچے سے زمین نکلتی ہوئی نظر آئی، سوچنے لگے اگر یہ مرغِ اسیر دانہ و دام سے آزاد ہو گیا، تو میں کہاں جاؤں گا؟ کیا کروں گا! کسے چاہوں گا! کس کے انتظار میں اختر شماری کیا کروں گا، کس کی یاد مجھے بے چین رکھا کرے گی؟ کس کا دیدار میرے قلبِ محزوں کے لئے اکسیر کا کام کرے گا! ———— نہیں یہ نہیں ہو سکتا بلقیس ملانی نہیں بن سکتی، وہ وہی رہے گی جو ہے، جس طرح مولانا کے لئے یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ رند مشرب بن جائیں۔ اسی طرح ہمارے اور بلقیس جیسے لوگوں کے لئے کب یہ زیبا ہے کہ وہ مصلّٰی اور سجادہ بچھا کر بیٹھ جائیں اور ہو حق کرنے لگیں ———— ہر کسے رابہر کارے ساختند، مولانا کے لئے جو زیبا ہے وہ کر رہے ہیں، ہمارے لئے جو مقدّر میں لکھا گیا ہے وہ انجام پا رہا ہے۔

سکندر بخت بار بار سوچتے تھے کہ بابِ سخن واکریں، بلقیس کو ٹٹولیں اور دیکھیں

اب مولانا کے تشریف لے جانے کے بعد اس کی کیا کیفیت ہے، لیکن اس کی تمکنت آمیز سنجیدگی دیکھ کر ہیاؤ نہیں پڑتا، بار بار جھکتے تھے، پھر کچھ سوچ کر خاموش رہ جاتے تھے لیکن ان کی یہ مشکل بلقیس کی ماں سگو نے آسان کر دی، جمائی لیتے ہوئے کہنے لگی۔

بھلا بتاؤ ہمارا ہی گھر رہ گیا تھا، تبلیغ کے لئے؟

سکندر بخت اس نادر موقعہ کو کیسے ہاتھ سے جانے دیتے، مولانا کی عدم موجودگی میں ان پر بھرپور وار فرمانے لگے۔

"اجی ان مولوی ملاؤں کا یہی کام ہے"! ———— ان کے وعظ سے دنیا تو نہیں بدل سکتی ————؟

سگو:۔ وہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں، معنت خدا ہیں اگر میری بچی کو ڈرادیا ———— جیسے جہنم کے ٹھیکیدار یہی ہیں، سچ کہتی ہوں جہنم کا ذکر سن کر تو میرے بھی رونگٹے کھڑے ہو گئے، پھر میری بچی کیسے نہ سہم جاتی؟

سکندر بخت:۔ جی ہاں اور کیا ———— اور یہ مولانا صاحب تو ہر جگہ پہنچتے ہیں، اور جہاں جاتے ہیں ایسی ہی باتیں کرتے ہیں ———— مجھے اچھی طرح یاد ہے عرش آرام گاہ حضرت اکبر شاہ ثانی یعنی ہمارے بادشاہ کے والد کے زمانہ میں ایک مرتبہ قلعہ میں آگئے ————

سگو:۔ (حیرت کے ساتھ) وہاں بھی پہنچ گئے ————؟

سکندر بخت:۔ بھئی بہت بڑے خاندان کے فرد ہیں، شاہ عبدالعزیز صاحب اور ان کے بھائیوں کی عظمت کا نقش ہر دل پر ہے،

سگو:۔ اچھا تو وہاں کیا کیا جاکر؟

سکندر بخت:۔ بس وہاں جاکر بادشاہ سلامت کے سامنے وعظ شروع کر دیا وہی رٹے ہوئے جملے، دنیا کی بے ثباتی، عیش دنیا کی بے مائیگی، دولت و ثروت کی بے وقعتی

عقبیٰ اور آخرت کا ذکر خدا اور رسول کی باتیں ۔

سگو :۔ بادشاہ سلامت تو خوش ہوتے ہوں گے یہ باتیں سن کر، سنا ہے بڑے مذہبی آدمی تھے ۔

سکندر بخت :۔ مذہبی آدمی تو خیر کیا تھے، لیکن یہ باتیں مولانا نے کچھ ایسے انداز میں کہیں کہ رونے لگے، داڑھی آنسوؤں سے تر ہوگئی، ان کی دیکھا دیکھی دوسرے بھی آنسوؤں کا دریا بہانے لگے ۔

لیکن مجھ پر نہ اس دن اثر ہوا تھا، نہ آج ہوا ،

سگو :۔ جب تو قلعہ میں انکا مان بہت بڑھ گیا ہوگا ۔؟

سکندر بخت :۔ ہاں بہت زیادہ ——— اور سچ تو یہ ہے کہ پہلے کب کم تھا۔ جواب زیادہ ہوتا ۔

سگو :۔ سُنا ہے عام لوگ بھی انہیں بہت مانتے ہیں ؟

سکندر بخت :۔ ہاں کیوں نہیں مانیں گے، باتیں ہی ایسی کرتے ہیں ۔

سگو :۔ یہ میں نہیں سمجھی یعنی عام لوگوں کو خوش کرنے کی باتیں کرتے ہیں ؟

سکندر بخت :۔ اور کیا ——— کہتے ہیں، لڑکیوں کو ان کا حصہ دو، دام لے کر ان کی شادی نہ کرو۔ زیادہ دنوں تک گھر میں نہ بٹھائے رکھو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جو عورت جوانی میں بیوہ ہو جائے ——— اس کا دوسرا نکاح کر دو، !

سگو :۔ (دانتوں تلے انگلی دبا کر) ہے ہائے یہ میں کیا سن رہی ہوں؟ ایسا غضب ؟ مولوی ہو کر ایسی باتیں ؟ بھلا بیوہ عورت کا بھی کہیں دوسرا نکاح کیا جا سکتا ہے ؟ ،

سکندر بخت :۔ جی ہاں، یہ ایسا ہی فرماتے ہیں، اور خود اپنی بیوہ بہن کی شادی کر کے سارے شہر میں نکّو ہو چکے ہیں ۔

سگو :۔ وہ تو ہوا ہی چاہیں ——— ضرور قیامت قریب آگئی ہے۔

سکندر بخت :۔ قیامت کیوں قریب آنے لگی، ایسے ایسے لوگوں کے کہنے سے ہوتا کیا ہے ؟

سگوّ :۔ ہاں یہ تو میں بھی جانتی ہوں شریف آدمی جان دے دے گا، ـــــ مگر اپنی آن پر حرف نہیں آنے دے گا ،

سکندر بخت :۔ بے شک ـــــــ ہمارے ہی خاندان کو دیکھ لیجئے ـــــ میری والدہ ۲۲ سال کی عمر میں بیوہ ہوئیں سارا رنڈا پا اپنے مرحوم شوہر کی یاد میں گزار دیا، کبھی ذہن میں دوسری شادی کا خیال بھی نہ آیا۔

سگوّ :۔ اور کیا ـــــ آ بھی کیسے سکتا تھا ؟

سکندر بخت :۔ میری ایک بہن ہے بیچاری ۱۷ سال کی عمر میں بیوہ ہو گئی ـــــ" دو برس ہو گئے ہیں، اسے بیوہ ہوئے، آج تک کسی نے مسکراتے نہیں دیکھا اس نے اچھے کپڑے نہیں پہنے، اچھا کھانا نہیں کھایا، نرم بستر پر نہیں لیٹی، سُرمہ مسی، کاجل یہ چیزیں وہ بالکل فراموش کر چکی ہے۔

سگوّ :۔ بے شک بے شک ـــــ شریف ایسے ہی ہوتے ہیں۔

سکندر بخت :۔ اوّل تو وہ خود دوسری شادی پر رضامند نہیں ہو سکتی۔ لیکن بفرض محال ہو بھی جائے تو، اپنی تلوار سے اس کے دو ٹکڑے کر دوں بعد میں چاہے مجھے خودکشی کرلینی پڑے،

سگوّ :۔ خدا نہ کرے ـــــ ایسا ہوتے ہی کیوں لگا ؟

سکندر بخت :۔ اور بھی عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں یہ مولانا صاحب ،

لہ یہ بالکل صحیح واقعہ ہے، محض اتباع سنت کے جوش میں مولانا نے اپنی بیوہ بہن کی شادی مولانا عبدالحی سے کر دی تھی ؛

سگو :۔ ضرور کرتے ہوں گے ـــــــــ مجھے تو ان کا دماغ چلا ہوا معلوم ہوتا ہے ،

سکندر بخت :۔ کہتے ہیں فاتحہ کرنا ، نیاز دلانا ، قبروں پر جانا مزاروں پر حاضری دینا ، پھول چڑھانا ، یہ سب باتیں بدعت ہیں ،

سگو :۔ بدعت کیا چیز ہوتی ہے بیٹے ؟

سکندر بخت :۔ اس لفظ کے معنی تو میں بھی نہیں جانتا ، مگر مطلب یہ ہے کہ اسلام کے خلاف ہیں ،

سگو :۔ آیا بڑے آئے اسلام والے ، ہمارے پرکھے اور بزرگ خدانخواستہ مسلمان نہیں کافر تھے ، جو یہ باتیں کرتے تھے ۔ واہ اچھے آئے یہ مولوی صاحب ،

سکندر بخت :۔ ان لوگوں کا چراغ بھی تو ان باتوں کے بغیر نہیں جل سکتا ،

سگو :۔ بھاڑ میں جائیں یہ ، اور بھاڑ میں جائے ان کا چراغ ، ان کی وجہ سے ہم اسلام ہی کو چھوڑ دیں یا بالکل ہی کافر ہو جائیں ؟ میں تو ایسے مولویوں کو دور سے سلام کرتی ہوں ، واہ یہ بھی خوب رہی ۔

سکندر بخت :۔ ارے ان لوگوں کی باتیں کہاں تک سنئے گا ، بڑے ـــــــــ عجیب لوگ ہیں ! ـــــــــ اور ایک بات بتاؤں ؟

سگو :۔ بتاؤ بھیا ـــــــــ یہ تو واقعی آج عجیب باتیں سننے میں آ رہی ہیں ، خدا مسلمانوں پر رحم کرے اور ایسے مولویوں سے بچائے جو اسلام کے بجائے کفر کا راستہ دکھاتے ہیں ،

سکندر بخت :۔ سنئے تو ،

سگو :۔ ہاں سن رہی بیٹا کہے جاؤ ۔

سکندر بخت :۔ مولانا صاحب جہاد کی تیاریاں بھی کر رہے ہیں ، ہر جمعہ کو شاہی مسجد میں جہاد کی فضیلت پر وعظ فرماتے ہیں لے

سگوؔ :۔ جہاد ــــــــــ؟ جہاد کس سے کیا جائے گا ؟

سکندر بخت :۔ انگریزوں سے، سکھوں سے، ہندوؤں سے !

سگوؔ :۔ تو کیا ان کے پاس کوئی بہت بڑی فوج ہے ؟

سکندر بخت :۔ ہنس کر، فوج ــــــــــ

سگوؔ :۔ ہاں بیٹا، ضرور، ان کے پاس سپاہیوں کی پلٹنیں، اور سواروں کے دستے ہوں گے ورنہ اتنے سارے کافروں سے جہاد کیسے کریں گے ۔

سکندر بخت :۔ یہ ان سے پوچھئے ۔

سگوؔ :۔ دیکھو نا موٹی سی بات ہے ۔ سکھوں کی طاقت کا یہ عالم ہے کہ سارے پنجاب اور سرحد پر قبضہ جمائے بیٹھے ہیں، ہندوؤں کی کثرت اتنی ہے کہ اس ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک گھوم جاؤ ہندو ہی ہندو نظر آئیں گے ۔ اور ــــــــــ

سکندر بخت :۔ اور انگریزوں کا یہ حال ہے کہ ان سے سکھ بھی دبتے ہیں، اور ہندو بھی اور مسلمانوں پر تو اتنے مہربان ہیں کہ ان کی حکومت پر قابض ہو گئے ہیں، نام بادشاہ کا ہے، حکومت وہ کرتے ہیں ۔

سگوؔ :۔ وہی تو میں کہہ رہی ہوں بیٹے ۔

سکندر بخت :۔ یہی تو میں بھی عرض کر رہا ہوں، اس حوصلہ کو دیکھئے اور ہم کو دیکھئے ۔

لے یہ بھی ایک سچا واقعہ ہے مولانا جہاد پر ایسے پُر اثر وعظ کہتے تھے کہ شہر کا شہر اُمنڈ آتا تھا۔ لوگ محویت کے عالم میں اپنی دوکانیں کھولنا اور کاروبار جاری رکھنا بھول جاتے تھے، اور بیٹھے وعظ سنتے رہتے ہیں ۔

پاس تیر کمان تک نہیں اور جہاد کریں گے، ان سے جن کے پاس توپیں اور بندوقیں تلواریں اور سنگینیں حدِ شمار سے خارج ہیں، جن کی تعداد ستاروں کی طرح گنی نہیں جاسکتی، جن کے دبدبہ کی دھاک ساری دُنیا پر بیٹھی ہوئی ہے ——— یہ حماقت نہیں تو اور کیا ہے ،

سگو :۔ لیکن پھر ایسا وعظ کہنے سے فائدہ کیا، جسے ماننے والا کوئی نہ ہو۔ ؟

سکندر بخت :۔ یہ نہ کہیئے، دنیا میں عقل کے دشمنوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔!

سگو ہنسنے لگی، پھر اس نے چھالیہ کترتے ہوئے کہا

"لیکن ان باتوں کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا !"

سکندر بخت :۔ وہ تو ظاہر ہے

سگو :۔ مولوی کا کام یہ ہے کہ روزہ نماز کے مسائل بتائے، جہاد تو سپاہی کا کام ہے ، مولویوں کو اس میں ٹانگ اڑانے کی کیا ضرورت ہے ؟

سکندر بخت :۔ جی یہ کہیئے، ہمارے یہ مولانا صاحب خیر سے سپاہی بھی ہیں ۔

سگو :۔ (حیرت سے) سپاہی بھی ہیں واقعی ۔ ؟

سکندر بخت :۔ ہاں صاحب ——— ورزش کرتے ہیں، تلوار چلانا سیکھتے ہیں تیر کمان کا استعمال جان چکے ہیں، اپنی جہادی فوج کے سپہ سالار بھی تو یہ خود ہونگے

سگو :۔ اچھا ہے، خدا انہیں کامیاب کرے، تو ان موئے کافروں کے غلبہ سے نجات ملے

سکندر بخت :۔ مل چکی ——— یہ تو مسلمانوں کو تباہ کرنے کی سازشیں ہیں ۔ مٹ جائیں گے مسلمان ان حرکتوں سے !

سگو :۔ ہاں بظاہر تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے ——— مگر پھر انگریز انہیں پکڑ کیوں نہیں لیتے یا پھانسی دے دیں !

سکندر بخت :۔ وہ وقت بھی جلد آجائے گا !

سگو :۔ کب ؟ ——— جب مسلمان تباہ ہو چکے ہوں گے ۔

سکندر بخت :۔ (مسکرا کر) نہیں اس سے بہت پہلے ،

سگو :۔ دیکھنا چاہئے کب آتا ہے وہ دن !

سکندر بخت :۔ بات یہ ہے کہ مولانا صاحب بہت بڑے خاندان کے ایک فرد ہیں جس کی دھاک عوام کے دلوں میں بیٹھی ہوئی ہے ۔

سگو :۔ ہاں یہ تو میں جانتی ہوں ،

سکندر بخت :۔ اور لال قلعہ بھی ان کی عظمت اور بزرگی کے آگے سرِ تسلیم خم کرتا ہے ۔

سگو :۔ وہ تو کیا ہی چاہئے ۔

سکندر بخت :۔ یہی وجہ ہے کہ انگریز کوئی کارروائی کرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں

سگو :۔ لیکن کب تک ؟

سکندر بخت :۔ بس یہی دیکھنا ہے ——— شاید وہ ان کے امام کا انتظار کر رہے ہوں ، وہ برآمد ہولیں ۔ تو دونوں کو ساتھ ساتھ گرفتار کرلیں ۔ ——— !

سگو :۔ ان کے کوئی امام بھی ہیں بیٹے ،

سکندر بخت :۔ جی ہاں ——— سنا ہے کہ واقعی بہت بڑے بزرگ ہیں لوگ انہیں سید صاحب کہتے ہیں ،

سگو :۔ وہ بھی جہاد پر وعظ کہتے ہیں ؟

سکندر بخت :۔ ہاں ——— انہی کے کہنے سے تو انہوں نے اپنے وعظ کا موضوع بدلا ہے ، ورنہ پہلے تو صرف دین کی باتیں اپنے وعظ میں کہا کرتے تھے اب جہاد کا کلمہ شروع ہو گیا ۔

سگو :۔ بیٹا کچھ بھی کہو ، ایک بات میں ضرور کہوں گی ، چاہے کسی کو بڑی لگے یا بھلی ،

سکندر بخت :۔ فرمائیے کون سی بات ہے وہ !

سگوؔ :۔ یہ مولوی صاحب جو یہاں آئے تھے مولوی معلوم نہیں ہوتے ۔

سکندر بخت :۔ یعنی ——— ؟

سگوؔ :۔ یعنی یہ کہ مولوی کی ایک شان ہوتی ہے، ہاتھ میں عصا، سر پر پگڑی، بدن پر عبا، کاندھے پر رومال، انگلیاں ہر وقت تسبیح کے دانوں پر پھرتی رہتی ہیں ——— اور ایک یہ ہیں جیسے کوئی چھوٹا موٹا سوداگر دوکان سے اٹھا چلا آرہا ہے، نہ پگڑی نہ عصا نہ جبہ، نہ عمامہ ——— نہ جانے کس نے انہیں مولوی بنا دیا [1]

سکندر بخت :۔ قسمت نے !

سگوؔ :۔ اور کیا ایسا ہی معلوم ہوتا ہے ۔

سکندر بخت :۔ کچھ بھی معلوم ہو مگر وہ ہیں مولوی !

سگوؔ :۔ ہوا کریں ——— اب اگر کبھی انہوں نے میرے گھر میں قدم رکھا تو مجھ سے بڑا کوئی نہ ہوگا !

سکندر بخت :۔ اور مجھ سے بڑا بھی کوئی نہ ہوگا، ——— آپ تو صرف ڈانٹ ڈپٹ کر رہ جائیں گی، میں مزاج درست کر دوں گا ! بلقیس اَب تک خاموش بیٹھی بے پروائی کے ساتھ ان لوگوں کی باتیں سن رہی تھی، اب وہ چونکی، اور اس نے تیوری چڑھا کر سکندر بخت سے پوچھا ۔

"آپ کیا کہہ رہے تھے ؟ ——— کس کا مزاج درست کریں گے ؟"

---

[1] مولانا اسمٰعیل شہید وضع ولباس کے اعتبار سے عالم نہیں معلوم ہوتے تھے ، علما کا جو لباس مروج ہو چکا ہے، وہ انہوں نے کبھی نہیں پہنا، وہی عامیوں کا سا لباس پہنتے تھے ۔ جو سب پہنتے ہیں ، یہی وجہ ہے کہ جو لوگ انہیں پہلے سے نہیں جانتے تھے ، وہ انہیں مولوی سمجھتے ہی نہیں تھے ۔

سکندر بخت اس اندازِ گفتگو سے سٹ پٹایا گیا، اس نے بات بناتے ہوئے کہا
ہماری اوران کی (سگو کی طرف اشارہ کرکے) باتیں ہو رہی تھیں، تمہیں کیا ؟"
بلقیس :- آپ دونوں کے رازونیاز میں دخل دینے کی مجھے ذرا بھی ضرورت نہیں ہے، لیکن ایک بات کان کھول کر سُن لیجئے، وہ یہ کہ اب آپ میں سے کسی کی زبان سے مولانا کا ذکر نہ سنوں۔
سگو :- واہ ری لڑکی کیا تو ہماری زبان بندی کرے گی ؟ ہمارا گھر ہے، جو چاہیں کہیں !
بلقیس :- لیکن اس کی رونق مجھ سے ہے، یہاں کوئی بات میرے خلاف مزاج نہیں ہو سکتی -
بلقیس نے پہلی مرتبہ اتنے بے جھجک انداز میں ماں سے گفتگو کی تھی، وہ سکندر بخت سے زیادہ سٹ پٹا گئی - آخر ماں تھی اپنا وقار قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہنے لگی،
"لیکن ہوا کیا ؟"
بلقیس :- میں ان کی خلافِ شان کوئی بات نہیں سُن سکتی، ہرگز نہیں،
سگو :- لیکن تو بھی ایک بات کان کھول کر سُن لے، اب وہ اس گھر میں کبھی نہیں آئیں گے !
سکندر بخت :- یہ نہ کہئے نہیں آئیں گے، یہ کہئے نہیں آ سکتے !
بلقیس :- یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ انہوں نے یہاں قدم رنجہ فرمایا، اگر وہ آئیں گے تو میں دیدہ ودل فرشِ راہ کرکے ان کا استقبال کروں گی - یہ ناپاک گھر ہے - معصیت کدہ، وہ مقدس بزرگ ہیں، وہ یہاں کیوں آنے لگے ! لیکن اگر ہمارے دن پھریں ہماری قسمت کا ستارہ بلند ہو، اور وہ یہاں تشریف لائیں، تو دنیا میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو انہیں روک سکے !
سکندر بخت :- شان کے ساتھ (بلقیس اسے فراموش نہ کرو کہ تم کس سے مخاطب ہو !

بلقیس :- یہ مجھے یاد ہے، معلوم ہے ،
سکندر بخت :- پھر بھی تمہارا انداز کلام یہ ہے ؟ کیا تم مجھے اور اس ملّا کو ایک سا سمجھتی ہو؛
بلقیس :- ہرگز نہیں، میں، آپ اور ہم جیسے دوسرے لوگ دنیا کے کتّے ہیں، اور وہ
مقدس انسان ہیں، یہ دنیا ایسے ہی لوگوں کے دم قدم سے قائم ! ــــــــ
آپ کا اور ان کا کیا مقابلہ، کہاں آسمان کہاں زمین، کہاں نورٗ کہاں تاریکی ؟ کہاں
بلندی، کہاں پستی ؟ کہاں سوُرج، کہاں ذرّہ، بے مقدار ؟
سکندر بخت (غصّہ سے) یہ تم کہہ رہی ہو ؟
بلقیس :- جی ہاں، اور مجھے اپنی سچائی پر اصرار ہے۔
سکندر بخت :- تو اب میں اس گھر میں کبھی قدم نہیں رکھوں گا۔
سگّو :- ارے بٹیا تم تو خفا ہو گئے، یہ چھوکری تو ہمیشہ سے سرپھری ہے۔
بلقیس :- اس گھر کا دروازہ اب نہ صرف آپ کے لئے بلکہ آپ جیسے تمام اصحاب کے
لئے آج سے ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا ہے، بڑی عقلمندی کریں گے، اگر نہیں
آئیں گے، اور اگر آئے تو واپس کر دیئے جائیں گے ،
سگّو :- (بے تاب ہو کر) آج تجھے کیا ہو گیا ہے ؟
بلقیس :- میری آنکھیں کھل گئی ہیں ــــــــ ؟
سگّو :- ایسی بہکی بہکی باتیں نہ کر، عقل کے ناخن لے ۔
بلقیس :- میں نے کوئی بے عقلی کی بات نہیں کی ہے ،
لیکن میں نے جو کچھ کہا ہے یہ میرا اٹل فیصلہ ہے !
سگّو :- یعنی اب تو اپنا پیشہ ترک کر دے گی ؟
بلقیس :- ترک کر چکی ،
سگّو (روتے ہوئے) ہائے یہ میں کیا سُن رہی ہوں ؟

سکندر بخت :- مجھے آپ سے ہمدردی ہے!
بلقیس :- اور مجھے آپ سے ہے، دعا ہے کہ خدا آپ کو راہ ہدایت نصیب کرے،
سکندر بخت نے جانے کے لئے اٹھتے ہوئے کہا،
میں تم پر اور تمہاری راہ ہدایت پر لعنت بھیجتا ہوں، اب اس گھر میں کبھی قدم نہیں رکھوں گا،
بلقیس نے مسکراتے ہوئے کہا

دیدۂ سعدی و دل ہمراہ تست
تا نہ پنداری کہ تنہا می روی!

اور سکندر بخت پیکر جلال بنا ہوا چلا گیا، !

باب ۶

فیض یہ کس کا؟ کرامت کس کی تھی؟

سچّے اور اچھے لوگوں کے سیدھے سادے بولوں میں وہ تاثیر ہوتی ہے، جو شعلہ نوا خطیبوں اور آتش مقال شاعروں کے کلام میں نہیں ہوتی، نیک اور صالح لوگوں کی سادہ اور بے ریا زندگی میں وہ جلال ہوتا ہے، جو تاج خسروی پہننے والوں اور تخت شاہی پر جلوہ فرما ہونے والوں میں نہیں ہوتا، بادشاہوں اور شہریاروں کی حکومت، تیغ و سناں کے سہارے قائم ہوتی ہے، اور اس کے حدود صرف جسم و تن تک محدود ہوتے ہیں، لیکن جو صرف خدا کے ہو رہتے ہیں اور اپنی جان و تن کو صرف خدا کے لئے وقف کر دیتے ہیں ان کی حکومت دلوں پر ہوتی ہے، ان کے شکوہ و جلال سے پہاڑ لرزتے ہیں سمندر کانپتے ہیں، طوفان سہمتے ہیں، خطیبوں اور شاعروں کا کلام صرف گرمی محفل کا کام دیتا ہے، لوگ سنتے ہیں داد دیتے ہیں اور بھول جاتے ہیں، لیکن خدا پرستوں، اور خداشناسوں کے سخن میں وہ گرمی ہوتی ہے، جو مردوں میں زندگی کی حرارت تڑپ، اور امنگ پیدا کر دیتی ہے اور زندوں میں مرنے اور راہ حق میں فنا ہو جانے کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔

مولانا اسمٰعیل، خدا کے بڑے نیک اور صالح بندے تھے، اور خدا کے ایک دوسرے سچّے اور اچھے بندے سید احمد کا دامن تھام لینے کے بعد سے تو وہ کچھ سے کچھ ہو گئے تھے۔

ترے عشق میں کیا سے کیا ہو گئے ہم!

وہ بہت بڑے خانوادۂ طریقت کے ایک فرد تھے، بہت بڑے عالم تھے، بہت

بڑے صوفی تھے، اور بہت بڑے واعظ تھے، ان کی باتوں میں خدا نے وہ تاثیر دی تھی کہ چند لمحوں میں زنگ نفاق سے دل کا آئینہ صاف ہو جاتا تھا، جو خدا کو بھول بیٹھے تھے، وہ یادِ الٰہی میں سرشار ہو گئے، جو رسم و رواج، اور روایاتِ خاندانی پر جان دیتے تھے وہ اسلامی احکام کے تابع فرمان بن گئے جن کی اکڑی ہوئی گردن بڑے بڑے کو خاطر میں نہ لاتی تھی، وہ اب غریب و نادار، تہی دامن اور کم مایہ مسلمانوں سے مساوات اور اخوت کے جذبہ کے ساتھ ملنے لگے، ان کے دکھ سکھ میں شریک ہونے لگے، جو لڑکیوں کو ترکہ پدری میں شریک کرنا معیت سمجھتے تھے، وہ اب بہنوں اور بیٹیوں کو باقاعدہ حصہ جائداد میں دینے لگے جن کی شان ان کی متحمل نہ تھی کہ اپنی بیوہ بہنوں اور بیٹیوں کے عقد ثانی کا نام بھی سن سکیں، وہی اب جوش، اور مسرت کے ساتھ اس کارِ خیر کو انجام دینے لگے، جو عیش و عشرت اور ناز و نعم کی گود میں پلے بڑھے اور جوان ہوئے تھے، وہ اب راہِ خدا میں قربان ہونے کے لئے سختیاں جھیلنے اور دکھ اٹھانے کی مشق کرنے لگے،

فیض یہ کس کا ؟ کرامت کس کی تھی ؟

نام بس دو ہی بزرگوں کا لیا جا سکتا تھا۔ مولانا اسمٰعیلؒ اور حضرت سید احمدؒ !

آج جمعہ کا دن تھا، جامع مسجد میں نماز پڑھنے والوں کا ایسے ہی بہت ہجوم ہوتا ہے اور آج تو تِل دھرنے کی جگہ نہیں تھی، باہر میدان تک لاکھوں آدمی بیٹھے تھے، آج مولانا کی تقریر تھی اور یہ تقریر جہاد پر تھی !

جہاد کا نام تو لوگوں نے کتابوں میں پڑھا تھا، لیکن جہاد کیا ہے، کیوں کیا جاتا ہے ؟ کس طرح کیا جاتا ہے ؟ کس وقت کیا جاتا ہے ؟ اس کے شرائط کیا ہیں ؟ یہ نہ کوئی جانتا تھا، نہ جاننے کی کوشش کرتا تھا، لوگوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ جہاد کا دَور ختم ہو گیا، اب جہاد کی ضرورت نہیں رہی، مجاہدوں کا کام ختم ہو گیا اب نہ کسی مجاہد کی ضرورت ہے نہ کوئی مجاہد موجود ہے، اور ہم بھی کبھی جہاد کر سکتے ہیں، اس کا تو کسی کو وہم و گمان بھی نہیں تھا، لیکن آج

کی تقریر نے لوگوں کی آنکھیں کھول دیں۔ لوگوں نے اپنا دل ٹٹولا تو محسوس کیا، جہاد کی ضرورت موجود ہے، جہاد فرض ہے اور کسی دوسرے پر نہیں، ہم پر فرض ہے، کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی بات ہوسکتی ہے کہ آج کے دور میں،

اسلام ہے محبوس مسلمان ہیں آزاد!

اسلامی حکومت دم توڑ رہی ہے۔ مسلمانوں کی شرکت جان بلب ہے، اغیار عروج و اقتدار حاصل کر رہے ہیں، مشرک اور کافر مسلمانوں پر حکومت کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں، اور کہیں کہیں کر بھی رہے ہیں، کہیں اذان پر پابندی ہے[1] کہیں نماز کی اجازت نہیں، کسی جگہ مسجدوں پر قبضہ ہے اور ... ان میں مسلمانوں کو داخلہ تک کی اجازت نہیں، کسی جگہ جہاد پر وعظ کہنا جرم ہے، کسی مقام پر قرآن کی تلاوت، ناگواری طبع کا سبب ہوتی ہے، ہم یہ سارا تماشہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں مگر کچھ نہیں کرسکتے کیا اس سے بڑھ کر بھی شرم کی کوئی بات ہوسکتی ہے؟

مولانا نے اپنی تقریر میں فرمایا تھا۔

"تم مسلمان ہو لیکن اسلام کی بے حرمتی دیکھ رہے ہو، تم اسلام کا کلمہ پڑھتے ہو لیکن کلمہ گویان اسلام کی تباہی اور بربادی دیکھ رہے ہو، تمہیں اس بات پر ناز ہے کہ تمہارا مذہب اسلام ہے لیکن تمہاری آنکھوں کے سامنے اسلام کی، اسلام کے پیام — قرآن — کی بے حرمتی ہو رہی ہے اور تم کچھ نہیں کرسکتے۔

تم اس قوم کے فرد ہو، جو جاہل تھی، اَن پڑھ تھی، غریب تھی، مفلس تھی، لیکن جب وہ سرزمین عرب سے اسلام کا کلمہ پڑھتی ہوئی نکلی تو اس کی ہیبت سے وشت و دور لرزنے لگے، اس نے حکومتوں کے چراغ گل کر دیئے، اس نے تاج خسروی چھین لئے، اس نے

---

[1] سکھوں نے پنجاب کشمیر اور سرحد میں اسی طرح کی پابندیاں مسلمانوں پر عائد کر رکھی تھیں۔

تخت پر قبضہ کر لیا، یہ وہی قوم تھی،

کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں سے تاج سردار ——————!

اور تم اسی قوم کے فرد ہو، لیکن بزدلوں اور کم ہمتوں کی طرح گھروں میں چھپے بیٹھے ہو، تم میں اتنی ہمت نہیں کہ کفن سر سے باندھ کر میدان میں آؤ اور اسلام پر اپنی جان قربان کر دو!

تم موت سے ڈرتے ہو، لیکن کیا تم موت سے بچ سکتے ہو، اگر سیسہ پلائی ہوئی دیواروں کے محل میں رہو، تو بھی موت سے نہیں بچ سکتے۔ تم پر بجلی گر سکتی ہے اور تمہارے خرمن حیات کو خاکستر کر کے رکھ سکتی ہے، تمہیں بخار آ سکتا ہے اور بہترین طبی علاج کے باوجود تم مر سکتے ہو اور مرتے ہو، تم پر مکان کی چھت گر سکتی ہے اور تم اس میں دب کر فنا ہو سکتے ہو، تم چلتے چلتے ٹھوکر کھا کر گر سکتے ہو، اور زندگی سے محروم ہو سکتے ہو، تمہیں طاعون ہو سکتا ہے، ہیضہ ہو سکتا ہے، اور تم کسی طرح نہیں بچ سکتے، زلزلہ آتا ہے اور ہزاروں آدمی آن کی آن میں ہست سے نیست ہو جاتے ہیں، سیلاب آ سکتے ہیں اور آتے ہیں، اور آئیں گے جب سیلاب آتا ہے تو اپنے ساتھ صرف مٹی اور ریت ہی بہا کر نہیں لے جاتا، گوشت اور پوست سے بنے ہوئے سینکڑوں ہزاروں آدمیوں کو بھی بہا لے جاتا ہے اور وہ غرق ہو کر فنا ہو جاتے ہیں۔ تم کتنے اطمینان کے ساتھ جہازوں اور کشتیوں پر بیٹھ کر سفر کرتے ہو، لیکن عین تمہاری مرخوشی کے موقع پر جب یک بیک طوفان آتا ہے، کشتی ڈوبنے لگتی ہے اور طوفان کی تند و تیز لہریں اسے الٹ دیتی ہیں تو تم کچھ نہیں کر سکتے سوا اس کے کہ زندگی سے محروم ہو جاؤ، تمہارے گھر میں کھانا پکتا ہوتا ہے دفعتہً کوئی چنگاری اڑتی ہے اور آگ لگ جاتی ہے اور یہ آگ نہ صرف تمہارے گھر کو، نہ صرف تمہارے پڑوسیوں کو نہ صرف تمہارے محلہ کو جھلسا کر رکھ دیتی ہے بلکہ سارے شہر کو خطرہ میں ڈال دیتی ہے بتاؤ ایسے موقع پر تم کیا کر سکتے ہو؟ کیا آگ کے شعلے تمہیں دیکھ کر واپس لوٹ جاتے ہیں؟ نہیں یہ نہیں ہوتا، تم جل جاتے ہو مٹ جاتے ہو۔!

بتاؤ تم کہاں تک موت سے بھاگو گے، کب تک اس سے بچو گے؟ کب تک اس

سے بچ سکوگے ؟

تمہاری آنکھیں ہر روز یہ تماشہ دیکھتی ہیں کہ ایک تنومند اور مضبوط آدمی ہے، دولت وافر، صحت، قابلِ رشک، تندرستی ضرورت سے زیادہ بظاہر موت کا کوئی اندیشہ نہیں، لیکن ذرا سر میں درد ہوا، ذرا سی پیٹ میں مروڑ اٹھی، ذرا سی ابکائی آئی اور وہ ختم ہوگیا، نہ دولت کام آئی ـــــ نہ تندرستی نے ساتھ دیا۔

تم جانتے ہو تمہارا کوئی باپ بھی تھا، دادا بھی تھا، پردادا بھی تھا، ماں بھی تھی، نانی بھی تھی، لیکن یہ مر گئے۔ اور یہ لوگ جو مرے ان کے بھی اسی طرح آباؤ اجداد تھے، انہیں بھی موت نے اپنے آغوش میں لے لیا غرض آدم علیہ السلام کے وقت سے لے کر اس وقت تک موت کا سلسلہ جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا، ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ موت نے کسی کو معاف کیا ہو، حد یہ ہے کہ خدا کے نیک بندوں اولیاء صلحاء صوفیا حتیٰ کہ انبیاءؑ تک موت سے نہ بچ سکے، حد یہ ہے کہ جب احمد مرسل نہ رہے کون رہے گا، تو میرے عزیزو اور بھائیو، دوستو اور ساتھیو! غرض موت سے کسی طرح مفر نہیں، ہر حالت میں وہ آتی ہے تو اس سے بھاگتے کیوں ہو، اس کا خیر مقدم کیوں نہیں کرتے، اس کا نام سن کر تمہارا چہرہ دہشت سے سفید کیوں پڑ جاتا ہے، اس کے اشتیاق و انتظار میں اختر شماری کیوں نہیں کرتے، جب زندگی اتنی بے حقیقت ہے، تو بے بسی کے ساتھ اسے موت کے حوالہ کر دینے کے بجائے مردانگی کے ساتھ جہاد کر کے سرخ رو ہو کر کیوں نہیں مرتے؟

بے شک زندگی اور موت تمہارے اختیار میں نہیں ہے، لیکن عزت کی موت ضرور تمہارے ہاتھ میں ہے، بے بسی کے ساتھ بستر پر ایڑیاں رگڑنے کے بجائے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر میدانِ جہاد میں مرنا بھی تمہارے اختیار میں ہے ـــــ بتاؤ کونسی موت تمہیں پسند ہے ـــــ؟ بے بسی اور نامرادی کی موت! یا عزت اور وقار کی موت! یہ زندگی بے حقیقت ہے، اگر اسے دوسروں کی خوشامد میں امراء و روٴسا ملوک

وسلاطین کی چاکری میں اپنے پیٹ کی خدمت میں اپنی ہوس اور حرص اور بدذوق کی تکمیل میں صرف کرتے ہو، تو اس کے بے حقیقت اور باعث ننگ ہونے میں شبہ نہیں اگر کسی نیک کام میں صرف کرتے ہو، کسی بلند مقصد کی خاطر اسے قربان کرتے ہوئے تو موت تمہارا احترام کرے گی، زندگی تم پر قربان ہوگی!

دنیا میں، دنیا ہی میں نہیں، تمہارے اس شہر میں بھی ہر روز نہ جانے کتنے آدمی مرتے رہتے ہیں، لیکن ان کی موت کی کوئی پرواہ نہیں کرتا، زیادہ سے زیادہ گھر والے تھوڑی دیر رو لئے اور بیٹھ رہے، لیکن جو لوگ کسی بلند اور اچھے مقصد پر قربان ہوتے ہیں، وہ کبھی نہیں مرتے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں، جب تک یہ دنیا قائم ہے وہ زندہ رہیں گے، خدا نے انہی لوگوں کے بارے میں فرمایا ہے۔ لا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات، بل احیاء ولاکن لا تشعرون ——— !

آج وقت پھر تمہیں پکار رہا ہے۔ سوچ لو کر کیا جواب دو گے، آج اسلام پھر تمہیں دعوت دے رہا ہے بتاؤ اس دعوت کا کیا جواب ہے، تمہارے پاس؟

آج تمہارا ایمان شہادت گاہ کی طرف بلا رہا ہے، پھر تم کیوں نہیں لپکتے؟ کیوں نہیں بڑھتے؟ کیا سوچ رہے ہو؟ ——— وقت چلا گیا، تو پھر کبھی واپس نہیں آئے گا اور تم کف افسوس مل کر رہ جاؤ گے؟

اپنی تاریخ پڑھو اپنے اسلاف کے کارناموں پر غور کرو، اپنے اکابر کی قربانیوں کو یاد کرو، اور وہی روح اپنے اندر پیدا کرو جو ان کے اندر موجود تھی، تاکہ تمہاری عظمت رفتہ تمہیں واپس مل جائے ——— !

تم اس دیس میں فاتح اور کشور کشا کی حیثیت سے آئے تھے تم نے تقریباً ایک ہزار سال تک اس دیس پر حکومت کی لیکن آج تمہاری حالت کیا ہے، تم غلاموں سے بدتر ہو، محکوموں سے بدتر ہو، ایک طرف انگریز تم پر مسلط ہوتے جاتے ہیں، دوسری

طرف سکھوں کی یلغار نے پنجاب اور سرحد کو فتح کرلیا ہے، تیسری طرف جاٹ اپنا کام کر رہے ہیں، چوتھی طرف مرہٹوں کی سعی و کوشش جاری ہے، تمہارے جاہ و جلال کے نشانات ایک ایک کرکے مٹتے جارہے ہیں، بنگال جیسے زرخیز صوبہ کی حکومت تمہارے ہاتھ سے چھن گئی، بہار تمہارے ہاتھ سے نکل گیا، اودھ پر انگریزوں کا تسلط ایک حقیقت ہے دلّی کی حالت بھی ابتر ہو رہی ہے

صبح گیا یا شام گیا، اور یہ سب کچھ تمہاری کم ہمتی کے باعث ہوا، اور ہو رہا ہے وہ تم ہی ہو جس نے کرناٹک میں دکن میں، بنگال میں، بہار میں، اودھ میں، دلّی میں اپنے اقتدار اور عروج کے ہر مقام پر سازشوں کے جال بچھائے، ذاتی نمود اور سربلندی کے لئے اسلامی حکومت کو فنا کرنے کی تدبیریں کیں، اپنی جیب سیم و زر سے بھرلی، اور اسلامی حکومت کا چراغ گل کردیا، اور وہ تم ہی ہو جو ان غلطیوں کی تلافی کرسکتے ہو، تم اگر چاہو کہ اب تمہاری ہر کوشش صرف اسلام کی سربلندی کے لئے صرف ہوگی، تو یہ دھبے تمہارے دامن سے دھل سکتے ہیں اور تم وہی عظمت حاصل کرسکتے ہو، جس کے تم مستحق تھے، اور جسے تم نے حاصل کرلیا تھا!"

اس تقریر نے جادو کا سا اثر کیا، حاضرین کا عالم یہ تھا کہ وہ جوش سے بے قابو ہو رہے تھے، آنسوؤں سے ان کی داڑھیاں تر ہو رہی تھیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت اگر انہیں موقع مل جائے تو یہ غیر مسلم اقتدار کا خاتمہ کرکے رکھ دیں گے ہر طرف سے جہاد جہاد کے نعرے بلند ہو رہے تھے، بیعت، بیعت کا آوازہ بلند ہو رہا تھا۔

مولانا نے جوش و خروش کا رنگ دیکھ کر بڑی سنجیدگی اور متانت کے ساتھ ارشاد فرمایا۔

"تمہارا یہ جوش پسندیدہ ہے، میں تمہارے اس جذبہ کی قدر کرتا ہوں اگر یہ جذبہ صادق ہے تو کوئی شبہ نہیں تم اسلام کی سربلندی کے موجب بنو گے، لیکن میں

صرف جوش کو پسند نہیں کرتا، جوش کے ساتھ ہوش کی بھی آمیزش ہونی چاہئے، بغیر اس کے تمہاری کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوسکتی!"

ایک آدمی آگے بڑھا اور اس نے عرض کیا،

"آپ ہم سے جہاد اور قربانی کے سوا کیا چاہتے ہیں ———؟

مولانا نے فرمایا۔

"پہلے مسلمان بنو، پھر جہاد کے لئے میدان میں اترنے کا ارادہ کرو!"

اس نے دریافت کیا۔

"کیا کوئی غیر مسلم بھی ہماری طرح جہاد کے لئے بیقرار ہو سکتا ہے؟"

مولانا نے فرمایا۔

مقصد خدانخواستہ یہ نہیں ہے کہ تم مسلمان نہیں ہو، یا تمہارا اسلام مشکوک ہے، بلکہ یہ ہے کہ

لاکہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کے قلب و جگر!

جب تک تم میں اسلام کی وہ آن اور شان نہ پیدا ہو جس نے مسلمانوں کو ایک طاقت بنا دیا تھا، اس وقت تک تم جہاد کے سزاوار نہیں ہو سکتے ———!

اس نے پوچھا،

"لیکن وہ آن اور شان کس طرح پیدا ہوسکتی ہے؟"

مولانا نے جواب دیا۔

"اسلام کی تعلیمات پر عمل کرنے سے!"

پھر اس نے سوال کیا؟

"کیا ہم عمل نہیں کرتے ———؟"

مولانا نے بتایا،۔

نہیں ـــــــــــ تم نے غیر اسلامی شعائر کو شعائر اسلام بنالیا ہے، تم روپیہ لے کر لڑکیوں کی شادی کرتے ہو، اور اس انتظار میں وہ بوڑھی ہوجاتی ہیں، تم انہیں ترکۂ پدری میں حصہ نہیں دیتے، حالانکہ قرآن نے یہ حق مقرر کیا ہے، تم بیوہ عورتوں کی شادی نہیں کرتے، حالانکہ داعی اسلام علیہ الصلوۃ والسلام نے یہ کیا ہے، تم نماز کی پابندی نہیں کرتے، روزہ کی شرائط پر روزہ رکھنے کے باوجود عمل نہیں کرتے۔ جب تک یہ خامیاں دُور نہ کرلو، پکے اور کھرے مسلمان نہیں بن سکتے اور جب تک سچے اور کھرے مسلمان نہیں بن سکتے تمہارا جہاد، جہاد نہیں

مولانا کی یہ باتیں سن کر اس شخص پر، اور ان لوگوں پر جو اس کے ساتھ ساتھ گفتگو میں حصہ لینے چلے آئے تھے، ایک اوس سی پڑ گئی۔ تلوار چلانا آسان ہے، تلوار کا وار سہ لینا بھی آسان ہے، لیکن خاندان کی بندھی ہوئی رسموں سے منہ موڑ لینا، اور ان ہوئی باتوں کو کرنے لگنا، ایسی باتیں جو آج تک خاندان میں نہیں ہوئیں، بہت مشکل ہے، اور اس مشکل سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں،

مولانا نے کچھ دیر انتظار کیا، پھر فرمایا:۔

"کیا سوچ رہے ہو میرے عزیزو ـــــــــــ؟"

"وہ کچھ نہیں بولا، ایک دوسرے آدمی نے کہا۔

"ہم یہ سوچ رہے ہیں کہ اگر ہم نے آپ کی باتوں پر عمل کیا، تو گھر میں رہ کس طرح کر سکیں گے؟

مولانا نے ارشاد کیا:۔

ہاں یہ تم نے معقول بات کہی، تمہارے سامنے دو چیزیں ہیں، خاندان اور خدا ان میں سے جسے چاہو منتخب کرلو، میں تمہیں مجبور نہیں کرسکتا۔ جب کہ خدا نے اپنے محبوب رسولؐ تک سے فرما دیا ہے۔

"انك لا تهدى من اجببت"

"جسے تم عزیز رکھتے ہو اسے راہ باب نہیں کر سکتے!"

مولانا کی یہ صاف اور دو ٹوک باتیں سنکر اس نے ایک جھرجھری سی لی اور کہا،

"میں نے خدا کو اختیار کر لیا!"

مولانا نے فرمایا۔

"بہت اچھا کیا، پھر سوچ لو،

اس میں دو چار بڑے سخت مقام آتے ہیں!"

اس نے ایک جوش اور ایک عزم کے ساتھ کہا۔

"خوب اچھی طرح سوچ لیا، میں تمام سختیاں سہوں گا، لیکن اس راہ سے منہ نہ موڑوں گا!"

مولانا نے اسے گلے سے لگا لیا، اور کہا۔

"جزاک اللہ ——————— مسلمان کی شان یہی ہے، حدیث میں وارد ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، وہ شخص سچا مسلمان نہیں ہو سکتا جو دنیا میں سب سے زیادہ مجھے عزیز نہ رکھے، تم نے ثابت کر دیا کہ اس راہ میں تم رضائے الٰہی اور حب رسول اللہ کے سوا کسی چیز کو خاطر میں نہیں لاتے، ایک مسلمان کی یہی شان ہے میں تمہیں مبارک باد دیتا ہوں اس دلیرانہ فیصلہ پر!"

اس نے التجا کے لہجہ میں کہا،

"تو پھر بیعت کر لیجئے!"

مولانا نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا، اسے دیکھ کر بھی وہ نوجوان خاموش رہا، جس نے گفتگو کا آغاز کیا تھا، اس کے ساتھی نے اس سے کہا۔

"سہیل، تم بھی کیوں نہیں بیعت کی سعادت حاصل کر لیتے ———؟"

سہیل نے جواب دیا۔

"جب تک میں اپنی بہنوں کو ان کا حصہ نہ دے لوں اتنی بڑی جرأت نہیں کرسکتا اور یہ کام میں ابھی جاکر انجام دوں گا۔ اور اس کے بعد میرا پہلا کام یہی ہوگا کہ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوکر بیعت کرلوں!

مولانا نے شفقت سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا، فرمایا۔

"ہاں تمہیں ایسا ہی کرنا چاہیے!"

باب ۷

پنجاب پکار رہا تھا!

اور یہ جہاد کی باتیں، نہ بے موقع تھیں، نہ غیر ضروری، حالات ہی ایسے پیدا ہوگئے تھے کہ کوئی خود دار اور غیور مسلمان خاموشی سے انہیں برداشت نہیں کر سکتا تھا، یوں تو سارے ہندوستان کے حالات بہت ہی زیادہ نازک ہو چکے تھے۔ وہاں مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو رہا تھا، ان کے مذہبی شعائر کی بے حرمتی کی جاتی تھی، اور ان کے ناموس اور آبرو پر ڈاکہ پڑ رہا تھا ——— یہ تھے وہ حالات جب مولانا نے جہاد کی تیاریاں سید صاحبؒ کی حسب ہدایت شروع کیں!

"اٹھارہویں صدی عیسوی، صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ تمام دنیا میں بڑی اہم سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کا زمانہ تھا۔ کچھ ملک غلامی کی زنجیریں توڑنے میں مصروف تھے۔ جن کی گردنوں میں غلامی کے طوق ڈالنے کی تیاری کی جا رہی تھی۔ امریکہ کی جنگ آزادی کامیاب طور پر لڑی جا چکی تھی، انقلاب، فرانس نے سارے یورپ میں آزادی کی تحریکوں کو ابھارہ دیا تھا۔ پرانا سیاسی اور سماجی نظام درہم برہم ہو رہا تھا۔ اور انگلستان کے مشہور شاعر ورڈسورتھ (WORDSWORTH) کو فرانس میں ایک نئی دنیا جنم لیتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی، لیکن عالم اسلامی کی حالت بالکل مختلف تھی۔ وہاں عام رجحان پستی اور تنزل کی جانب تھا ایک طرف دولتِ عثمانیہ کا آفتابِ اقبال تیزی کے ساتھ گہن میں آ رہا تھا، دوسری طرف ایران میں انتشار و ابتری کا دور دورہ تھا، ادھر سلطنت مغلیہ دم توڑ رہی تھی، نئی نئی قومیں ابھر کر سیاسی فضا کو مکدر کر رہی تھیں اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مسلمانوں کی سیاست اور

سماج کی ساری بنیادیں ہمیشہ کے لئے ہل جائیں گی،

۳ مارچ ۱۷۰۷ء کو اورنگ زیب نے داعی اجل کو لبیک کہا تقریباً نصف صدی تک وہ ہندوستان کے سیاسی حالات کو درست کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا اور بڑی حد تک اس میں کامیاب بھی ہوگیا تھا۔ آخری وقت میں اس نے اپنے بیٹوں کو وصیّت کی کہ وہ صلح اور خوش دلی کے ساتھ سلطنت کو تین حصّوں میں تقسیم کرلیں۔ یہ وصیّت حالات کے گہرے مطالعہ اور اپنے بیٹوں کی صلاحیتوں کے صحیح جائزے پر مبنی تھی، عالمگیر کی دوربین نگاہوں نے ان طاقتوں کو ابھرتے ہوتے دیکھ لیا تھا جن کا استیصال ایک مرکز سے قطعاً ناممکن تھا۔ لیکن اس کے تنگ نظر اور خود غرض جانشینوں نے اس وصیّت کی طرف توجہ نہ کی، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ طاقت جو تین مرکزوں میں تقسیم ہوکر مخالف قوتوں کو دبانے میں صرف کی جاسکتی تھی آپس میں لڑکر ختم ہوگئی۔

۱۷۰۷ء سے ۱۸۵۷ء تک اگر ایک طرف جنگِ تخت نشینی نے سیاسی نظام کو متزلزل رکھا تو دوسری طرف بادشاہوں کی کوتاہ اندیشی، عیش پرستی اور پست ہمتی نے حالات کو بد سے بدتر کردیا۔ ملک کے گوشہ گوشہ میں باغیانہ قوتیں کام کرنے لگیں، اور ہر طرف لوٹ مار قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوگیا، ان حالات میں کچھ بوریہ نشینوں نے بادشاہ کو اس کے گہوارۂ عیش و عشرت میں بیدار کرنے کی کوشش کی۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بادشاہ وزیراورامراء کے نام دس کلمات کا ایک اعلان جاری کیا جس میں مطالبہ کیا۔

"آنکہ بادشاہ اسلام و امراء کبار بہ عیش حرام مشغول نہ شوند،
ازگذشتہ توبہ نصوح بجاآرند و آئندہ اجتناب نمائید"

شاہ فخرالدینؒ صاحبؒ نے ہدایت کی ——————————

"پس اوّل ایں است کہ آں صاحب بذات خود مستعد محنت کشی و ملک گیری شوند"

لیکن ہمے وِدامش وہلنگ و لو، کی اس دنیا میں مدرسوں اور خانقاہوں کی یہ آواز کہاں سنی جاسکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زوال و انحطاط کی رفتار تیز سے تیز تر ہوگئی۔ مرکزی حکومت کا ڈھانچہ بے جان ہوکر گرنے لگا۔ صوبائی گورنروں، جاگیرداروں، امراء اور حکام نے سیاسی بدنظمی سے فائدہ اٹھاکر اپنی طاقت بڑھانی شروع کردی اور وہ سلطنت مغلیہ جس کا اقتدار کبھی کشمیر سے دکن اور بنگال سے کابل و قندھار تک تسلیم کیا جاتا تھا، سمٹ کر قلعہ معلےٰ کی چاردیواری میں آگئی!

فرمانرواؤں کی غفلت اور عیش پسندی سے سب سے پہلے جو طبقہ فائدہ اٹھایا کرتا ہے، وہ ہمیشہ امراء کا ہوتا ہے، اٹھارویں صدی میں ان امراء نے جو حالات پیدا کردیئے تھے وہ حد درجہ افسوسناک تھے، اپنے مقاصد کے حصول کے لئے وہ ایک طرف گروہ بندی کرتے تھے، دوسری طرف بیرونی طاقتوں سے ساز باز، اس طرح سماج، اور سیاست کا ہر ہر گوشہ ان کی شاطرانہ چالوں سے متاثر ہوتا تھا، جماعت بندی کے مسموم اثرات محلات سے لے کر جھونپڑیوں تک پہنچتے تھے، اور سماجی زندگی کی تلخیوں میں اضافہ کرتے تھے دربار میں دو مستقل پارٹیاں (ایرانی اور تورانی) تھیں، ہندوستان کی سیاست ان ہی دو پارٹیوں کے گرد گھومتی تھی، تاریخ احمد شاہی کے مصنف نے ان حالات میں لکھا تھا

"یہ تمام فتنہ و فساد، ایرانی اور تورانی امراء کے آپس کے جھگڑوں کا نتیجہ ہے۔"

سیاسی حالات کا اتار چڑھاؤ ان ہی امراء کی ابروئے چشم کے تابع تھا۔ سر جادو ناتھ سرکار کا خیال ہے کہ سلطنت مغلیہ کے آخری دَور کی تاریخ صرف ان ہی دو پارٹیوں کی نبرد آزمائی کا نام ہے۔

مرکز کو کمزور پاکر صوبائی حکومتوں کا اعلانِ خودمختاری کر دینا بالکل فطری بات تھی چنانچہ سعادت علی خاں نے اودھ میں، علی وردی خاں نے بنگال میں اور نظام الملک نے دکن میں اپنا اقتدار قائم کرلیا اور اس طرح سلطنت مغلیہ کا سیاسی اقتدار اور اقتصادی ذرائع ختم

ہو گئے۔

جو علاقہ شاہان مغلیہ کے قبضہ میں تھا، وہاں جاگیرداری اور اجارہ داری کی رسمیں جاری تھیں اور ان کے مذموم اثرات کاشت کار سے لے کر حکومت وقت تک کے لئے پریشانی کا باعث بنے ہوئے تھے۔ بڑے جاگیردار ایک طرف حکومت کے ٹیکس ادا کرنے سے گریز کرتے تھے دوسری طرف غریب کاشت کاروں کا خون چوستے تھے ان کا وجود حکومت کے لئے پریشان کن اور کاشت کاروں کے لئے ایک بلائے آسمانی کی مانند تھا چھوٹے چھوٹے منصب داروں کی حالت مختلف تھی، انہیں کوئی لگان دینے پر ہی آمادہ نہ ہوتا تھا۔ مرکزی حکومت نے اپنا کام آسان کرنے کے لئے سارا ملک جاگیرداروں میں بانٹ رکھا تھا۔ جو علاقہ باقی رہ گیا تھا وہاں اجارہ داری کی رسم جاری کر دی تھی، ان حالات میں ہر طبقہ پریشان اور اقتصادی بدحالی میں مبتلا تھا بادشاہ کے ایک لاکھ ملازمین تھے جن میں سے کچھ اہل نقدی تھے اور کچھ اہل جاگیر، دونوں کی حالت بقول شاہ ولی اللہ یہ ہوگئی تھی کہ

کاسۂ گدائی در دست گرفتہ

ان حالات میں ناگزیر تھا کہ ملک کے وہ تمام عناصر جو تھوڑی سی بھی قوت جمع کر سکتے ہوں، قسمت آزمائی کے لئے تیار ہو جائیں، سکھ، مرہٹے، روہیلے، جاٹ سب نے اس ماحول میں ہنگامہ آرائی کی، اور حالات کو اس درجہ خراب کر دیا، کہ امن و سکون ملک سے مستقل طور پر رخصت ہوگیا، فتنہ و فساد، منافرت و عداوت لوٹ مار اور غارت گری نے سماجی زندگی کا نام و نشان بھی باقی نہ چھوڑا۔

سیاسی انتشار، اخلاقی زبوں حالی اور معاشی بحران کے اس دور میں ایک بیرونی طاقت نے اپنے پنجے جمانے شروع کئے اور رفتہ رفتہ پورے ملک پر قبضہ کر لیا، اس غیر ملکی تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لئے کچھ کوششیں بھی کی گئیں، لیکن اس بیرونی طاقت کے

پیچھے یورپ کا صنعتی انقلاب تھا اور شہنشاہیت کا بے پناہ خمار، یہ کوششیں فوری طور پر بار آور نہ ہوئیں اور کچھ عرصہ کے لئے ملک غلامی کی زنجیروں میں جکڑا گیا۔

پندرہویں صدی میں اسلام کے اثر سے ہندوؤں میں جو مذہبی رہنما پیدا ہوتے تھے، ان میں گرونانک (۱۴۶۹ء — ۱۵۳۸ء) کی شخصیت خاص اہمیت رکھتی ہے وہ بڑے وسیع مشرب انسان تھے وحدانیت اخلاقی زندگی اور سماجی مساوات پران کا ایمان تھا۔ مسلمان بزرگوں اور صوفیہ کی صحبت سے وہ کافی مستفیض ہوئے تھے، پاک پٹن میں حضرت بابا فرید گنج شکر کے سجادہ نشینوں کی صحبت سے کافی فائدہ اٹھایا تھا۔ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور نے لکھا ہے،

" بابا نانک انسانی دل کو سیاسی آزادی نہیں، بلکہ رُوحانی آزادی دلانا چاہتے تھے ان کا مقصد تھا کہ ان کے پیرو، خود غرضی مذہبی تعصب اور روحانی جمود سے آزاد ہوں، گروگوبند نے ان کی روحانی طاقت کو مادی کاموں میں لگا دیا۔ یہ ایک اچھی تحریک کا حسرتناک انجام تھا۔"

جب تک سکھوں کی تحریک خالصتاً مذہبی رہی۔ مسلمان بادشاہوں نے اس کے رہناؤں کے ساتھ بڑی عزت اور احترام کا برتاؤ کیا۔ لیکن جب اس نے سیاسی رنگ اختیار کر لیا۔ تو مغل بادشاہوں کے تعلقات کی نوعیت بھی بدل گئی۔ مشہور ہے کہ جب بابر ہندوستان آیا تو گرونانک کی خدمت میں عقیدت مندانہ حاضر ہوا، گرونانک نے اسے ہندستان کی فتح اور سات پشتوں تک اس کی نسل کی حکمرانی کی دعا دی، اکبر نے گروجی امرداس وغیرہ کی بڑی عزت کی، گرو ارجن کے متعلق تو یہاں تک مشہور ہوگیا تھا کہ ان کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ شہنشاہ تک ان کے آگے جھکتا ہے۔ جب اکبر چتوڑ پر حملہ آور ہوا تھا تو بھگوان داس کو گرو امرداس کے پاس دعا کے لئے روانہ کیا۔ کہتے ہیں کہ اکبر نے خود حاضر ہوکر ان سے بارہ دیہات قبول کرنے کی درخواست کی تھی گرنتھ پر ۵۱ اشرفیاں چڑھائی تھیں، گرو ارجن کی سفارش

پر پنجاب کا ایک سال کا لگان معاف کر دیا تھا۔ سر جمیس دوئی (SIR JMES DOVIE) نے لکھا ہے کہ سکھوں کے ساتھ اکبر کے اس اچھے برتاؤ کا ایک سبب یہ تھا کہ اکبر نے آزادانہ مذہبی افکار بہت حد تک ان گروؤں کے اصولوں سے ہم آہنگ تھے ۔

مغل بادشاہوں کے یہ تعلقات اس وقت تک رہے جب تک سکھوں کے رہناؤں نے سیاست میں مداخلت نہیں کی، جو نہی اس تحریک نے رنگ بدلا شاہانِ مغلیہ کے رویہ میں بھی تبدیلی پیدا ہوگئی۔ مسلمان بادشاہوں کی مخالفت کا سبب کوئی مذہبی عناد نہ تھا بلکہ اس کی وجہ کلیتہً سیاسی تھی گرو ارجن نے ایک سیاسی نظام تیار کیا، اور امرت سر کو عسکری مرکز بنا کر کابل سے ڈھاکہ تک جہاں جہاں سکھ بستے تھے ان سے محصول لینا شروع کیا، اس طرح بقول ڈاکٹر تارا چند ایک حکمران طبقہ میں منتقل ہوگئی، دولت کی ہوس اس قدر بڑھ گئی کہ خود سکھوں میں مشہور ہوگیا کہ دنیا کی دولت گرو نانک سے بارہ کوس کے فاصلہ پر تھی گرو انگد سے چھ کوس پر امر داس کے دروازہ پر، گرو امر داس کے قدموں میں اور گرو ارجن کے گھر میں ۔

سکھوں کا سب سے پہلا جھگڑا جہانگیر سے ہوا۔ گرو ارجن (۱۶۰۹ — ۱۵۸۱) نے شہزادہ خسرو کو جس نے اپنے باپ کے خلاف بغاوت کی تھی، پناہ دی ۔ جہانگیر نے اس بات پر گرو کو دربار میں بلایا اور جرمانہ کیا۔ جب انھوں نے جرمانے کی ادائیگی سے انکار کیا، تو ان کو سزا دی گئی ڈاکٹر بینی پرشاد نے صحیح لکھا ہے کہ سزا صرف سیاسی اسباب کی بنا پر دی گئی تھی۔ اگر گرو ارجن ایک باغی شہزادے کی مدد نہ کرتے تو وہ بلا ضرر اور پورے اطمینان کے ساتھ اپنے دن گذار سکتے تھے، سر جادو ناتھ سرکار کا بھی یہی خیال ہے کہ اس قتل میں کوئی مذہبی جذبہ شامل نہ تھا یہ سزا وہی تھی جو معمولاً سیاسی مجرموں کو دی جاتی تھی، واقعہ کی نوعیت کچھ بھی ہو، یہ حقیقت ہے کہ اس قتل نے شاہانِ مغلیہ اور سکھوں کے درمیان ایک ابدی

لے چاک ٹکڑے کو کہتے ہیں، گرو چاک، کے معنی ہوئے وہ ٹکڑا جو گرو کو پیش کیا جائے ۔

منافرت کا بیج بو دیا۔ اس کے بعد جب گرو ہرگوبند (۱۵۹۴ — ۱۶۰۶ء) نے سکھوں کی تنظیم بالکل سیاسی نہج پر شروع کر دی تو حکومت سے ان کا تصادم یقینی ہوگیا۔" ڈاکٹر سنہا نے گرو گوبند کو سکھ عسکریت کا بانی بتایا ہے۔

گرو ہر رائے (۱۶۳۱ - ۱۶۵۴ء) نے جنگ تخت نشینی کے دوران میں دارا شکوہ کو مدد دی، اور اورنگ زیب سے ان کے تعلقات خراب ہو گئے پھر تیغ بہادر نے (۱۶۷۵-۱۶۶۴ء) کشمیر کے ہندوؤں میں بغاوت پھیلانی شروع کی تو اورنگ زیب نے ان کو قتل کرا دیا، گرو گوبند سنگھ (۱۶۷۵ — ۱۷۰۸ء) سے بھی اس کے تعلقات خراب رہے، ۱۶۷۶ء میں جب بادشاہ جامع مسجد سے نکل رہا تھا۔ تو ایک سکھ نے بادشاہ پر اینٹیں پھینکیں۔ اب سکھوں کی دشمنی صرف بادشاہوں تک ہی محدود نہ رہی، عام مسلمانوں سے بھی مخالفت شروع ہوگئی سکھ رہنماؤں نے حکم دیا کہ کوئی سکھ مسلمان بزرگوں کی قبروں پر نہ جائے، اگر جائے گا تو ۱۲۵ روپے جرمانہ کیا جائے گا۔

اورنگ زیب نے جب اُن کے سیاسی اقتدار کو بڑھتے ہوئے دیکھا اور سلطنت مغلیہ سے ان کی دشمنی کا پورا یقین ہوگیا تو ان کے استیصال کی کوششیں شروع کر دیں نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی اجتماعی وحدت کا خاتمہ ہوگیا۔ نہ ان کا ایک مرکز رہا۔ نہ ایک رہنما، ان کی طاقت منتشر ہوگئی، سر جادو ناتھ سرکار کا خیال ہے کہ اگر اورنگ زیب کے جانشین لائق ہوتے تو سکھوں کا بھی وہی حشر ہوتا، جو دہنو کی وانک اور تانیتہ ٹوپی کا برطانوی عہد میں ہوا تھا اورنگ زیب کے کم زور جانشینوں نے ان کے لالچ کو اور بڑھا دیا۔ اور ان کی چیرہ دستیاں اور مظالم اس حد تک پہنچ گئے کہ

زنہائے حاملہ را شکم دریدہ جنین را کشیدہ می کشتند"

"بندا کے مظالم سے تمام شمالی ہندوستان گھبرا اٹھا۔ ۱۷۱۰ء میں جب سرہند پر سکھوں کا حملہ ہوا تو بہت سے مسلمانوں نے ہندوؤں کے گھروں میں بھیس بدل کر پناہ لی، ان کے مظالم

زندوں تک محدود نہ رہے۔ شاہ قمیص قادریؒ کا مزار خود ان کی اولاد سے جبراً کھدوایا گیا۔ سہارنپور میں عورتیں سکھوں کے ڈر سے کنوؤں میں ڈوب کر مر گئیں۔ بعض لوگوں نے قتل و غارت گری کے اس ہنگامہ میں اپنے نام بدل دیئے۔

۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کا حملہ ہوا۔ اس کے بعد سکھوں کی طاقت اور ہمت میں اضافہ ہوگیا۔ ۱۷۳۹ء سے ۱۷۶۵ء تک متعدد بیرونی حملوں کی وجہ سے حالات خراب ہو گئے۔ اور سکھوں کو ہنگامہ آرائی کا موقع ملا انہوں نے ۱۷۶۴ء میں لاہور پر قبضہ کرلیا اور جہلم سے جمنا تک اپنا تسلط قائم کرلیا۔ ۱۷۶۵ء اور ۱۸۰۰ء کے درمیان ان کا اقتدار اور بڑھا۔ اٹک سے کرنال تک اور ملتان سے جموں تک ان کے قبضہ میں آگیا۔ اور انہوں نے دوآبہ اور روہیل کھنڈ پر بھی حملے کرنے شروع کر دیئے۔

انیسویں صدی کے شروع میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پنجاب پر اپنا اقتدار قائم کیا اور سکھوں کی طاقت اپنے پورے عروج پر پہنچ گئی [1]

اور اس طاقت نے مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے، ان کے آثار و نقوش کو مٹانے اور ان کے جذبات کو کچلنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔!

---

[1] "تاریخ مشائخ چشت ص ۱۹۱

باب ۸

کوہِ نُور ہیرا

بدقسمت شاہ شجاع، خوش قسمت رنجیت سنگھ

اب پنجاب پر رنجیت سنگھ دادِ شہر یاری دے رہا تھا، اس نے مسلمانوں کی دولت لوٹ لی، ان کی جاگیریں ضبط کرلیں، شاہی قلعہ پر قبضہ کرکے اس کی عمارتیں توڑ پھوڑ ڈالیں، شالامار کا خوبصورت باغ اجاڑ دیا، شاہی مسجد کی بے حرمتی کی، مسلمان مردوں اور عورتوں کی بے آبروئی کی، مسلمانوں پر اس نے جو مظالم کئے وہ اپنے وقت پر بیان ہوں گے، لیکن اس نے اپنی محسن قوم افاغنہ کے ایک معزول اور بدبخت تاجدار کے ساتھ کیسا سلوک کیا، یہ ایک جگر خراش داستان ہے۔

لیکن اس داستان سے بھی پہلے رنجیت سنگھ کے عروج و اقتدار کی کہانی سُن لیجئے۔ رنجیت سنگھ قدرتی طور پر فراست اور دانشمندی کا مالک تھا۔ گر زمان شاہ کے جو کہ احمد شاہ کا پوتا تھا۔ پنجاب میں آنے کے سبب ایسا موقع ہاتھ آگیا، جس کے باعث اس کو تھوڑے عرصہ میں بڑا بھاری عروج حاصل ہوگیا۔ چنانچہ جس وقت ۱۷۹۷ء میں زمان شاہ نے دوبارہ پنجاب میں جاکر لاہور پر قبضہ کرلیا، تو سکھ حسب معمول تاب مقابلہ تو نہ لاسکے، مگر ان کے سامان بار برداری کہیں کہیں لوٹتے رہے اور جس وقت بادشاہ واپس اپنے ملک کو جا رہا تھا۔ تو بسبب طغیانی بارہ ضرب توپیں دریائے جہلم کی نذر ہوگئیں، چونکہ ٹھہر نہیں سکتے تھے، اس نے رنجیت سنگھ کو کہہ دیا کہ اگر اسی دن توپوں کو نکلوا کر بادشاہ کی خدمت میں پہنچا دے تو علاوہ خطاب راجگی ضلع لاہور اس کو عنایت کیا جائے گا، چنانچہ

رنجیت سنگھ نے آٹھ ضرب توپیں نکلوا کر پشاور پہنچوا دیں۔

۵۲-۱۷۵۱ء میں احمد شاہ دریائے انڈس عبور کر کے پنجاب پر حملہ آور ہوا۔ میر منّو کو لاہور کے قریب شکست ہوئی اور اس نے لاہور کی قلعہ بندی کو ناکافی سمجھ کر بحالتِ مجبوری بادشاہ کی اطاعت منظور کر لی، بادشاہ کو اس کامیابی سے بہت مسرّت ہوئی اور اس نے میر منّو کو اپنی طرف سے پھر ملتان اور لاہور کا وائسرائے بنا دیا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد وائسرائے کے انتقال ہونے پر اس کی بیوہ نے اپنے نابالغ بچّہ کی نیابت میں عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی لیکن ایک عورت کے عہدِ حکومت میں سکھوں کے جتھے کو دبانے کی کچھ سرگرمی ظاہر نہ ہوئی، اس لحاظ سے ان کی تعداد اور جرأت میں پھر روز افزوں ترقی ہوتی گئی اور ان کی لوٹ مار کا سلسلہ روز بروز زیادہ خطرناک ہونے لگا اور تمام صوبہ میں ہر وقت بدنظمی اور ابتری رہنے لگی۔ چار سال کے وقفہ کے بعد احمد شاہ پھر آن موجود ہوا اور پنجاب و سرہند پر قبضہ کر کے دونوں کی حکومت کو اپنے بیٹے تیمور کے سپرد کر دیا اور خود کابل کو واپس چلا گیا۔

۱۷۵۸ء میں ارینہ بیگ نے جو درّانی حکومت سے منحرف ہو گیا تھا، مرہٹوں کو پنجاب میں آنے کی ترغیب دی، ادھر شہزادہ تیمور نے جب یہ دیکھا کہ وہ اس طوفان کو روک نہیں سکتا، تو مجبوراً علیحدگی اختیار کی، مرہٹوں کو اب ایسا عروج حاصل ہو گیا تھا کہ ہندوستان میں ان کو سب طاقت ور قوم تسلیم کرنے لگے تھے، اسی لئے مسلمان صوبہ داروں کو اپنی ریاستوں اور خود مختاری کے قائم رکھنے کے لئے اتنا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ احمد شاہ کا انڈس سے مشرق کی طرف آنا ہندوستان کی ایک بڑی جماعت نے نہایت خوشی کی نظروں سے دیکھا، بادشاہ کی آمد پر مرہٹے بھاگ نکلے اور تعاقب ہونے پر بسبب کمی رسدات کے لڑنے پر آمادہ ہوئے، مگر اسی لڑائی میں ان کی ایک جرّار فوج جس کی تعداد اسی ہزار تھی، قطعی طور پر تباہ ہو گئی۔ دربار پونا نے بے انتہا کوشش کی کہ اب اس مصیبت کی کچھ تلافی کی جائے، جنوری ۱۷۶۱ء میں بمقام پانی پت یہ آخری ہنگامہ برپا ہوا۔ بڑے بھاری کشت و خون کے

بعد افواج مرہٹہ کو کلی طور پر شکست ہوئی اور ان کی طاقت نیست و نابود ہوگئی۔

اس دفعہ احمد شاہ نے لاہور اور سرہند کو مستقل طور پر اپنے ملک میں شامل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن اس نے پنجاب میں زیادہ قیام نہ کیا، اور چونکہ وہ گورنر جو مامور کیا گیا تھا۔ اپنے پاس بہت خفیف فوج رکھتا تھا، اس لئے ملک پر مضبوطی کے ساتھ قبضہ نہ رہ سکا سکھوں نے اس غفلت سے فائدہ اٹھا کر مختلف مقامات کے قلعہ جات کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ اور اپنی طاقت و دولت کو ترقی کے درجہ پر پہنچایا۔ علاوہ اوروں کے رنجیت سنگھ کے بزرگوں کی شہرت قائم ہوگئی، ۱۷۶۲ء میں احمد شاہ یہ خبر سن کر کہ سکھوں نے پھر سر اٹھایا ہے، انڈس کے کنارے پر آموجود ہوا، اور سکھوں پر حملہ کرکے بہت کشت و خون کے بعد ان کو شکست دی اور حفاظت ملک کے واسطے دریائے انڈس کی طرف مناسب انتظام کرکے پھر کابل کو واپس چلا گیا۔

اس کے پیٹھ پھیرنے کی دیر تھی، کہ سکھ پھر میدان جنگ میں آموجود ہوئے، اور سرہند پر حملہ کرکے مسلمان گورنر کے ساتھ لڑائی شروع کر دی اور وہ شکست کھا کر مارا گیا، اس جرأت کے سبب سے احمد شاہ پھر ہندوستان پر چڑھ آیا، اس کے آتے ہی سکھ تتر بتر ہوگئے، مگر اس نے جانچ لیا کہ اس آفت کا علاج اور سکھوں کا دبانا مشکل ہے۔ چنانچہ اس کے جانے کے بعد وہ پھر جمع ہو کر لاہور کے مالک بن بیٹھے، احمد شاہ اس گستاخی کی سزا دینے کے واسطے پھر لوٹا۔ مگر سکھ اس کے آنے سے پہلے پھر بھاگ گئے اس دفعہ اس کو بہت جلد واپس کابل جانا پڑا اور اس کے بعد سکھ پنجاب پر مسلّط ہوگئے اور انہوں نے اپنی مستقل وراثت سمجھ کر بلا چون وچرا اس پر قبضہ کر لیا سکھ سرداران کے ساتھ لڑائی میں بجائے تنخواہ دار سپاہیوں کے ان کے رشتہ دار ہوا کرتے تھے جو اپنے آپ کو لڑائی میں حصہ دار اور رفیق خیال کرتے تھے اور مقبوضہ ملک کو ایک مشترک جائداد قرار دے کر اپنی خدمات کے مطابق حصہ پاتے تھے، ان جرگوں کو مسل کہتے تھے، اور ایسی مسلیں بارہ تھیں اور یہ مسلیں میدانِ جنگ

میں ستر ہزار سوار فراہم کر سکتی تھیں، ان مسلوں میں سے چھڑت سنگھ کی مسل کی جو رنجیت سنگھ کا مورث اعلےٰ تھا، سب سے کم تعداد تھی، لیکن جملہ قوم سکھاں کی کچھ ایسی غیر مستقل حالت تھی اور گرو ماتا یعنی سٹیٹ کونسل کی حکومت ایسی ضعیف تھی، اور سرداروں میں سازش اور بلند نظری کی کچھ ایسی ہوا پھیلی ہوئی تھی، کہ ہر جری اور لائق شخص کو اقتدار حاصل کرنے کا بڑا بھاری موقع موجود تھا، رنجیت سنگھ ۲، نومبر ۱۷۸۰ء میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ مہان سنگھ ایک چست اور دلیر سردار تھا مہان سنگھ ۱۷۹۲ء میں ۲۷ سال کی عمر میں انتقال کر گیا۔ رنجیت سنگھ اس کا اکلوتا بیٹا بارہ سال کی عمر میں اس کا جانشین ہوا نو عمر راجہ کی تعلیم و تربیت کی طرف کچھ توجہ نہیں ہوئی تھی اور اس کی ابتدائی زندگی سیر و شکار میں صرف ہوئی اور اس کو کسی زبان میں لکھنا پڑھنا نہ سکھایا گیا۔ سترھویں سال میں قدم رکھتے ہی رنجیت سنگھ نے اپنے باپ کی طرح دیوان کو علیٰحدہ کر کے انتظام معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیا ۹۶، ۱۷۹۵ء کے دوران میں شاہ زمان جو انہیں ایام میں تخت کابل پر حکمران تھا۔ پنجاب میں دو دفعہ حملہ آور ہوا ۱۷۹۷ء میں بادشاہ بھی آگے بڑھا، مگر یہ دیکھ کر اس ملک کو قبضہ میں رکھنے کے واسطے ایک مستقل انتظام کرنا ناممکن ہے وہ اپنے جدی ملک کی طرف واپس چلا گیا اور جملہ سکھ سردار جو بادشاہ کی آمد کے وقت ملک کو خالی چھوڑ کر بھاگ گئے تھے اب پھر آگئے۔ بادشاہ کی مراجعت کے بعد رنجیت سنگھ کے دل میں لاہور پر قبضہ کرنے کا ولولہ پیدا ہوا اور بادشاہ کی ایک بر وقت خدمت کرنے کے سبب سے اس نے انعام میں یہ جگہ لے لی، اور ایک نمایاں خدمت کے صلہ میں بادشاہ سے لاہور پر قبضہ کرنے کا حکم حاصل کر لیا پھر جب افغانوں کی سلطنت میں ابتری شروع ہوئی تو شاہی حکومت لوگوں کی نظروں سے بالکل گر گئی۔ یہ حالت دیکھ کر رنجیت سنگھ نے ۱۸۰۳ء میں مصمم ارادہ کر لیا کہ سلطنت کے باقی صوبہ جات کو دریائے انڈس کے مشرق کی طرف واقع تھے اپنے قبضہ میں لے آئے اس لئے اس نے دریائے راوی سے عبور کیا۔

اور دریائے انڈس تک کے تمام سرداروں نے اس بات کو دیکھ کر آئندہ کے

واسطے ان کو صرف اسی طرف سے امید و خوف کی تصویر نظر آتی رہے، فوراً حاکم لاہور کی اطاعت قبول کر لی اور دریائے کابل سے آئندہ کے لئے اپنے تمام تعلقات قطع کر لئے۔

رنجیت سنگھ نے دریائے ستلج کے مشرق اور جنوبی کناروں کی طرف بھی ایسا ہی غاصبانہ تسلط کا سلسلہ جاری رکھا اور اس کی حکومت پنجاب میں کامل طور پر اس طرح قائم ہو گئی کہ ہندوستان کی گورنمنٹ برطانیہ کی پالیسی کے واسطے یہ ضروری ہو گیا کہ اس کے ساتھ رابطہ اتحاد قائم کرے، چنانچہ اس ارادہ کی تکمیل میں ۱۸۰۸ء مسٹر مٹکاف لاہور بھیجے گئے۔

رنجیت سنگھ کو بہت جلد یہ بات ذہن نشین ہو گئی کہ بجائے اس کے کہ گورنمنٹ برطانیہ کے ساتھ دشمنی کو بھڑکائے، اتحاد و آشتی کر لینا بہتر پالیسی ہو گی۔ اس لئے ۲۵ اپریل ۱۸۰۹ء کو بمقام امرت سر ایک عہدنامہ باہمی صلح و اتحاد کا مکمل ہوا۔

شروع سال ۱۸۱۲ء میں کھڑک سنگھ ولی عہد کی شادی تزک و احتشام سے لاہور میں ہوئی اور اس موقع پر کرنل اخترلونی بھی شامل ہونے کے لئے مدعو کیا گیا۔

مارچ ۱۸۱۳ء میں شاہ شجاع لاہور آیا اس کی بیوی نے جو پہلے سے وہاں تھی اپنے خاوند کو اس بات کا یقین دلایا تھا کہ فرمانروائے پنجاب اس کا دوست ہے، لیکن لاہور پہنچتے ہی اس پر مہاراج کی طرف سے یہ تقاضا شروع ہوا۔ کہ وہ کوہ نور ہیرا دیدے اور اس کے عوض میں جاگیر لے لیں، چونکہ یہ الماس نہ بہت مشہور اور نایاب تھا۔ اس لئے مہاراج کو یہ اشتیاق تھا کہ جس طرح بن پڑے یہ ہیرا ہمارے پاس آ جائے۔ اور ادھر اس کے نہ دینے پر اصرار کہ یہ نادر چیز ہاتھ سے نہ جائے۔ مگر دونوں فریق کی موجودہ حالت یکساں و ہمسری کی نہ تھی اور رنجیت سنگھ کی خصلت جس میں بدیانتی کی آمیزش زیادہ تھی ان تدابیر کے اختیار کرنے میں جن کے ذریعے سے اس نے اس نہایت ہی پسندیدہ تحفہ کو حاصل کیا، عجیب طور سے ظاہر ہوئی۔

بادشاہ کی ضد پر غالب آنے کے لئے جس قدر سختی مناسب حال تھی۔ استعمال میں

لائی گئی، اور ہیرے کو اپنے قبضہ میں لانے کے لئے کوئی دقیقہ باقی نہ اٹھا رکھا۔ یہاں تک کہ اس بے وطن خاندان کو دو دن تک کوئی چیز کھانے کو نہ دی گئی۔

بادشاہ نے تو بہت انکار کیا کہ الماس اس کے پاس نہیں ہے مگر جب دیکھا کہ حجت سے کام نہیں چلتا تو ہیرے کے دینے پر رضامند ہونا پڑا، اس لئے یکم جون ۱۸۱۳ء کو رنجیت سنگھ شاہ شجاع کی خدمت میں اس کے لینے کی غرض سے آیا، بادشاہ نے اس کو بڑی عزت سے بٹھایا اور ایک گھنٹہ تک بڑی متانت کے ساتھ دونوں خاموش بیٹھے رہے، اس کے بعد رنجیت سنگھ بے تاب ہوگیا اور ایک مصاحب کو اشارہ کیا کہ بادشاہ کو ملاقات کا مقصد یاد دلائے۔ اس کا جواب تو کچھ نہ ملا، مگر بادشاہ نے اسی وقت ایک خواجہ سرا کو اشارہ کیا، جو اسی وقت جا کر ایک چھوٹا سا ڈبہ لے آیا جس کو اس نے قالین پر دونوں سرداروں کے مساوی فاصلہ پر رکھ دیا۔ رنجیت سنگھ نے اس ڈبے کو کھولنے کا حکم دیا اور جونہی الماس اس کی نظر پڑا تو اس نے فوراً اس کو شناخت کر کے اٹھا لیا اور اسی وقت وہاں سے چلا آیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد بادشاہ نے بیس ہزار اور روپیہ دے کر رہائی حاصل کی مگر پھر بھی وہ اس ظالم کے پنجہ سے نہ چھوٹ سکا، کیونکہ رنجیت سنگھ نے تھوڑی دیر بعد یہ خبر پا کر کہ اس کے علاوہ اور بیش بہا جواہرات بادشاہ کے پاس موجود ہیں اس پر اسی طرح قابو کر لیا اور جب تک ان جواہرات پر قبضہ نہ کر لیا اسکو نہ چھوڑا اس قدر مصیبتوں اور ذلتوں کے بعد شاہ شجاع آخر کار بچ کر نکل گیا اور اسکے بعد کئی اور بدقسمتیوں میں مبتلا رہ کر برٹش گورنمنٹ کی پناہ میں آگیا یہاں اسکا معمولی وظیفہ

لے یہ الماس جو ڈیڑھ انچ لمبائی میں اور ایک انچ عرض میں بتلایا جاتا ہے، دہلی میں زینت تخت طاؤس تھا۔ اس کے بعد وہ نادر شاہ کے ہاتھ میں آیا جس کے انتقال کے بعد احمد شاہ درانی نے نادر کے خیمہ کی لوٹ کے وقت اس پر قبضہ کر لیا اور پھر شاہ شجاع نے اپنے باپ سے ورثہ میں اس کو پایا۔

مقرر ہوگیا[1]

رنجیت سنگھ کی ان کامیابیوں اور مسلمانوں کی بے دست وپائی نے حالات کا نقشہ بالکل بدل دیا۔ سکھ عروج حاصل کرنے لگے اور مسلم آبادی کے علاقے ان کی تحویل میں آنے لگے۔

۱۸۱۸ء کے آغاز میں یہ کارنمایاں ہوا کہ صوبہ ملتان اور اس کے اختتام میں پشاور کی فتح حاصل ہوئی ۱۸۱۹ء میں مہاراج نے کشمیر کے خلاف فوج کشی کرنے کی تیاری کی ، اپریل میں سکھوں کی فوج سرحد پر بڑھ کر حملہ آور ہوئی اور ۵ جولائی ۱۸۱۹ء کو افواج کشمیر پر فتح پائی۔ اس کے بعد بغیر کسی اور مقابلہ کے اس صوبہ کی فتح کامل طور پر نصیب ہوئی۔

---

[1] شاہ شجاع کابل کا مستحق بادشاہ تھا اور اس کا مغرور وحریف دوست محمد خاں علاوہ غاصب ہونے کے شاہی خاندان سے کچھ تعلق نہ رکھتا تھا، وہ ان بیشمار طاقت ور بارک زئی افغانوں میں سے تھا جنہوں نے تیمور کی اولاد کو محروم الارث کر دیا تھا اور انہی میں سلطنت افغانیہ منقسم ہوگئی تھی آپس میں بہت سی مخالفت اور فساد کے بعد دوست محمد خاں اپنے خاندان ، اور افغانوں کے جتھا کا سردار بن گیا۔ اور ۱۸۲۳ء سے وہ کابل کا بادشاہ بن گیا۔

COCLRT AND CAMPOF RANJEET SINGH

باب ۹

یہ تھے مجاہد

اور آخر وہ مبارک دن آگیا، جب مجاہدوں کا بے سروسامان قافلہ خدا کے بھروسہ پر خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ہر طرح کے موانعات اور دشواریوں کے باوجود چل کھڑا ہوا۔

اصل مقصد ان مجاہدوں کا یہ تھا کہ سارے ہندوستان کو غیر اسلامی اور فرنگی استیلا سے نجات دلائیں، لیکن اس عالم اسباب میں کوئی کام بھی ایسا کام نہیں کہا جاتا، جو مصلحت اور حکمت سے خالی ہو، ہندوستان میں رہ کر پنجاب، سرحد اور کشمیر کے جہاد کی تیاریاں کی جاسکتی تھیں، روپیہ فراہم کیا جاسکتا تھا، مجاہدین کو تربیت دی جاسکتی تھی، سازوسامان جنگ فراہم کیا جاسکتا تھا، اور دشوار گذار راستہ سے سہی لیکن دشمن پر حملہ کیا جاسکتا تھا، پھر ہندوستان میں برائے نام سہی۔ لیکن انگریزوں نے شعائر اسلامی پر وہ پابندیاں نہیں عائد کی تھیں، جو اپنے مقبوضہ اور محروسہ علاقہ میں سکھوں نے عائد کر رکھی تھیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ گو انگریز غاصب، بددیانت اور خود غرض تھے، لیکن نہ سکھوں جیسے کم از کم انگریزوں نے اس وقت تک بے پناہ مسلمانوں پر، حتیٰ کہ عورتوں اور بچوں پر مظالم کا وہ وحشت ناک اور لرزہ خیز سلسلہ شروع نہیں کیا تھا، جو سکھوں نے اپنے علاقہ میں شروع کر رکھا تھا۔

سکھوں کی منظم غارت گری کا آغاز، بندہ بیراگی سے ہوا، یہ شخص لوپچھ کا رہنے والا تھا۔ بیراگی بن کر پھرتا پھرتا سکھوں کے دسویں اور آخری گرو گوبند سنگھ سے وابستہ ہوگیا، گرو جی ۱۷۰۸ء میں ناندیڑ (دکن) میں فوت ہوئے تو بندہ بیراگی ایک گروہ کو لے کر شمالی ہند میں

آگیا شاہ عالم اس وقت راجپوتوں کی سرکوبی کر رہا تھا بیراگی نے سرہند پر چڑھائی کردی سرہند کا حاکم مقابلہ کے لئے نکلا، اتفاق سے ایک تیر اس کے حلق میں لگا وہ مارا گیا فوج پلٹ گئی بیراگی نے شہر کے ساتھ جو سلوک کیا وہ لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتا، قتل عام شروع ہو گیا یہاں تک کہ بچے بوڑھے اور عورتیں بھی نہ چھوڑی گئیں اور شہر کو آگ لگادی [1] ____"

پھر معاملہ صرف سرہند ہی تک محدود نہ رہا جیسے جیسے سکھوں کے قدم جمتے گئے مسلمان کمزور ہوتے گئے وہ طاقت حاصل کرتے گئے ان کے مظالم میں زیادہ سختی زیادہ درندگی، زیادہ وحشت اور کہیں زندہ ننگ انسانیت رنگ پیدا ہونے لگا، مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ ہو گیا، مسلمانوں کے لئے، مسلمان رہنا مشکل ہو گیا، ان کے لئے صرف دو راستے رہ گئے یا سکھ بن جائیں یا چماروں اور بھنگیوں کی سی زندگی بسر کریں۔

سکھوں کی اس درندگی اور بربریت سے مسلمان لرز اٹھے، ان سفاکیوں کی جو تفصیل مسلمان مظلوموں نے بیان کی ہے، اسے چھوڑیئے، خود سکھوں کے دوستوں نے جو کچھ اعتراف کیا ہے اسے پیش نظر رکھا جائے تو بھی مسلمانوں کی بے بسی اور سکھوں کی بہیمیت کی ایک رونگٹے کھڑے کر دینے والی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔

— نہایت درجہ وحشیانہ، بربریت جن تعدیوں کی مرتکب ہو سکتی تھی۔ اور انتقام کی بھڑکتی ہوئی آگ، جن بے دردیوں کی جانب رہنمائی کر سکتی تھی وہ سب اسی صوبے پنجاب کے ان تمام بدنصیب باشندوں پر پوری شدت سے نازل ہوئیں، جہاں جہاں ان سکھوں کے قدم پہنچے صرف ان لوگوں کو زندہ چھوڑ دیا گیا۔ جنہوں نے سکھ دھرم قبول کرلیا اور سکھوں کی سی وضع قطع کے پابند ہو گئے سرہند کی داستان ظلم ٹبالے میں بھی دہرائی

---

[1] سیرت سید احمد شہید (غلام رسول مہر) صـ ۱۳۱

گئی، بٹالے سے بیراگی کے لشکریوں نے لاہور کا رخ کیا، اگرچہ وہ لاہور کو فتح نہ کر سکے لیکن شالامار باغ تک ہر خطہ کو برباد کر ڈالا، پھر فرخ سیر نے بادشاہ بنتے ہی بیراگی کی گوشمالی پر خاص توجہ مبذول کی اس غرض کے لئے عبدالصمد خاں دلیر جنگ کو پنجاب کا گورنر بنایا، جو تورانی امیروں میں بڑا قابل اور دلیر تھا، دلیر جنگ نے تھوڑے ہی دنوں میں بیراگی کو سات آٹھ سو ساتھیوں سمیت گرفتار کر لیا۔ یہ قیدی پہلے لاہور لائے گئے پھر انہیں دہلی بھیج دیا گیا عام لوگ بیراگی کے ظلم و ستم سے اس درجہ غیظ و غضب میں آئے ہوئے تھے کہ جہاں سے ان قیدیوں کے گذرنے کی خبر پہنچتی مرد، عورتیں اور بچے سنگ و خشت لے کر راستوں پر آ بیٹھتے، دہلی پہنچنے کے بعد یہ سب کیفر کردار کو پہنچے، پھر احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۶۲ء میں سکھوں کو خوفناک سزا دی سکھ اس تادیب کو گھلوگھارا کے نام سے یاد کرتے ہیں یعنی نادیدہ آفت لیکن فتنوں کی آگ ایک مرتبہ سلگی تو پھر نہ بجھی تھوڑی دیر کے بعد سکھوں کے غارت گر جتھے جنہیں مسلیں کہتے تھے پنجاب میں جگہ جگہ قدم جما کر بیٹھ گئے، وہ عوام کو بھی لوٹتے اور آپس میں بھی لڑتے ان میں سے تین مسلوں کے سردار لاہور پر قابض ہو گئے شہر اور اس کے حوالی کو تین میں بانٹ لیا۔ جنوبی سمت میں نیاز بیگ تک سوبھا سنگھ کی حکومت تھی مشرقی سمت میں کابلی مل کی حویلی تک کا علاقہ گوجر سنگھ کے ماتحت تھا جس کا نام اب تک قلعہ گوجر سنگھ کی شکل میں تازہ ہے باقی سارا شہر جس میں قلعہ اور شاہی مسجد وغیرہ شامل تھی لہنا سنگھ کی تحویل میں آگیا، یہی تین سکھ تھے جنہوں نے شالامار میں سنگ یشب کا قیمتی سائبان اٹھوایا اور صرف ۲۴ چوبیس ہزار میں سنگ تراشوں کے ہاتھ فروخت کیا۔

رنجیت سنگھ نے احمد شاہ ابدالی کے پوتے زمان شاہ سے خوشنودی کا پروانہ لیا، ۱۷۹۹ء میں نواں کوٹ کے چودھری محکم دین کی مدد سے لاہور پر قابض ہو گیا، ۱۸۰۹ء میں انگریزوں سے معاہدہ کیا اور دریائے ستلج، رنجیت سنگھ اور انگریزوں کے

درمیان پکّی دیوار بن گیا، پھر شمال مغرب (صوبہ سرحد) میں پیشقدمی کی، رنجیت سنگھ ایک ایک کرکے سب کو کھا گیا، کشمیر اور اٹک سے آگے بڑھ کر پیشقدمی شروع کی، تو یار محمد خاں نے اطاعت قبول کر لی اور خراج دینے لگا، اور صوبہ سرحد کو سکھوں نے پامال کر ڈالا۔

بارک زئی سردار سکھوں کے فرماں بردار بن گئے، خوانین کی حالت عجیب تھی، وہ سکھوں کی اطاعت پسند نہ کرتے تھے۔ لیکن مقابلہ کی ہمت نہ تھی، اور کہیں سے امداد مل نہیں سکتی تھی، سکھ عام طور پر گھوڑے اور باز خراج میں وصول کرتے تھے، جو خراج گزار تھے، وہ اطمینان سے اپنے علاقوں میں بیٹھے رہتے، سکھ فوج آتی تو اس کے لئے اس کا انتظام کر دیتے جو خراج پر راضی نہ تھے وہ یورش کے وقت اپنی جگہیں چھوڑ کر مال بچوں سمیت پہاڑی علاقوں میں چلے جاتے، سکھ ان کے دیہات کو آگ لگا دیتے، سکھ فوجیں کھیتی باڑی کا خیال نہ کرتیں، ان کا توپ خانہ اور رسالہ کھڑی فصلوں سے بے تکلف گزرتا[۱] غرض، لاہور اس درجہ تباہ ہو چکا تھا کہ بہ مقابلۂ سابق اس کی آبادی دسواں حصہ رہ گئی تھی[۲] پشاور برباد ہو چکا تھا، اس کے عالی شان باغات ویران ہو چکے تھے[۳] کشمیر میں رنجیت سنگھ کی حکومت اس درجہ کی تھی کہ کشمیریوں سے سب کچھ بے دردی سے چھین لیا گیا[۴] سکھوں کے سارے مقبوضہ علاقہ میں یعنی، پنجاب سرحد اور کشمیر میں مسلمان مجبور ہیں، کہ اپنے مذہبی فرائض چھپ کر ادا کریں[۵] ہزارہ اور پشاور میں حکومت صرف دہشت انگیزی پر مبنی تھی[۶] دریائے اباسین سے لے کر وادیٔ لونڈ خوڑ تک شاید ہی کوئی گاؤں ایسا ہوا جسے سکھوں نے لوٹا یا جلایا نہ ہو[۷] رنجیت سنگھ نے کئی فرنگیوں کو ملازم رکھ کر زبردست دستے تیار کئے تھے، ان فرنگیوں میں ونتورا اور ایلارڈ خاص طور پر قابل ذکر ہیں[۸]

---

[۱] COURT AND CAMP OF RANJEET SINGH

[۲] ملاحظہ ہو کرافٹ، [۳] حالات قیام کشمیر [۴] [۵] پشاور گزیٹیر [۶] سیرت غلام رسول مہر صفحہ ۲۲۸

ان سکھوں کے ہاتھوں مسلمان عورتوں کی آبرو، مسلمان مردوں کی جان مسلمان دولت مندوں کی دولت، مسلمان سرداروں کی عزت، مسلمان عوام کی حمیت ایمانی، غرض کوئی چیز بھی محفوظ نہ تھی۔

حضرت سید احمد شہیدؒ کے علم میں یہ حالات تھے، انہوں نے مولانا اسمٰعیلؒ کو تبلیغ جہاد پر مامور کیا، اور جب سرفروشانِ اسلام کا ایک مختصر سا قافلہ، رضائے الٰہی کے لئے سر کٹانے کو تیار ہوگیا، تو یہ لوگ ایک بہت بڑی اور درندہ صفت اور بدخو حکومت سے جہاد کرنے نکل کھڑے ہوئے۔

٭ ——— یہ مجاہدین نہ کوئی تنخواہ لیتے تھے نہ کوئی معاوضہ، ایک، جنگ میں جو مال غنیمت ملا۔ اس کا اندازہ ۲۵ ہزار روپیہ کیا گیا، سید صاحب نے پانچ ہزار بیت المال میں رکھا باقی تقسیم کرنے کا حکم دے دیا مجاہدین میں سے اکثر نے اپنے پورے حصے لوٹا دیئے بعض نے صرف وہ چیزیں رکھ لیں، جن کی انہیں فوری ضرورت تھی، اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستان کے آسمان نے ایسا کوئی لشکر نہ دیکھا تھا جو علم و فضل زہد و تقویٰ حب و حمیت اسلام، شجاعت و جوانمردی ایثار و فداکاری، اور بے غرضی و بے نفسی میں سید صاحب کے لشکر کا نمونہ ہوتا، اس لشکر میں قرآن کے حافظ مفسر، محدث، فقیہ صوفیہ اکرام، غرض ہر مسلک و مشرب کے اصحاب شریک تھے جنہیں اپنے حلقوں میں عزت کے بعد مراتب حاصل تھے، ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنہوں نے بچپن ہی سے امارت و ریاست کی آغوش میں تربیت پائی تھی لہٰذا جسمانی تکلیف کا تصور بھی دماغ میں قائم نہ کر سکتے تھے لیکن سید صاحب کی دعوت و تربیت نے ایسا جذبہ صادق و راسخ

٭ GOVRT NDCAMP OF RANJEET SINGH

باب ۱۰

رنجیت سنگھ

کرتار سنگھ رنجیت سنگھ کا بڑا محبوب اور معتمد سردار تھا، یہ ایک معمولی سپاہی تھا لیکن اپنے من چلے پن، بہادری، شجاعت، سفاکی اور درندگی کے اس نے ایسے شاندار نمونے رنجیت سنگھ کے سامنے پیش کئے کہ وہ اس کا کلمہ پڑھنے لگا۔ حاضر و غائب اس کا دم بھرنے لگا، اور راز کی مہموں پر اس کو بھیجنے لگا،

شاہجہان کے بنائے ہوئے قلعہ کے شیش محل میں رنجیت سنگھ بیٹھا ہوا تھا رنجیت سنگھ اگرچہ بوڑھا ہو چکا تھا، لیکن بلا کا عیاش تھا، ہر وقت شراب کے نشہ میں مست اور کم سن مہوشوں میں بدمست رہتا تھا، کشمیر، سرحد اور پنجاب کی خوبصورت لڑکیوں کا گروہ ہر وقت اسے جلو میں لئے رہتا، یہ لڑکیاں یا خریدی گئی تھیں، یا اغوا کی گئی تھیں، انہیں رقص و سرود اور عشوہ غمزہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اور رنجیت سنگھ ان کے درمیان بیٹھ کر نہ صرف اپنے بڑھاپے کو بلکہ دنیا و مافیہا کو فراموش کر دیتا تھا، ان میں فن کار طوائفیں بھی تھیں اور شریف خاندان کی لڑکیاں بھی، لیکن رنجیت سنگھ کے محل میں یہ سب فاحشہ بن جانے پر مجبور ہو جایا کرتی تھیں [1]

شراب کا دور چلا، اور رنجیت سنگھ نے خوب پی، لیکن سرور نہ پیدا ہوا نغمہ کی محفل مرتب ہوئی اور مدھ بھرے گیتوں سے فضا گونج گئی، لیکن رنجیت سنگھ کے ہونٹوں پر ابھی مسکراہٹ نمودار نہ ہوئی، رقص کا سلسلہ شروع ہوا، اور زمین و آسمان تک رقص کرتے دکھائی دینے

---

[1] COURT ANDCAMP OF RANJEET SINGH

لگے ، لیکن رنجیت سنگھ کی آنکھوں میں ہوس کا شعلہ چمکتا ہوا نظر نہ آیا آج نہ جانے کیوں اس کی طبیعت بے کیف تھی ، کسی چیز میں اسے لطف نہیں آرہا تھا ، نہ شراب میں نہ عورت میں حالانکہ یہی دونوں چیزیں اسے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز و محبوب تھیں۔

رنجیت سنگھ کی یہ بے کیفی دیکھ کر ایک الہڑ اور خوب رو سیمیں بدن اور پری پیکر نازنین مسکراتی ہوئی جام شراب لیکر اس کی طرف بڑھی ، یہ کشمیر کی رہنے والی تھی اس کا نام ریشماں تھا اور اسے رنجیت سنگھ بہت زیادہ عزیز و محبوب رکھتا تھا ، اس کے ماتھے کی شکن کئی دفعہ ایسا ہوا کہ اوراق حکومت کی شکن بن گئی ، ریشماں نے جام شراب پیش کرتے ہوئے اپنے بوڑھے لیکن من چلے آقا سے عرض کیا۔

"آج عالیجاہ کی طبیعت کچھ مکدر نظر آتی ہے ، یہ جام شراب ریشماں بھر کر لائی ہے اس کے ہاتھ سے پیجئے۔ دیکھوں پھر بھی خمار آتا ہے یا نہیں ؟"

یہ کہہ کر وہ مسکرائی ، ایسا معلوم ہوا بجلی چمک گئی ،

رنجیت سنگھ نے بے التفاتی کے ساتھ جام شراب پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔

"نہیں ریشماں اس وقت ہم شراب نہیں پیئں گے ؟"

وہ ایک ادا کے ساتھ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی : ۔

"کیا ریشماں کے ہاتھ سے بھی نہیں ؟"

رنجیت سنگھ نے ایک کرب کے عالم میں کہا ۔

"اس وقت نہیں ———!"

ریشماں کا منہ اتر گیا ، چہرہ فق ہو گیا ، گردن جھک گئی۔

آج اسے بہت بڑی شکست ہوئی تھی ، آج اس کے پندار حسن کو ٹھیس لگی تھی ، آج اس کا فخر چھن گیا تھا آج وہ اپنی ہم سنوں اور سہیلیوں یعنی حریفوں کے سامنے مات کھا گئی تھی ، اس کی اس ناکامی پر دوسری طرحدار اور عشوہ طراز لڑکیاں کتنی خوش اور مسرور نظر آرہی

بھتیں، ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے انہیں دولت کونین مل گئی۔

ریشماں نے آنکھوں آنکھوں میں یہ منظر دیکھا اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے ———— شراب آنکھوں سے ٹپکنے لگی!

ریشماں کا یہ حال دیکھ کر رنجیت سنگھ بیتاب ہوگیا۔ اس نے دوسری لڑکیوں سے کہا۔

"ہم خلوت چاہتے ہیں!"

اور جب وہ چلی گئیں تو اس نے ریشماں کو اپنے پاس بٹھالیا اور محبت بھرے لہجہ میں کہا۔

"تم نے یہ کیوں سمجھ لیا کہ ہم تم سے خفا ہیں ————؟"

وہ آنسو پونچھتی ہوئی بولی،

آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ ریشماں کا ہاتھ اس کے آقا نے جھٹک دیا ہو!"

رنجیت سنگھ نے جواب دیا۔

"اور یہ قیامت تک ہوگا بھی نہیں! ———— بہ ظاہر ریشماں مغنیہ ہے رقاصہ ہے، دربار کی ایک پری پیکر نازنین ہے ارنجیت سنگھ کی ساقی ہے، لیکن درحقیقت وہ رنجیت سنگھ کے دل پر راج کرتی ہے۔!"

ریشماں نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں اور اس کی وقعت یہ ہے کہ وہ خود اپنے ہاتھ سے جام شراب بھرتی ہے، اور وہ ٹھکرا دیا جاتا ہے!"

رنجیت سنگھ نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا۔

غلط ———— ریشماں کا دیا ہوا جام ہونٹوں سے نہیں آنکھوں سے پیا جاتا ہے اسے ٹھکرایا نہیں جا سکتا

ریشماں نے اور زیادہ سراپا دلبری بن کر کہا۔

"پھر ایسی کیا ہوا تھا؟"

رنجیت سنگھ:۔ وہ مجبوری کی بات تھی!

ریشماں:۔ ڈاکٹروں اور حکیموں نے منع کیا تب تو آپ نے شراب چھوڑی نہیں،

رنجیت سنگھ:۔ ہاں ـــــــ اور جب تک تم ساقی ہو، چھوڑی بھی نہیں جا سکتی!

ریشماں:۔ اچھا شراب کو چھوڑیئے یہ بتایئے آج آپ افسردہ سے کیوں نظر آرہے ہیں۔

رنجیت سنگھ:۔ کچھ امور مملکت ہیں، کچھ راج پاٹ کی باتیں، یہی وجہ ہے کہ اس وقت طبیعت مکدر ہے۔

ریشماں:۔ کیا راج میں کوئی بات ایسی بھی ہو سکتی ہے، جو ہمارے بادشاہ کو پریشان کر دیے؟ اس کی تلوار سے ایک دنیا کانپتی ہے انگریز تک تو اس سے ڈرتے ہیں!

رنجیت سنگھ:۔ (مسکراتے ہوئے) ہاں یہ بات تو ہے لیکن اس کے علاوہ بھی کچھ پریشان کن باتیں ہو سکتی ہیں۔

ریشماں:۔ کیا کسی باغی نے سر اٹھایا ہے؟

رنجیت سنگھ:۔ (تلوار کی طرف اشارہ کر کے) جب تک رنجیت سنگھ کے ہاتھ میں تلوار ہے کسی باغی کی گردن صحیح سلامت نہیں رہ سکتی۔

ریشماں:۔ پھر کیا بات ہے؟"

رنجیت سنگھ:۔ ہر بات بتائی نہیں جاتی ـــــــــــــــ تم اپنا جام شراب مجھے پلاؤ اور جاؤ اطمینان سے باتیں رات کو ہوں گی!"

ریشماں خوش ہو گئی، جیسے اسے کوئی بہت بڑا انعام مل گیا ہو، وہ سانپ کی طرح لہراتی اور بل کھاتی، مسکراتی اور اپنی عشوہ طرازیوں کا جلوہ دکھاتی اٹھی، اور جلدی سے دہی جام شراب اٹھا لائی۔ ـــــــ!

رنجیت سنگھ نے منہ سے لگایا، اور پانی کی طرح ایک سانس میں پی کر جام اسے

واپس کرتے ہوئے کہا،

"تمہاری خوشی ہوگئی" اب تم جا سکتی ہو!"

ریشماں نے حکم کی تعمیل کی، اور واپس چلی گئی!

ریشماں کے جانے کے بعد کچھ دیر تک رنجیت سنگھ کچھ سوچتا رہا، پھر اس نے تالی بجائی

فوراً ایک خادم حاضر ہوا۔

رنجیت سنگھ نے اس سے کہا،

"کرتار سنگھ کو بلالاؤ ——— ابھی اسی وقت فوراً !"

خادم سر جھکا کر تعمیل ارشاد کے لئے چلا گیا اور رنجیت سنگھ اس کے انتظار میں ٹہلنے لگا وہ خاموش تھا لیکن اس کے چہرے سے معلوم ہو رہا تھا کہ اس وقت بہت برہم ہے بے انتہا فکر مند ہے، کوئی بہت بڑا معاملہ ہے، جس نے اس کے دل و دماغ کو متاثر کر رکھا ہے، وہ اس طرح ٹہل رہا تھا، جیسے ایک غضب ناک شیر اپنے کٹہرے میں ٹہلتا ہے ——— بے ضرر لیکن خطرناک، خوفناک!

باب ۱۱

کرتار سنگھ

حکم کی دیر تھی کہ کرتار سنگھ آ پہنچا، یہ بڑا گرانڈیل، تنومند اور خوبصورت نوجوان تھا، بڑے بڑے معرکے سر کر چکا تھا، رنجیت سنگھ اس پر بہت بھروسہ کرتا تھا، یہ اس کا معتمد بھی تھا اور راز دار بھی، لوگ رنجیت سنگھ سے اتنے خائف نہیں تھے، جتنا کرتار سنگھ سے ڈرتے رہتے تھے اور مسلمانوں سے تو اسے خواہ مخواہ بیر تھا، مسلمان پر نظر پڑی اور اس کی تیوری چڑھی، اس کے حضور میں پہنچنے کے بعد کوئی مسلمان سزا سے نہیں بچ سکتا تھا، مسجدوں کو منہدم کرنا، مسلمانوں کو ذلیل کرنا، اذان کے نام سے چڑنا اور طرح طرح کی پابندیاں عائد کرنا اس کا بہترین مشغلہ تھا۔

یہ رنجیت سنگھ کے حضور میں حاضر ہوا، اس نے تپاک اور سرگرمی کے ساتھ اپنے اس سردار کا استقبال کیا، اس وقت کمرہ میں ان دونوں کے سوا کوئی نہ تھا، رنجیت سنگھ نے مسند پر بیٹھتے ہوئے کرتار سنگھ کو بھی شفقت کے ساتھ اپنے قریب بٹھا لیا، کرتار سنگھ نے ادب و احترام کی کیفیت اپنے اوپر طاری کرتے ہوئے کہا۔

"میرے آقا، غلام کو آپ نے کیوں یاد فرمایا ہے؟

رنجیت سنگھ نے داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"تم میرے غلام نہیں، عزیز ہو، محرم راز ہو، معتمد اور مقرب ہو، تم پر میں اتنا ہی اعتماد کرتا ہوں، جتنا اپنے اُوپر، اور تم جانتے ہو، اور تم [illegible] ہو، آدمی جتنا اپنے اُوپر اعتماد کرتا ہے کسی پر نہیں کرتا۔

کرتار سنگھ:۔ یہ ذرہ نوازی ہے آقائے ولی نعمت کی،

رنجیت سنگھ :۔ ایک بہت اہم اور ضروری معاملہ پر صلاح و مشورہ کے لئے ہم نے تمہیں طلب کیا ہے۔

کرتار سنگھ : ارشاد ــــــــــــ!

رنجیت سنگھ :۔ ہم نے سنا ہے، بلکہ بڑے معتبر ذریعہ سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان سے مسلمانوں کا ایک لشکر افغانستان کے راستہ سے سرحد میں وارد ہو چکا ہے۔

کرتار سنگھ :۔ آپ کی اطلاع بالکل درست ہے بلکہ مجھے تو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ افغانستانیوں کی ایک معقول تعداد بھی شوقِ جہاد میں ان کے ساتھ شریک ہو گئی ہے۔

رنجیت سنگھ :۔ ہاں ہمارے علم میں بھی یہ بات آچکی ہے۔

کرتار سنگھ :۔ لیکن اس اطلاع سے آپ فکرمند کیوں ہیں؟

بلبلے اٹھتے ہیں، لیکن وہ دریا کی تند و تیز موجوں کے ساتھ ختم ہو جاتے ہیں یہ بلبلے ہیں ہمارے سیلِ جہانگیر کے سامنے کیا ٹھہر سکیں گے؟

رنجیت سنگھ :۔ سچ کہتے ہو کرتار سنگھ ــــــــ ہم جنگ سے نہیں ڈرتے بلکہ اس کا خیر مقدم کرتے ہیں ــــــــ

کرتار سنگھ :۔ بے شک، ــــــــ کون ہے جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی تلوار کا لوہا نہ مانتا ہو، جو اس کی شجاعت اور بہادری کے سامنے سرِ بندگی نہ خم کرتا ہو ــــــــ

رنجیت سنگھ :۔ ہاں، لیکن ہم جہاد سے ضرور گھبراتے ہیں،

کرتار سنگھ :۔ یہ کیوں میرے آقائے نامدار؟

رنجیت سنگھ :۔ اس لئے کہ جنگ دوسری چیز ہے اور جہاد دوسری چیز۔

کرتار سنگھ :۔ لیکن غلام اپنے آقا کا مدعا نہ سمجھ سکا۔

رنجیت سنگھ :۔ جنگ ہوتی ہے دنیاوی مقاصد کے لئے، اور جہاد ہوتا ہے سرفروشی کے لئے، دنیا کی زندگی قربان کرنے اور آخرت کی زندگی حاصل کرنے کے لئے مسلمانوں

کو جنگ کے میدان میں بارہا شکستیں ملی ہیں، لیکن جہاد کے میدان میں وہ ایک مرتبہ بھی نہیں ہارے
ساز و سامان کی فراوانی، لاؤ لشکر کی کثرت، اور دولت و ثروت کی افراط کے باوجود
وہ ہارے، لیکن جہاد کے میدان میں بے سر و سامانی قلت تعداد اور فقر و فاقہ کے
باوجود اپنے سے کئی گنا لشکروں پر ہمیشہ غالب آئے، اور سچی بات بھی یہ ہے کہ جو
لوگ مرنے کا فیصلہ کر چکے ہوں، جو موت کو کھیل سمجھتے ہوں جو ہنس ہنس کر موت
کا استقبال کرتے ہوں ان سے مقابلہ کرنا آسان نہیں بہت دشوار ہے اور میں نے سنا
ہے۔ یہ لوگ جو ہم سے لڑنے کے لئے میدان میں اترے ہیں، اپنے آپ کو مجاہد کہتے ہیں

کرتار سنگھ:۔ بجا ارشاد ہوا، لیکن ہم نے پنجاب پر قبضہ کر لیا، ہم نے کشمیر چھین لیا ہم نے اٹک
سے لیکر پشاور تک کے علاقہ کو اپنا زیر نگیں کر لیا، کیا ان علاقوں کے باشندے زیادہ
تر مسلمان نہیں ہیں ——؟

رنجیت سنگھ:۔ ضرور ہیں، کیسے کہا جا سکتا ہے کہ نہیں ہیں ؟

کرتار سنگھ:۔ پھر انہوں نے ہماری اطاعت کیسے قبول کر لی ؟ انہوں نے کیوں ہم سے شکست کھائی

رنجیت سنگھ:۔ اس لئے کہ انہیں زندگی عزیز تھی، یہ زندہ رہنا چاہتے تھے۔

کرتار سنگھ:۔ ہم نے ان کی مسجدوں پر قبضہ کر لیا، ان کی جاگیریں ضبط کر لیں، ان کی دولت
چھین لی، ان کے مردوں کو ذلیل کیا، ان کی عورتوں کو بے حرمت کیا۔ ان کے بچوں
کو قتل کیا، ان کے بوڑھوں اور بیماروں تک کو معاف نہ کیا اذان تک پر پابندیاں
عائد کر دیں، اور انہوں نے سب کچھ برداشت کر لیا۔

رنجیت سنگھ:۔ ہاں ٹھیک کہتے ہو،

کرتار سنگھ:۔ کسی طرف سے صدائے احتجاج بلند نہیں ہوتی۔

رنجیت سنگھ:۔ درست، صحیح ۔

کرتار سنگھ:۔ کسی نے سر اٹھانے کی جرآت نہیں کی ۔

رنجیت سنگھ:۔ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

کرتار سنگھ:۔ حالانکہ اگر یہ متحد ہوجاتے تو ہمیں ناکوں چنے چبوا سکتے تھے۔ اس لئے کہ ان کی اکثریت تھی، وسائل و ذرائع ان کے قبضہ میں تھے، قوت و طاقت، ہمت دلیری میں بھی یہ کسی سے پیچھے نہیں ——!

رنجیت سنگھ:۔ درست ہے، سچ ہے میرے عزیز!

کرتار سنگھ:۔ تو جب یہ کچھ نہ کر سکے تو یہ مٹھی بھر ہندوستانی مجاہد، جن کے پاس نہ رسد کا بندوبست ہے، نہ روپیہ کا انتظام ہے، نہ روپیہ ہے، نہ وسائل و ذرائع یہ ہمارا کیا کریں گے؟ ان کے سر پر موت کھیل رہی ہے، یہ مرنے آئے ہیں!

رنجیت سنگھ:۔ ہمیں تمہاری اس بات سے بھی اختلاف نہیں ہے۔ لیکن ان دونوں میں ایک فرق ہے اسے نہ بھولو۔

کرتار سنگھ:۔ وہ فرق میں نہیں جانتا کیا ہے

رنجیت سنگھ:۔ وہ فرق یہ ہے کہ ہمارے محکوم مسلمان موت کی لذّت سے محروم ہو چکے ہیں، اس لئے ہر طرح کی برتری کے باوجود یہ ہمارے غلام ہیں، اور یہ مجاہد موت سے کھیلتے ہوئے آئے ہیں، اس لئے ان سے لڑنا لوہے کے چنے چبانا ہیں!

کرتار سنگھ:۔ لیکن ہم یہ لوہے کے چنے چبالیں گے!

رنجیت سنگھ:۔ کس طرح؟ —— کیونکر؟ —— اس مسئلہ پر صلاح و مشورہ کے لئے تو میں نے تمہیں بلایا ہے؟

کرتار سنگھ:۔ کس طرح کیا؟ —— بس لڑیں گے اور کیا؟

رنجیت سنگھ:۔ نہیں —— صرف لڑ کر ہم ہرگز نہیں جیت سکتے پھر ہم ضرور ہاریں گے۔

کرتار سنگھ:۔ (حیرت سے) یہ ہار کا لفظ میں اس شخص سے سن رہا ہوں، جس نے نہایت ناسا عد حالات میں دشمنوں کا مقابلہ کیا! یہ شکست کا اندیشہ میں اس شخص کے

دل میں دیکھ رہا ہوں جس نے آج تک شکست نہیں قبول کی؟ یہ میرا آقا رنجیت سنگھ ہے، جس نے مسلمانوں کے اتنے بڑے علاقہ پر قبضہ کرلیا، ٹھاٹھ سے حکومت کی انگریزوں تک کو دوستی کا ہاتھ بڑھانے پر مجبور کر دیا۔

آج وہ مٹھی بھر سرپھرے، مفلس اور قلاش، تنگ دست اور بے نوا، مجاہدوں" سے ڈر رہا ہے۔

رنجیت سنگھ:۔ (مسکرا کر) میرے عزیز، یہ امور مملکت ہیں، یہاں، جذبات سے کام نہیں چلتا، انہیں حل کرنے کے لئے تدبّر اور فراست کی ضرورت ہے،

کرتار سنگھ:۔ تو بتایئے وہ فراست اور تدبّر کا راستہ کون سا ہے۔

رنجیت سنگھ:۔ (مسکرا کر) تم اسے جانتے ہو، ابھی ابھی تم نے اس کا ذکر کیا تھا۔ کرتار سنگھ نے کوئی جواب نہیں دیا، حیرت سے اپنے آقا کی طرف دیکھنے لگا کہ کہیں یہ سٹھیا تو نہیں گیا ہے۔

رنجیت سنگھ:۔ تم نے ابھی کہا تھا ہم کشمیر، سرحد اور پنجاب پر ہرگز قبضہ نہ کر سکتے، اگر یہ مسلمان متحد ہوتے کہا تھا؟

کرتار سنگھ:۔ جی ہاں غلام نے یہ عرض کیا تھا۔

رنجیت سنگھ:۔ تو تمہیں معلوم ہونا چاہیئے جہاد کی تحریک سب سے پہلا کام جو کرے گی وہ یہی ہوگا۔

کرتار سنگھ:۔ یعنی ہمارے محکوم اور ماتحت مسلمان متحد ہو جائیں گے؟

رنجیت سنگھ:۔ ہاں متحد ہو جائیں گے، اور پھر شجاعت، دلیری اور ساز و سامان جنگ کی فراوانی کے باوجود ہم اس طوفان کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔

کرتار سنگھ سر جھکا کر سوچنے لگا۔

کرتار سنگھ:۔ میرے آقا آپ درست فرماتے ہیں۔ واقعی اگر یہ سارے مسلمان متحد اور

متفق ہو گئے تو ہمارا ٹکنا مشکل ہوگا۔

رنجیت سنگھ:۔ کیا تم اس سے انکار کر سکتے ہو کہ ہمارے فتوحات میں ہماری کامیابی میں، ہماری خوش بختیوں میں بہت بڑا حصہ خود مسلمانوں کا ہے۔

کرتار سنگھ:۔ جی ــــــ کیا ارشاد ہوا؟

رنجیت سنگھ:۔ کیا لاہور پر ہم نے ایک مسلمان ہی کی مدد سے قبضہ نہیں کیا۔ جو اپنے مفاد کے لئے ہمارا دوست تھا، لیکن مسلمانوں کے نقطہ نظر سے مسلمانوں کا غدار تھا؟ کیا سرحد میں جو کامیابیاں ہم نے حاصل کیں وہ ہماری شجاعت وجوانمردی سے زیادہ خوانین سرحد کے باہمی اختلافات اور رقابتوں کا نتیجہ نہ تھیں؟ کیا کشمیر پر ہمارا قبضہ بھی زیادہ تر انہی اتفاقات کا نتیجہ نہیں تھا؟

کرتار سنگھ سوالیہ نظروں سے رنجیت سنگھ کی طرف دیکھنے لگا،

رنجیت سنگھ:۔ یہ کوئی مسلمانوں یا عیسائیوں کا مناظرہ نہیں ہے، ہم لڑ نہیں رہے ہیں، ایک بلند اور ارفع مقصد کے لئے آپس میں صلاح ومشورہ کر رہے ہیں، اگر میں نے کچھ غلط کہا ہے تو تم تردید کر سکتے ہو، میں اُسے مان لوں گا۔ اور اگر میں نے سچ کہا ہے تو تم مان لو تاکہ ہم اپنا خط وخال تیار کریں۔

کرتار سنگھ:۔ میرے آقا آپ نے جو کچھ فرمایا، بالکل صحیح اور درست ہے۔ ــــــــــ واقعی یہی بات ہے!

رنجیت سنگھ:۔ تو اب بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟

کرتار سنگھ:۔ جنگ بہر حال ناگزیر ہے، اس سے تو کسی طرح نہیں وہ تو لڑنا ہی پڑے گی۔

رنجیت سنگھ کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی، اس نے جوش اور جذبہ کے عالم میں کرتار سنگھ کو مخاطب کر کے کہا۔

"بے شک ــــــــــ ہم جنگ لڑیں گے۔

کرتار سنگھ :۔ اور آخر وقت تک جاری رکھیں گے ۔

رنجیت سنگھ :۔ ہمیں تم سے ، نہ صرف تم سے بلکہ ہر سکھ سے یہی امید ہے !

کرتار سنگھ :۔ اور میں اپنے آقا کو یقین دلاتا ہوں کہ اس کی یہ امید ضرور پوری ہوگی ہم مر جائیں گے ، مٹ جائیں گے ، تباہ و برباد ہو جائیں گے ، لیکن اپنے آقا کی آن پر حرف نہیں آنے دیں گے ، اپنے مالک کی حکومت کے قیام و استحکام کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ بھی بہا دیں گے ، ہاں ہم سب مٹ جائیں گے ۔ اس کے بعد جو کچھ ہونا ہو ، وہ ہو

رنجیت سنگھ :۔ نہیں یہ کچھ نہیں ہوگا ، رنجیت سنگھ کی حکومت بھی قائم رہے گی ، اور تم صحیح سلامت اور زندہ بھی رہو گے ، اور یہ مجاہد اور ان کے ساتھی دوست اور ہمدرد فنا کے گھاٹ اتریں گے !

کرتار سنگھ :۔ گرو کی کرپا سے ہم یہی توقع رکھتے ہیں ۔

رنجیت سنگھ :۔ اور میں تمہیں خوشخبری دیتا ہوں کہ یہ توقع ضرور پوری ہوگی ۔

کرتار سنگھ :۔ تو پھر ہمیں جنگ کی تیاری شروع کر دینی چاہئے ۔

رنجیت سنگھ :۔ وہ تو شروع ہو چکی ———— ہم نے ڈنتورا اور اپنے دوسرے فوجی افسروں کو حکم دے دیا ہے کہ وہ کیل کانٹے سے لیس رہیں اور دشمن جیسے ہی سر اٹھائے اس کا سر کچل دیں ۔

کرتار سنگھ :۔ بہت مناسب اور موزوں حکم ہے ۔

رنجیت سنگھ :۔ تمہیں ہم فوری میدان جنگ میں نہیں بھیجنا چاہتے ، دوسرا کام لینا چاہتے ہیں تم سے !

کرتار سنگھ :۔ ارشاد فرمائیے غلام آقا کی ہر خدمت بجا لانے کو بسر و چشم تیار ہے ۔ یہ زندگی ہے اسی لئے کہ اپنے آقا پر نثار ہو جائے ۔

رنجیت سنگھ :۔ تمہارا کام یہ ہے کہ تم مسلمانوں کو متفق و متحد نہ ہونے دو ۔ ان میں تفرقہ

پیدا کرو، ان کی قبائلی اور مقامی عصبیت کو ہوا دو تاکہ مجاہدوں کا جادو نہ چلے اور ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں۔

کرتار سنگھ:۔ (مسکرا کر) میں سمجھ گیا اور اپنے فرض کو جان پر کھیل کر انجام دوں گا۔

باب ۱۲

مُسلمان جاسُوس؟

رنجیت سنگھ نے بڑے پتہ کی بات کہی تھی، واقعی اگر مسلمان متحد اور متفق ہوتے تو پنجاب، سرحد اور کشمیر پر سکھ حکومت نہیں قائم ہو سکتی تھی۔ لیکن ان کی نااتفاقی باہمی رقابت قبائلی اور مقامی عصبیت نے انہیں خانہ جنگی اور باہمی سرپھٹول میں الجھا دیا اور سکھوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر، اور غدار مسلمانوں سے مدد حاصل کر کے مسلم اکثریت کے اس طویل و عریض علاقہ پر غاصبانہ قبضہ کر لیا، اور پھر ایسے ظلم توڑے، ایسی سفاکیوں کے مظاہرے کئے، کہ چشم فلک بھی یہ ہولناک منظر دیکھ کر حیران رہ گئی!

کرتار سنگھ بڑا جیالا اور دلاور شخص تھا، وہ مرد میدان بھی تھا۔ بڑے بڑے معرکوں میں بھی شریک ہوا، اور سرخ رو رہا، ساتھ ہی ساتھ وہ سازش کے فن میں بھی یکتا تھا، تفرقہ اندازی اس کا بہترین مشغلہ تھا اور اس کا یہ مشغلہ رنجیت سنگھ کو اتنا بھایا تھا کہ اس نے اسے اپنا محرم راز اور معتمد اس وجہ سے بنا لیا تھا دربار کے جن لوگوں سے رنجیت سنگھ خفا ہوتا تھا، یا محل کے جن لوگوں کو وہ اپنے راستہ سے ہٹانا چاہتا تھا، انہیں اعلانیہ سزا دینے کے بجائے وہ کرتار سنگھ کی خدمات حاصل کرتا تھا، اور خود بخود بغیر کسی بدمزگی کے کرتار سنگھ کی دراندازیوں اور سازشوں کی بدولت وہ مقصد آسانی کے ساتھ حاصل ہو جاتا۔

رنجیت سنگھ سے رخصت ہو کر کرتار سنگھ اپنے گھر کے ارادہ سے چلا، وہ آج بہت خوش تھا اور دل ہی دل میں ان کامیابیوں اور کامرانیوں کے منصوبے باندھ رہا تھا، لیکن مشکل سے وہ گھر کے دروازے پر پہنچا ہوگا، کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کا ہرکارہ دوڑتا ہوا اس کے پاس آیا اور

عرض گذار ہوا۔

"سرکار نے ابھی ابھی یاد فرمایا ہے!"

کرتار سنگھ کو حیرت تو بہت ہوئی لیکن تعمیل حکم کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا، وہ الٹے پاؤں واپس ہوا اور اپنے آقا کی خدمت میں پہنچ گیا، وہاں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ رنجیت سنگھ کے سامنے ایک آدمی مجرم کی صورت میں کھڑا ہوا تھا اس کی شکیں بندھی ہوئی ہیں اور دو مسلح سپاہی اس کے پاس کھڑے ہیں کہ ذرا بھی حرکت کرے تو ابھی اور یہیں اس کا سر اڑا دیں یہ کوئی نئی بات نہ تھی، رنجیت سنگھ کے دربار میں ہر روز اس طرح کے تماشے ہوا کرتے تھے لیکن کرتار سنگھ کو حیرت یہ تھی کہ اس جرم کے سلسلہ میں کیوں طلب کیا گیا ہوں، اس نے خوب غور سے اس شخص کی طرف دیکھا، مگر ذرا بھی نہ پہچان سکا۔

رنجیت سنگھ نے کرتار سنگھ سے پوچھا۔

"تم اسے جانتے ہو؟ ——————؟

کرتار سنگھ نے جواب دیا ——————!

"میں اسے بالکل نہیں جانتا!"

رنجیت سنگھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کوشش کرو اسے پہچاننے کی!"

کرتار سنگھ نے پھر اسے سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا اور کہا: "نہیں میرے آقا میں اسے بالکل نہیں پہچانتا —————— زیادہ سے زیادہ جو کچھ جانتا ہوں وہ یہ کہ کوئی سکھ نوجوان ہے جس نے کوئی سنگین جرم کیا ہے، اور اب اپنے کیفر کردار کو پہنچے گا!

رنجیت سنگھ نے ایک زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا:۔

ہاں —————— یہ ایک نوجوان ہے اس نے بڑا سنگین جرم کیا ہے اور بلاشبہ یہ اپنے کیفر کردار کو پہنچے گا، لیکن یہ سکھ نہیں مسلمان ہے——————!"

یہ سن کر کرتار سنگھ گھبرا گیا، اس نے پھر ایک نظر اس شخص کے سراپا پر ڈالی اور کہا ——! یہ مسلمان ہے ؟"

رنجیت سنگھ: ہاں —— اور دیکھو کس کامیابی کے ساتھ سکھ بنا ہے، کہ تم بھی دھوکا کھا گئے ؟

کرتار سنگھ:۔ بے شک —— میں اسے اب تک سکھ ہی سمجھ رہا تھا ؟

رنجیت سنگھ:۔ یہ مسلمان ہے اور مجاہدین کی طرف سے جاسوس بن کر ہمارے محل میں آیا ہے، اگر کسی بات پر بےساختہ اس کے منہ سے "انشاءاللہ" نہ نکل جاتا تو شاید یہ ہمیں قتل کرکے یہاں سے واپس جاتا، کیونکہ ڈیوڑھی خاص میں ملازم ہوگیا تھا۔ ورنہ ہمارے سربستہ راز تو بہرحال یہاں سے اڑائے جاتا۔

کرتار سنگھ:۔ واقعی غضب ہوگیا یہ تو!

رنجیت سنگھ:۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارا حریف ہم سے زیادہ شاطر ہے۔ ہم سے زیادہ زیرک ہے، ہم سے زیادہ تدبّر اور فراست کے ساتھ کام کرتا ہے۔

کرتار سنگھ:۔ یہ بات تو ماننا ہی پڑے گی،

رنجیت سنگھ:۔ غور تو کرو ذرا ہم تم تو صلاح و مشورہ ہی کرتے رہ گئے اور حریف کا نمائندہ بھیس بدل کر یہاں پہنچ بھی گیا —— کیوں ؟

کرتار سنگھ:۔ کیا عرض کروں واقعی بڑی جرات کی بات ہے، اس کا تو ہمیں وہم و گمان بھی نہیں تھا، ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے !

رنجیت سنگھ:۔ تباؤ، اب اس شخص کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے ؟ کیا رائے ہے تمہاری؟

کرتار سنگھ:۔ مجھے حکم دیجئے گردن اڑا دوں اس کی۔

رنجیت سنگھ:۔ (ہنستے ہوئے) بڑے نادان ہو، گردن اڑا دو گے ؟ اسے اپنے قابو میں لاؤ دشمن کے پوست کندہ اور سربستہ راز معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرو گے ؟

کرتار سنگھ:۔ بجا ارشاد ہوا اسے میرے حوالہ کر دیجئے۔

رنجیت سنگھ:۔ لیکن اس کی گرفتاری فال نیک ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ دشمن کی ترکیب پٹ پڑے گی، اور ہم کامیاب ہوں گے۔

کرتار سنگھ:۔ بے شک ایسا ہی ہوگا ————!

رنجیت سنگھ:۔ وہ تو کریں گے ہی لیکن سوچ لو ہر ہر قدم پر اگر ہمیں تمہاری رہنمائی کرنا پڑی تو تم کیا کرو گے؟

کرتار سنگھ نے شرمندہ ہو کر گردن جھکا لی، رنجیت سنگھ نے اس کی دل وہی کرتے ہوئے کہا۔

"ان واقعات وحالات سے سبق حاصل کرو!"

کرتار سنگھ:۔ ایسا ہی ہوگا میرے آقا!

رنجیت سنگھ:۔ اسے تم اپنے ساتھ لے جاؤ، اگر یہ آسانی سے رام ہو جائے اور سب کچھ سچ سچ بتا دے تو اُسے ذرا بھی اذیت نہ پہنچنے دو، سکھ دو، آرام پہنچاؤ۔ انعام اور جاگیر بخش دو، منصب اور عہدے کا سچا وعدہ کرو۔ لیکن اگر یہ راہ راست پر نہ آئے تو پھر تم جانتے ہو تمہیں کیا کرنا چاہیئے۔

کرتار سنگھ:۔ بیشک جانتا ہوں، اور جو کچھ مجھے کرنا چاہیئے اسے بڑی خوبی سے انجام دوں گا ————!

رنجیت سنگھ:۔ ہم جانتے ہیں، اسی لئے تم ہمارے اعتماد کے اور اعتبار کے حامل ہو بس اب جاؤ، اور اس شخص کو اپنے ساتھ لیتے جاؤ۔

کرتار سنگھ نے ادب سے تائید میں سر جھکایا اور خاموشی کے ساتھ ان مسلح آدمیوں کی معیت میں اس جاسوس مسلمان کو لے کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

راستہ میں کرتار سنگھ نے پھر حیرت اور استعجاب سے بھرپور ایک نظر اس

مسلمان جاسوس پر ڈالی اور مسکرانے لگا۔ اسے اس بات پر حیرت ہو رہی تھی، کہ اس شخص نے اتنا کامیاب بہروپ بھرا تھا کہ اس کے سکھ ہونے میں شبہ ہو ہی نہیں سکتا تھا، یہ سب کچھ معلوم کر چکنے کے باوجود کہ یہ سکھ نہیں مسلمان ہے، جب وہ اس پر ایک نظر ڈالتا تھا تو اس کے دل میں خیال آتا تھا کہیں مہاراجہ کو غلط فہمی نہ ہوئی ہو اور انہوں نے شبہ میں اس بے گناہ کو گرفتار کر لیا ہو، کیونکہ یہ مسلمان کسی طرح نہیں ہو سکتا، قطعاً سکھ ہے، یہ داڑھی یہ وضع قطع، یہ لباس یہ پگڑی، کسی چیز میں بھی تو اناڑی پن نظر نہیں آتا۔

اتنے میں گھر آگیا، دروازے پر کرتار سنگھ نے مسلح سپاہیوں کو رخصت کر دیا اور اپنے آدمیوں کی حراست میں اسے لیکر اندر داخل ہو گیا ——— !

باب ۱۳

حبیب خاں

یہ مسلمان جاسوس کرتار سنگھ کے گھر میں کیا پہنچا کہ ایک تماشا آگیا۔ سارا گھر کیا مرد، کیا عورتیں، کیا بچے، کیا لڑکے، کیا نوکر چاکر، کیا خادم اور ملازم، سب ہی یہ تماشہ دیکھنے ٹوٹ پڑے یہ آدمی نہیں تھا ایک ایسا عجیب اور نادر تماشہ تھا جس کی ندرت اور طرفگی نے سارے گھر کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلی تھی ملازم کے بارے میں اس گھر کے لوگ یہ تو جانتے تھے کہ وہ ہمارے محکوم ہیں۔ بندۂ فرمان ہیں، ہمارے حکم سے سرتابی نہیں کرسکتے، لیکن یہ بات تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ مسلمان برسرِ پیکار ہوسکتے ہیں، اور ان کے حوصلے اتنے بڑھ سکتے ہیں کہ اپنے جاسوس ہماری ٹوہ کے لئے ہمارے گھر میں بھیجنے لگیں، یہی وجہ تھی کہ سب لوگ حیرت واستعجاب اور اضطراب کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ اس انسان ——— جو نہ جانے انسان تھا بھی یا نہیں ——— دیکھ رہے تھے۔

جب گھر والوں کا شوق تماشہ کسی حد تک کم ہوا تو کرتار سنگھ جو اب تک اپنے خاص کمرہ میں اپنے بعض ساتھیوں سے کوئی بڑا اسرار گفتگو کر رہا تھا، برآمد ہوا، اس نے پہرے کے دونوں سپاہیوں کو دھکا دے کر پرے ہٹایا اور خون آشام نظروں سے اس مسلمان کو گھورا۔ پھر اس کے قریب جاکر ایک جھٹکا دے کر اس کی داڑھی کھینچ لی، داڑھی اس کے ہاتھ میں آگئی یہی حشر مونچھوں کا ہوا۔ پھر ایک دھول مار کر پگڑی نیچے گرادی اب سب کی آنکھوں کے سامنے ایک سکھ نوجوان نہیں ایک بے ریش و بروت، تنومند اور توانا خوش رو اور خوش اندام طرحدار اور بانکا نوجوان کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی کشش

تھی، اس کے انداز و اطوار میں غضب کا جادو تھا، اس کی سج دھج میں ایک مجرم کی طرح بے بس ہونے کے باوجود کچھ عجیب قسم کا وقار تھا، تلوار اس کے سر پر جھک رہی تھی، دشمن ہر چہار طرف سے گھیرے ہوئے تھے، کسی سے یاری اور غمگساری کی توقع نہیں تھی لیکن وہ نڈر اور بیباک نظر آرہا تھا، نہ خوف نہ دہشت، نہ ہراس، نہ اضطراب ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بھیڑوں کے مجمع میں شیر کھڑا مسکرا رہا ہے۔

کرتار سنگھ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر جل ہی تو گیا، اس نے ایک گھونسہ اس کے سینہ پر مارا اور بادل کی طرح گرجتے ہوئے للکار کر کہا۔

"تیرا نام کیا ہے۔؟"

نہایت اطمینان اور بے خوفی کے ساتھ اس نے جواب دیا۔

"میرا نام حبیب خاں ہے ———— !"

کرتار سنگھ تلملا گیا،

"او ہو تو آپ نیر سے پٹھان ہیں ؟"

حبیب خاں:۔ ہاں میں پٹھان ہوں اور مجھے اپنے پٹھان ہونے پر فخر ہے !"

کرتار سنگھ:۔ تو یہاں کب آیا ؟"

حبیب خاں:۔ ایک ہفتہ کی مدت گذری ———— !

کرتار سنگھ:۔ تیرے آنے کا مقصد کیا ہے ———— ؟

حبیب خاں:۔ وہ آپ کو مہاراجہ رنجیت سنگھ بتا چکے ہیں۔

کرتار سنگھ:۔ کیا واقعی تو جاسوس ہے ؟

حبیب خاں:۔ اگر آپ کو اب بھی شبہ ہے میرے جاسوس ہونے میں تو مجھے آپکی فراست قابل رحم نظر آتی ہے۔

کرتار سنگھ:۔ (برہمی کے عالم میں، خاموش

بے ادب، گستاخ،

جانتا نہیں تو کس سے مخاطب ہے؟ کس سے باتیں کر رہا ہے؟

جبیب خاں :۔ جانتا ہوں ایک بزدل آدمی میرا مخاطب ہے۔

کرتار سنگھ :۔ تو کرتار سنگھ کو بزدل کہتا ہے، جس کی تلوار کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے جس کی تلوار کا سارا پنجاب لوہا مانتا ہے، جس کی ہیبت شمشیر سے دشمنوں کا پتہ پانی ہو جاتا ہے؟

جبیب خاں :۔ یہ سب اپنے منہ میاں مٹھو بننے کی باتیں ہیں، اگر واقعی تم بہادر ہو تو آؤ دو دو ہاتھ ہو جائیں، تمہارے ہاتھ میں تو تلوار ہے، ایک مجھے بھی دو!"

کرتار سنگھ :۔ تو مجھ سے لڑے گا؟

جبیب خاں :۔ کیوں نہیں لڑوں گا، میں تو رستم سے بھی لڑ سکتا ہوں، تو تو صرف ایک معمولی سا آدمی ہے،

کرتار سنگھ :۔ (بہت زیادہ غضبناک ہو کر) شاید تیری شامت آئی ہے۔ شاید موت تیرے سر پر کھیل رہی ہے۔

جبیب خاں :۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ مسلمان کے نزدیک موت ایک کھیل ہے زندگی کا نیا روپ ہے، ہم جینے کے لئے مرتے ہیں، موت کا ہنستے ہوئے اور مسکراتے ہوئے استقبال کرتے ہیں، اپنے دل کی حسرت باقی نہ رکھ تلوار نکال اور مجھے شہادت کا شرف حاصل کرنے دے!

کرتار سنگھ جبیب خاں کی یہ باتیں سن کر سٹ پٹا گیا، آج تک کسی مسلمان سے دو بدو اس نے ایسی تند و تیز باتیں نہیں سنی تھیں، اس کا غصہ ہرن ہو گیا، اس پر ایک عجیب قسم کی اضمحلالی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنی کیفیت پر قابو پایا اور کہا۔

"تو اسے کیوں فراموش کر دیتا ہے کہ تو ہمارا محکوم ہے اور کسی محکوم کے لئے یہ زیبا نہیں کہ وہ اپنے آقا سے سخت کلامی کرے؟

جبیب خاں :۔ آقا ——— (ہنس کر) تو کس غلط فہمی میں مبتلا ہے، مسلمان خدا

کے سوا کسی کا محکوم نہیں ہوتا، کیا تجھے پٹھانوں کی تاریخ نہیں معلوم!

کرتار سنگھ:۔ ان کی تاریخ ہی کیا ہے، بزدلی کی حکایتوں اور غداری کی داستانوں کے سوا ــــ؟

حبیب خاں:۔ اگر تو نہیں جانتا تو میں بتاتا ہوں کہ پٹھان کبھی اور کسی حالت میں غلامی نہیں قبول کر سکتا، تم لوگ تو بہر حال غیر مسلم ہو، لیکن ہم نے تو عالمگیر جیسے زبردست مسلمان بادشاہ کی غلامی بھی نہیں قبول کی، جب تک تاریخ موجود ہے خوشحال خان خٹک کے مجاہدانہ کارنامے دنیا فراموش نہیں کر سکتی۔

کرتار سنگھ:۔ (طنز سے) اوہ تو آپ پٹھان بھی ہیں، اور مسلمان بھی گویا مے دو آتشہ!

حبیب خاں:۔ اتنی دیر میں پہلی مرتبہ تم نے ایک معقول بات کہی ہے،

کرتار سنگھ:۔ خیر یہ باتیں چھوڑ دو۔ یہ بتاؤ۔ یہاں آکر تم نے کیا کیا؟

حبیب خاں:۔ ایسا سوال نہ کیجئے جس کا کوئی جواب نہ ہو!

کرتار سنگھ:۔ کیوں؟ ــــــــ کیا تم یہاں خاموش بیٹھے رہے؟ ــــــــ تم نے کوئی کام نہیں کیا؟ ــــــ ضرور ہمارے خلاف سازشیں کی ہوں گی ہمارے خلاف پروگرام بنایا ہوگا، ہمارے بارے میں جملہ معلومات تم نے مسلمانوں کے لشکر میں پہنچائی ہوں گی۔

حبیب خاں:۔ ہاں ــــــــــ یہ سب کچھ میں نے کیا، میرے آنے کا مقصد بھی اس کے سوا کیا تھا؟

کرتار سنگھ:۔ تو بتاؤ کہ تم نے یہاں رہ کر کون کون سی معلومات حاصل کیں اور دشمن کو ان سے مطلع کیا ــــــ؟

حبیب خاں:۔ میں کہہ چکا ایسے سوالات کا جواب نہیں دوں گا۔

کرتار سنگھ:۔ دینا پڑے گا۔

حبیب خاں:۔ تو لے لیجئے،

کرتار سنگھ :۔ تم یوں نہ مانو گے۔

یہ کہہ کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر ایک آدمی سے جو سامنے کھڑا تھا، کہا "میرا کوڑا لاؤ!"

دم کی دم میں کوڑا لیکر کرتار سنگھ کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ اس نے اتمام حجت کے طور پر کہا،

یہ کوڑا تمہاری کھال اُدھیڑ دے گا، اب بھی موقع ہے کہ سچ سچ اپنی کارگزاریوں کا حال بتا دو!"

حبیب خاں :۔ ناممکن ——————

کرتار سنگھ :۔ تمہیں یاد ہوگا، ہمارے مہاراجہ نے اکرام و انعام کا وعدہ کیا تھا۔

حبیب خاں :۔ خوب یاد ہے۔

کرتار سنگھ :۔ تو میں ان وعدوں کی تجدید و توثیق کرتا ہوں، اگر تم سچ سچ سارا حال بتا دوگے اور مسلح لشکر کے بارے میں سچی سچی خبر دے دوگے تو تمہارے ساتھ وہ سلوک کیا کیا جائے گا، جس کے تم مستحق ہو!

حبیب خاں : یعنی ——؟

کرتار سنگھ :۔ یعنی یہ کہ تمہیں نوازا جائے گا، دولت ملے گی، روپیہ ملے گا۔ جاگیر پاؤگے عہدے اور منصب کی خواہش ہے تو اس سے بھی محروم نہیں رہوگے۔

حبیب خاں :۔ (مسکرا کر) شکریہ اس نوازش کا!

کرتار سنگھ :۔ شاید تم ہمارے وعدوں پر بھروسہ نہیں کرتے!

حبیب خاں :۔ آپ سے زیادہ میں اپنے اوپر بھروسہ کرتا ہوں ——!

کرتار سنگھ :۔ کیا مطلب؟ کیا کہنا چاہتے ہو تم؟

حبیب خاں :۔ مجھے اپنے اوپر اعتماد ہے، میں کسی دوسرے کو آزمانا نہیں چاہتا،

کرتار سنگھ:۔ کیا تم نہیں دیکھتے، ہمارے مہاراجہ کا سب سے زیادہ معتمد عزیز محبوب اور بااختیار وزیر ایک مسلمان فقیر عزیز الدین ہے۔

حبیب خاں:۔ ہاں جانتا ہوں، میں نے دیکھا ہے ان بزرگ کو!

کرتار سنگھ:۔ تم دوسرے فقیر عزیز الدین بن سکتے ہو،

حبیب خاں:۔ میں پہلے عزیز الدین کی فکر میں ہوں آپ دوسرے کا ذکر کر رہے ہیں عجیب ستم ظریفی ہے۔

کرتار سنگھ:۔ تم عزیز الدین کی فکر میں ہو؟

حبیب خاں:۔ ہاں بیشک،

کرتار سنگھ:۔ کیا کرنا چاہتے ہو ان کے ساتھ؟

حبیب خاں:۔ قتل۔

کرتار سنگھ:۔ (چونک کر) کیا کہا قتل؟ تم فقیر عزیز الدین کو قتل کرنے آئے تھے،

حبیب خاں:۔ میرے پیش نظر اور بھی بہت سے کام تھے، ان میں ایک یہ بھی تھا!

کرتار سنگھ:۔ لیکن تم اس مرد مسلمان کے درپے کیوں ہو؟

حبیب خاں:۔ اس لئے کہ وہ مرد مسلمان سے زیادہ غیر مسلموں کے کام آ رہا ہے۔

جو کام میں غیر کے ہوئیں صرف
افسوس وہ دل رہا اوا ئیں،

یہ کہہ کر حبیب خاں نے ایک قہقہہ لگایا،

کرتار سنگھ:۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے افسوس ہے تم کچھ نہ کر سکے اور اب بالکل کچھ نہ کر سکو گے!

حبیب خاں:۔ میں آپ کی اس ہمدردی کا شکریہ ادا کرتا ہوں!——— لیکن میرا کام ہر حالت میں جاری رہے گا، وہ بند نہیں ہو سکتا۔

کرتار سنگھ :- (بحد پریشان ہوکر) کیا اور بھی جاسوس آئے ہیں تمہارے ساتھ ؟

حبیب خاں :- نہیں

کرتار سنگھ :- تو آنے والے ہوں گے !

حبیب خاں :- میں نہیں جانتا ،

کرتار سنگھ :- پھر تمہارا کام کون جاری رکھے گا -

حبیب خاں :- وہ جس تک نہ تلوار پہنچ سکتی ہے ، نہ تیر ، نہ توپ ، نہ بندوق جو تمہاری گرفت میں نہیں آ سکتا ـــــــــــ !

کرتار سنگھ :- کون ہے وہ ؟

حبیب خاں :- خدا ـــــــــــ !

کرتار سنگھ :- تمہیں خدا نے بھیجا تھا ؟

حبیب خاں :- جناب !

کرتار سنگھ :- پھر تمہارے خدا نے تمہیں گرفتار کیوں کرا دیا ؟ ـــــــــــ کیا خدا بھی اپنے بندوں کے ساتھ مذاق کرتا ہے ؟

حبیب خاں :- خدا کے حضور میں گستاخی نہ کرو ، میرے دوست ، خدا وہ ہے جو کانوں کو حکومت بخش دیتا ہے ، تمہیں اور تم سے زیادہ رنجیت سنگھ کو اس کا شکر گزار ہونا چاہیئے

کرتار سنگھ :- (غصہ سے بے قابو ہوکر) اب میرا جام صبر چھلکتا جا رہا ہے -

حبیب خاں :- تو پھر انتظار کا ہے کا ہے ؟ ـــــــــــ میں مداہنت نہیں کر سکتا تلوار اٹھاؤ ، اور میرا کام تمام کر دو - بس تم یہی کر سکتے ہو ، سو وہ کر ڈالو !

کرتار سنگھ :- مجھے تمہاری جوانی پر ، شباب پر ، جوانمرگی پر ترس آتا ہے -

حبیب خاں :- اس لئے آپ چاہتے ہیں کہ میں اپنی جان بچا لوں ؟

کرتار سنگھ :- ہاں میرا مقصد و مدعا یہی ہے !

حبیب خاں :۔ اس طرح میری جان بچ جائے گی ۔
کرتار سنگھ :(خوش ہوکر) ہاں قطعاً میں وعدہ کرتا ہوں ، میں ذمہ لیتا ہوں قول مرداں جان دارد
میرا یہ قول ہر قیمت پر پورا ہوگا ۔
حبیب خاں :۔ پھر مجھے کوئی نہیں مار سکے گا ؟ کوئی میری جان نہیں لے سکے گا ؟
کرتار سنگھ :۔ کوئی نہیں ،
حبیب خاں :۔ کیا خدا بھی نہیں ؟
کرتار سنگھ :۔ (تلملاکر) کیا بکتے ہو ؟ خدائی کارخانہ میں کس کو دخل ہے ؟
حبیب خاں :۔ پھر آپ کا وعدہ کہاں گیا ؟ آپ کا ذمہ کیا ہوا ؟
کرتار سنگھ :۔ وعدہ ہم اپنے بارے میں کر رہے ہیں ، ذمہ ہم خود لے رہے ہیں ۔
حبیب خاں :۔ تو یہ وعدہ بے کار ہے ، یہ ذمہ بے نتیجہ ہے ۔
کرتار سنگھ :۔ اے بیوقوف شخص کیا بکتا ہے ؟
حبیب خاں :۔ میں غلط نہیں کہتا ، سچ کہتا ہوں ؟
کرتار سنگھ :۔ تیرا سچ جھوٹ سے بدتر ہے !
حبیب خاں :۔ میں آپ کی زبان نہیں پکڑ سکتا ، آپ جو چاہیں کہہ سکتے ہیں ۔
لیکن ایک سوال کا جواب دیجئے ۔
کرتار سنگھ :۔ (بے پروائی سے) پوچھو ،
حبیب خاں :۔ آپ کے ہاتھ سے بچ جانے کے بعد کیا کسی بیماری یا کسی حادثہ کے باعث
میں نہیں مر سکتا ؟
کرتار سنگھ :۔ کیوں نہیں ، موت ہزار بہانوں سے آسکتی ہے ۔
حبیب خاں :۔ تو جب موت اتنی زبردست ہے تو آپ سے زندگی لے کر کیا کروں گا ۔
کیوں نہ اس زندگی کو کسی بڑے اور اونچے مقصد پر قربان کر دوں ——— ؟

کرتار سنگھ :۔ اور وہ بڑا اور اونچا مقصد جاسوسی ہے !

حبیب خاں :۔ جسے آپ جاسوس کہتے ہیں، میں اسے خدمت ملی کہتا ہوں

کرتار سنگھ :۔ ہمارا کام سمجھانا تھا ہم نے سمجھا دیا، اب اگر نہیں سمجھتا تو تو جانے تیرا کام،

حبیب خاں :۔ ہاں ٹھیک ہے، میں اقرار کرتا ہوں کہ آپ کی باتیں نہیں سمجھ سکا، اور اعلان کرتا ہوں کہ سمجھوں گا بھی نہیں ——— !

کرتار سنگھ :۔ ہمیں اس اعتراف اور اعلان کی ذرا پرواہ نہیں، ہمیں وہ ڈھنگ آتے ہیں، جن سے کام لے کر ہم تم سے دوسرا اعلان اور دوسرا اعتراف بھی کرا سکتے ہیں ——— اس کوڑے میں بڑی قوت ہے،

حبیب خاں :۔ یہ آپ کا خیال ہے،

کرتار سنگھ :۔ اب بہت جلد تم اس خیال کو عملی جامہ پہنے دیکھ لوگے ——— !

حبیب خاں :۔ میں آپ کا ہدف ہوں، آپ شوق سے مشقِ ستم کیجئے۔

کرتار سنگھ :۔ ہاں ابھی لو !

اور یہ کہہ کر اس نے بے تحاشا کوڑوں کی بارش حبیب خاں کے جسم پر شروع کر دی وہ بیدردی کے ساتھ کوڑے مار رہا تھا اور یہ کوڑے قید مقام سے آزاد تھے، پیٹھ پر، پیٹ پر، سینہ پر، منہ پر، ماتھے پر، سر پر، ہاتھ پر، پاؤں پر، کمر پر ہر جگہ ان کوڑوں کی بے پناہ بارش ہو رہی تھی ——— !

حبیب خاں کے بدن سے خون چھلکنے لگا، وہ لہولہان ہوگیا، لیکن نہ اس کے منہ سے آہ نکلی، نہ فریاد کی آواز بلند ہوئی، نہ اس نے واویلا کیا نہ التجا، نہ عرض، نہ معروض ایسا معلوم ہوتا تھا ایک چٹان ہے، جس پر کوئی دیوانہ بے پروائی اور دیوانگی کے عالم میں کوڑوں کی بارش کر رہا ہے ——— !

چٹان نہ منہ سے بول سکتی ہے، نہ سر سے کھیل سکتی ہے، نہ فریاد کر سکتی ہے، نہ شور وغوغا

نہ عرض والتجا سے کام لے سکتی ہے، نہ شیون اور الحا سے!

کرتار سنگھ کوڑے مارتا مارتا تھک گیا، بے حال ہو گیا، اس نے کوڑا ایک طرف پھینک دیا، اور پاس ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا!

حبیب خاں اب بھی خاموش تھا!

کرتار سنگھ نے تھکی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور کہا، کیا اب بھی تم اپنی روش پر قائم ہو؟ کیا اب بھی تم اپنی ضد پر اڑے رہو گے ——— ؟

حبیب خاں نے کوئی جواب نہیں دیا!

کرتار سنگھ :۔ حبیب خاں میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔

حبیب خاں :۔ ایک ہی جواب بار بار دہرانے سے کیا حاصل ——— !

کرتار سنگھ :۔ گویا، تم اپنی ضد پر اب تک قائم ہو!

حبیب خاں :۔ یہی سمجھیئے۔

کرتار سنگھ :۔ گویا تم چاہتے ہو، تم پر اور سختی کی جائے۔

حبیب خاں :۔ جو شخص جان دینے پر تلا ہو، اسے یہ سختیاں کیا ہراساں کر سکتی ہیں ——— ؟

تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر۔

کرتار سنگھ :۔ تم آدمی ہو یا جن ؟

حبیب خاں :۔ (مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے) آپ کو کیا نظر آتا ہوں!

کرتار سنگھ :۔ کوئی آدمی بھی اتنا سخت جان ہو سکتا ہے، یہ تو میں سوچ ہی نہیں سکتا۔ اس کوڑے نے بڑے بڑے رستموں کو بزدل بنا دیا ہے، اس کی مار کھا کر بڑے بڑے مجرم، ڈاکو، لٹیرے اپنی چوکڑی بھول گئے ہیں، ہم نے جو چاہا ہے ان سے کہلوا لیا ہے۔

حبیب خاں :۔ ہاں ——— لیکن میں نہ خونی ہوں، نہ قاتل، نہ ڈاکو ہوں، نہ لٹیرا،

کرتار سنگھ :۔ کیا تم ان سے بھی بڑے اور مضبوط آدمی ہو!

حبیب خاں :۔ انہیں بڑا آپ ہی مان سکتے ہیں ــــــــــــــــ قاتل بزدل ہوتا ہے لٹیرا اور ڈاکو بھی بزدل ہوتا ہے، یہ لوگ اپنی زندگی راحت و آرام سے بسر کرنے کے لئے دوسروں کی جان لیتے ہیں، دوسروں کی دولت چھینتے ہیں، دوسروں کو تکلیف پہنچاتے ہیں، ان کی یہ نفس پرستی انہیں بزدل بنا دیتی ہے۔

کرتار سنگھ :۔ اور تم کیا ہو؟

حبیب خاں :۔ ایک معمولی انسان۔

کرتار سنگھ :۔ لیکن ان لوگوں سے کیونکر بڑھ گئے؟

حبیب خاں :۔ ان کے سامنے کوئی مقصد نہیں ہوتا، میرے سامنے ایک مقصد بلند ہے، یہ اپنے نفس کے لئے قتل وغارت کرتے ہیں، میں خدا کے لئے خدا کے آخری دین کے لئے کفن سر سے باندھے گھر سے نکلا ہوں، یہ زندہ رہنے کے لئے سرگرم کار ہیں، میں موت کی تلاش میں بھٹک رہا ہوں، میرا اور ان کا مقابلہ کیا؟ یہ آپ کی سادہ لوحی ہے۔ جو آپ مجھے اور انہیں ایک صف میں رکھ رہے ہیں ــــــــــــ!

کرتار سنگھ :۔ واقعی آج ایک ایسے شخص سے پالا پڑا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟ (کچھ دیر خاموش رہ کر) میں نے ہر طرح کے لوگ دیکھے ہیں، ہر قسم کے لوگوں سے مجھے سابقہ پڑا ہے، لیکن تمہارا جیسا کوئی آدمی نظر سے نہیں گزرا تم نے میری قوت فیصلہ عاجز کر دی ہے

حبیب خاں :۔ میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ مسلمان ہو جائیے ــــــ!

ایسا معلوم ہوا جیسے کرتار سنگھ پر بم گر پڑا، وہ چونک پڑا، اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا کہ جو کچھ سن رہا ہے وہ واقعہ ہے، اس نے اپنے گمان کو یقین سے بدلنے کے لئے پوچھا "کیا کہا تم نے حبیب خاں؟

حبیب خاں :۔ میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ مسلمان ہو جائیے ــــــ!

کرتار سنگھ :۔ میں مسلمان ہو جاؤں؟ ــــــــ میں؟

حبیب خاں:۔ ہاں

کرتار سنگھ:۔ کیوں مسلمان بن جاؤں؟ اسلام مجھے کیا دے گا؟

حبیب خاں:۔ وہ نعمت، جس سے آپ محروم ہیں ——— اسلام قبول کر لینے کے بعد آپ کی روح طاہر ہو جائے گی، آپ کے خیالات بلند ہو جائیں گے، آپ کے کردار میں، سیرت اور شخصیت میں جلا پیدا ہو جائے گی۔ آپ بہت اچھے انسان بن جائیں گے ——— اس وقت آپ کو دوسروں کی جان لینے میں مزہ آتا ہے پھر آپ موت کے لذت شناس ہو جائیں گے، آپ میں مرنے مرٹنے، مٹ جانے کا ولولہ کسی اچھے، بلند اور برتر مقصد کے لئے پیدا ہو جاتے گا، اس وقت بھی آپ جان نثار ہیں، فداکار ہیں، لیکن ایک اپنے ہی جیسے فنا ہونے والے شخص رنجیت سنگھ کے نام سے بقا ہے، نہ آپ کو، آپ کسی فانی کے لئے نہیں باقی کے لئے، ایسے باقی کے لئے جس تک فنا کبھی نہیں پہنچ سکتی، سر بکف ہو کر جب میدان میں آئیں گے اور اگر گردن کٹائیں گے اس کے سرور اس کی لذت اور اس کی کیفیت کا اس وقت آپ اندازہ بھی نہیں کر سکتے

کرتار سنگھ نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ حیرت اور استعجاب کے ساتھ اس دیوانہ کی باتیں سنتا رہا ———!

باب ۱۴

امرت کور

امرت کور کرتار سنگھ کی چھوٹی بہن تھی ———— بے انتہا حسین اور خوب رو، ————

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن
جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

حسن و جمال میں وہ اپنی مثال آپ تھی، بڑے بڑے ساونت اور سورما اس سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکتے تھے، اس کے حسن میں کچھ ایسا وقار اور اس کے جمال میں کچھ ایسی شان جلال پنہاں تھی کہ اس کا دبدبہ اور طنطنہ سارے گھر پر جما ہوا تھا۔ صرف گھر پر ہی نہیں، ہر اس شخص پر جو اس سے ملنے کی جرأت کرے، جو اس کے حضور میں حاضر ہو۔

امرت کور کا حسن بے مثال خود نگر اور خود شناس بھی تھا۔ اپنے حسن و جمال کا خود اسے بھی اچھی طرح احساس تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پندار اور نخوت اس کی سرگزشت بن گئی تھی، وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھی، ماں باپ کی لاڈلی اور بھائی کی چہیتی تھی۔ اس لئے اس میں ضد اور سرکشی کا مادہ بھی پیدا ہو گیا تھا، مہاراجہ رنجیت سنگھ باہمی جاہ و جلال اور شان و شوکت اس کی زلف گرہ گیر کے اسیر تھے، بے انتہا التفات اور مدارات کے ساتھ پیش آتے تھے دربار کے لوگوں کا یہ عام خیال تھا، کہ بہت جلد یہ کم سن اور الھڑ نازنین رنجیت سنگھ جیسے بوڑھے اور گرگ باراں دیدہ شخص کی رفیق حیات بن جائے گی اور شاید یہ بات اب تک ہو بھی گئی ہوتی، لیکن امرت کور کی نخوت اور پندار نے یہ بیل منڈھے نہ چڑھنے دی، جب بھی

اس کے سامنے مہاراجہ کا نام لیا جاتا تھا، اس کی تیوریاں چڑھ جاتی تھیں، جب بھی مہاراجہ اس سے التفات والطاف کی باتیں کرتے تھے اور اسے للچائی ہوئی نظروں سے کھا جانے کی کوشش کرتے تھے اس کی چین پیشانی ان کا حوصلہ پست کر دیتی تھی، اور وہ کلیجہ مسوس کر رہ جاتے تھے، شہر کے اور بھی بہت سے نوجوان تھے، دولت مند، خوب صورت، طرحدار، لیکن نہ جانے کیا بات تھی، امرت کور انہیں اس لائق نہیں سمجھتی تھی کہ اپنا رفیق حیات منتخب کرے وہ جو کچھ چاہتی تھی وہ ان میں نہ تھا، اور جو کچھ ان میں تھا وہ اسے مرغوب نہ تھا ——— !

گرمی کا زمانہ تھا، دوپہر کا وقت تھا، لُو کے جھکڑ چل رہے تھے، اور باد سموم ہر جاندار کے جسم کو جھلسائے دے رہی تھی، لیکن امرت کور جس کمرہ میں بیٹھی تھی، وہ جنّت کا نمونہ تھا خس کی ٹٹیاں ہر چہار طرف لگی ہوئی تھیں، خادمائیں ان پر برابر پانی ڈال رہی تھیں، اور کنیزوں کا ایک گروہ پنکھا جھل رہا تھا۔ اس کمرہ میں بیٹھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے یہ لاہور گرم مقام کے بجائے کسی برفانی علاقہ کا ٹکڑا ہے چند سہیلیاں پاس بیٹھی تھیں اور گھل مل کر باتیں ہو رہی تھیں :

ان میں سے ایک منہ لگی سہیلی سروجنی نے کہا ——— !

"ہم نے تو تمہارے بارے میں کچھ اور سنا ہے، کیا یہ سچ ہے ؟

امرت کور نے مسکراتے ہوئے کہا .

"میں کیا جانوں تم نے کیا سُنا ہے !

سروجنی :- آہا ——— اتنی بھولی تو نہ بنو ،

امرت کور :- سچ میں نہیں جانتی تم نے کیا سُنا ہے ؟

سروجنی :- کل کو دولہن بن جاؤ گی۔ جب بھی اتنی ہی معصوم اور ایسی ہی نادان بنی رہنا ———

پوچھنا یہ کس کا محل ہے ؟

اور رنجیت سنگھ کس کا نام ؟

امرت کور: (برہمی کے ساتھ) خبردار سروجنی آگے کچھ نہ کہنا ورنہ

سروجنی:۔ (اٹھلاکر) ورنہ کیا ہوگا؟ کیا قتل کردو گی ہمیں؟

امرت کور:۔ پھر میں تم سے کبھی نہ بولوں گی!

سروجنی:۔ ارے یہ کیوں؟

امرت کور:۔ ہمیں یہ باتیں ناپسند ہیں!

سروجنی:۔ تو کیا مہاراجہ سے تمہاری شادی نہیں ہو رہی ہے۔؟

امرت کور:۔ (بگڑ کر) نہیں ——— نہ ہو رہی ہے، نہ ہوگی ——— نہ ہو سکتی ہے!

سروجنی:۔ ہمیں کیا معلوم ہم نے تو سنا تھا مہاراجہ تمہیں بہت چاہتے ہیں!

امرت کور:۔ ممکن ہے وہ چاہتے ہوں، لیکن میں ان سے سخت و شدید نفرت کرتی ہوں—

سروجنی:۔ ہائے غضب ——— تم مہاراجہ سے نفرت کرتی ہو!

امرت کور:۔ ہاں اگر وہ میرے شوہر بننا چاہیں، ورنہ نہیں!

سروجنی:۔ واہ یہ بھی اچھی کہی،

امرت کور:۔ اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔

سروجنی:۔ نہ جانے کتنی لڑکیاں ہوں گی جن کے دل کی یہ تمنا ہوگی کہ مہاراجہ ایک نظر انہیں دیکھ لیں، کبھی کبھی نگاہ التفات سے انہیں بھی شاد کر لیا کریں، اور ایک تم ہو کہ وہ تم سے محبت کرتے ہیں، شادی کرنا چاہتے ہیں اور تم ان سے نفرت کرتی ہو، ٹھکراتی ہو انہیں!

امرت کور:۔ ہاں سروجنی یہی بات ہے ——— ذرا سوچ تو میں کیوں انہیں چاہوں؟ عمر میں وہ میرے باپ سے بڑے ہیں، صورت شکل جیسی ہے ظاہر ہے طور طریقوں کا یہ حال ہے کہ بوڑھے ہو چکے ہیں، لیکن نہ شراب چھٹتی ہے، نہ عورت محل میں نہ جانے کہاں کہاں کی عورتوں کو انہوں نے جمع کر رکھا ہے، انہی میں جاکر میں بھی شامل ہو جاؤں کیا۔ میرا کچھ دماغ پھرا ہے

سروجنی:۔ (کچھ سوچتے ہوئے) بات تو تم سچ کہتی ہو!

امرت کور:۔ تمہاری سمجھداری سے طبیعت خوش ہوئی؟

سروجنی:۔ لیکن اگر ماں نے مجبور کیا تب کیا کروگی؟

امرت کور:۔ وہ مجبور نہیں کر سکتے۔ کم از کم میرے ماں باپ ایسے نہیں ہیں ——!

سروجنی:۔ اور اگر کرتار سنگھ اڑ گئے، تب؟ —— جانتی ہی ہو، وہ مہاراجہ کو اور مہاراجہ انہیں کتنا مانتے ہیں ——؟

امرت کور:۔ خوب اچھی طرح جانتی ہوں، لیکن تم میرے پتا کو نہیں جانتیں، وہ میری مرضی کے خلاف کوئی بات نہیں کر سکتے ——!

یہی وجہ ہے کہ یہ سوال لوگوں کے دلوں میں تو ہے، لیکن زبان پر نہیں آتا۔

سروجنی:۔ ہاں میں سمجھ گئی، چلو اچھا ہی ہوا —— لیکن یہ تو بتاؤ، پھر کس سے شادی کروگی ——!

امرت کور:۔ (مسکراتے ہوئے) بتادوں؟

سروجنی:۔ ہاں بتاؤ، دیکھیں وہ کون خوش قسمت ہے؟

امرت کور:۔ جلنے تو لگوگی اس سے ——؟

سروجنی:۔ نہیں —— تمہارے محبوب سے میں محبت کر سکتی ہوں، نفرت نہیں کر سکتی!

امرت کور:۔ نا بابا بخشو، میں ہرگز یہ نہیں چاہتی کہ کوئی میرے محبوب سے محبت کرے میں ان لوگوں کو پسند کرتی ہوں جو اس وقت نہیں برداشت کر سکتی، سروجنی ہنسنے لگی، پھر اس نے کہا۔

اوہ —— ابھی سے یہ احتیاطیں ہیں!

امرت کور:۔ (ایک ادائے خاص سے) جناب —— بگاڑ لیجئے!

جو کچھ آپ بگاڑ سکتی ہیں میرا ،

سروجنی ، توبہ کرو، میں کیوں کسی کا کچھ بگاڑنے لگی، لیکن تم اس کا نام نہیں بتاؤ گی، ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہو گی ؟

امرت کور :۔ بتا دوں گی ۔

سروجنی :۔ لیکن کب ——————؟ آخر اتنا انتظار کرانے کی کیا ضرورت ہے ؟

امرت کور :۔ اس کا نام ہے سروجنی دیوی !

اور پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی ، سروجنی کچھ شرمندہ سی ہو گئی ؟

امرت کور :۔ اب کیوں نہیں چہکتیں ؟ چپ کیوں ہو گئیں بی بو ؟ کچھ تو منہ سے بولو سر سے کھیلو

سروجنی :۔ تمہاری بے موقع دل لگی کی عادت اتنی خراب ہے کہ پوچھو زمین کی ، تو کہتی آسمان کی ہو

امرت کور :۔ تو میں کچھ جھوٹ تو نہیں کہتی ،

سروجنی :۔ جھوٹ نہیں تو کیا سچ ہے ؟ ——————کہیں عورتیں بھی عورتوں سے شادی کرتی ہیں——————؟

امرت کور :۔ دور کیوں جاؤ میری ہی مثال لے لو ! ——————میں تو تیار ہوں، اب تم انکار کر دو، اور راضی نہ ہو تو دوسری بات ہے ۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک خادمہ دوڑتی ہوئی آئی اور آکر سامنے کھڑی ہو گئی امرت کور نے اس پر ایک نظر ڈالی اور تمکنت کے ساتھ دریافت کیا ۔

"کیا ہے" ؟

وہ بولی ،

"سردار جی نے آپ کو یاد کیا ہے" !

امرت کور نے سوال کیا ۔

"کیا بھیا ، سردار کرتار سنگھ ، مجھے بلا رہے ہیں" ؟

خادمہ نے جواب دیا -

"جی ہاں ـــــــ انہوں نے ابھی آپ کو یاد کیا ہے !"

امرت کور نے بے پرواہی کے ساتھ کہا ،

"جا کہہ دے آتی ہوں!"

وہ چلی گئی ، امرت کور تھوڑی دیر تک سروجنی سے باتیں کرتی رہی ، پھر سروجنی سے بیٹھے رہنے کی تاکید کر کے کرتار سنگھ کے پاس چلی گئی!

باب ۱۵

قیدی

کرتار سنگھ کو جب تک امید تھی اس نے حبیب خاں کے ساتھ رحم و انسانیت کا برتاؤ کیا، جب مایوسی ہو گئی تو وہ درندگی پر اتر آیا اور کوئی ننگِ انسانیت حرکت ایسی نہ تھی جو اس نے حبیب خاں کے جسمِ ناتواں پر روا نہ رکھی ہو، اسے کوڑے مارے گئے اسے گرم گرم سلاخوں سے داغا گیا، اسے کئی کئی وقت کے فاقے دیئے گئے، اس پر گائے اور بھینس کا پیشاب چھڑکا، اور پاخانہ پھینکا، اسے مرچوں کی دھونی دی، گرم گرم کھولتا پانی، پینے کے لئے دیا۔ ٹھنڈے یخ بستہ پانی سے اسے نہانے پر مجبور کیا گھر کے نوکروں اور ملازموں نے اس کے منہ پر تھوکا، اس کے سامنے اسلام کی توہین کی بزرگانِ اسلام کو گالیاں دیں قرآن کریم کی بے حرمتی کی، اذان کا مذاق اڑایا، نماز کی نقلیں کیں، لیکن واہ رے حبیب خاں اس نے ان تمام تکلیفوں اور اذیتوں کو صبر و استقامت کے ساتھ برداشت کیا اس کے ماتھے پر شکن تک نہ آئی، وہ ان دکھوں کو اس طرح جھیلتا رہا۔ جیسے یہ اس پر نہیں کسی اور پر گزر رہے ہیں۔

کرتار سنگھ نے اسے اپنے گھر میں قید کیا تھا، تاکہ ہر وقت وہ نگاہوں کے سامنے رہے اور دن رات میں جس وقت جی چاہے، اسے ہدفِ تعزیر و انتقام بنایا جائے اور جب ضرورت محسوس ہو اس سے پوچھ گچھ کا سلسلہ شروع کر دیا جائے۔ وہ ایک مختصر سے دالان میں جسے چاروں طرف سے لوہے کی بڑی بڑی سلاخیں گھیرے ہوئے تھیں، اور جو اب ایک آہنی کٹہرا سا بن گیا تھا، مقید تھا، جب تک سورج چمکتا رہتا تھا چلچلاتی ہوئی

دھوپ یہاں بسیرا لیتی تھی، سارے دالان میں کوئی گوشہ ایسا نہیں تھا جہاں وہ دھوپ کی تمازت سے پناہ لے سکے، کبھی اس سلاخ کے پاس آکر کھڑا ہو جاتا تھا کبھی دوسری سلاخ کے پاس دن بھر یہی اس کا مشغلہ تھا، شام ہوتی تو یہیں اسی دالان کے ایک گوشہ میں پڑا رہتا، نہ کوئی بستر تھا، نہ تکیہ نہ چادر اور ان چیزوں کی ضرورت بھی کیا تھی ——— ؟

اپنے جنت نما کمرہ سے ذرا دیر کے لئے دھوپ کی تمازت کا مزہ لیتی ہوئی امرت کور کرتار سنگھ کے کمرہ میں پہنچی، وہ اس کا منتظر ہی بیٹھا تھا، بہن کو بہت چاہتا تھا۔ دیکھتے ہی پھول کی طرح کھل گیا۔ امرت کور نے پوچھا۔

"بھیا آپ نے مجھے بلایا ہے ؟"

وہ بولا :-

"ہاں امرت، میں نے بلایا ہے، تمہیں تکلیف تو ہوئی ہوگی آنے میں، لیکن بڑا ضروری کام ہے۔ !"

وہ مستعدی کے ساتھ کہنے لگی۔

نہیں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ کہئے کیا بات ہے ———

کرتار سنگھ :- میں آج ایک بہت ضروری کام سے لاہور سے باہر جا رہا ہوں، چند روز کے لئے !

امرت کور :- اتنے شدید اور گرم موسم میں آپ کو باہر جانے کی کیا ضرورت ہے، میں جانتی ہوں آپ شکار کھیلنے جا رہے ہیں - !

کیوں بھیا یہی بات ہے نا ! لیکن میں نہیں جانے دوں گی کسی طرح۔

کرتار سنگھ :- مسکراتے ہوئے، ہاں تم نے اندازہ تو خوب لگایا، واقعی میں شکار کو جا رہا ہوں لیکن پرندوں، اور جانوروں کے شکار کو نہیں، انسانوں کے شکار کو۔

امرت کور :- واہ بھیا یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، کہیں انسانوں کا بھی شکار کیا جاتا ہے - ؟

کرتار سنگھ :۔ کیا جاتا ہے ——— جب ضرورت ہو!

امرت کور :۔ وہ کون انسان ہیں جن کا شکار کرنے آپ جا رہے ہیں؟

کرتار سنگھ :۔ مسلمان ———

امرت کور :۔ مسلمان ———؟ کیا وہ بغاوت پر آمادہ ہو گئے ہیں؟

کرتار سنگھ :۔ بغاوت کریں گے تو اس طرح کچل دیئے جائیں گے جس طرح ہر روز نہ جانے کتنی چیونٹیاں قدموں تلے روندی جاتی ہیں،

امرت کور :۔ پھر کیا کیا ہے انہوں نے ———؟

کرتار سنگھ :۔ کچھ شورہ پشت مسلمان ہندوستان سے ہمارے حدود مملکت میں داخل ہو گئے ہیں، ان کی سرکوبی مقصود ہے۔ گیدڑ کی جب موت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے ان لوگوں کے سروں پر بھی موت کھیل رہی ہے جو انہوں نے ہماری سرزمین پر قدم رکھا ہے

امرت کور :۔ انہیں کس نے آنے دیا ہے ———؟

کرتار سنگھ :۔ یہ بڑے چکر کا راستہ کاٹ کر چپکے سے داخل ہو گئے، اور اب یہ واپس نہیں جا سکیں گے!

امرت کور :۔ انہیں واپس جانا بھی نہیں چاہئے ——— یہ آئے ہیں تو ہم ان کی مہانداری کریں گے، انہیں یہیں قتل کریں گے اور یہیں دفن کریں گے!

کرتار سنگھ نے ایک زوردار قہقہہ لگایا، اور امرت کور کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا۔

شاباش، آخر تو کس کی لڑکی اور کس کی بہن ہے، یہی جذبہ ہونا چاہئے، تیرے اندر ———!

امرت کور :۔ یہ شخص جسے آپ نے قید کیا ہے، یہ بھی تو مسلمان ہی ہے۔

کرتار سنگھ :۔ ہاں مسلمان بھی ہے، اور پٹھان بھی اور دشمن کا جاسوس بھی!

امرت کور :۔ پھر اب تک آپ نے اسے زندہ کیوں رکھا ہے؟

کرتار سنگھ :۔ (ہنستے ہوئے) کیا قتل کر ڈالوں؟"

امرت کور:۔ اور کیا ـــــــــ ایسے آدمی کی ہلکی سے ہلکی سزا قتل ہو سکتی ہے،

کرتار سنگھ:۔ ٹھیک کہتی ہے تو، ضرور قتل ہوگا لیکن ابھی نہیں ـــــــــ!

امرت کور:۔ پھر کب ـــــــــ؟

کرتار سنگھ:۔ اس کے کچھ ساتھی بھی جمع ہولیں تب ـــــــــ ایک آدمی کے قتل کرنے سے کیا فائدہ، پورا ریوڑ جمع ہو جائے، تب سب کی گردن پر ایک ساتھ چھری پھیری جائے گی ـــــــــ!

امرت کور ہنسنے لگی، اس نے کہا،

ہاں بھیّا یہ ٹھیک ہے ـــــــــ لیکن بہت سے مسلمان پکڑ لاہیے گا۔

کرتار سنگھ:۔ اطمینان رکھ بہت سے لاؤں گا۔ ان کے قتل کا تماشہ دیکھنے کی چیز ہوگا!

امرت کور:۔ ہاں بھیّا، مجھے یہ تماشہ دیکھنے کا بڑا اشتیاق ہے!

کرتار سنگھ:۔ تیرا یہ اشتیاق بہت جلد پورا ہوگا ـــــــــ لیکن میں نے جس کام کے لئے تجھے بلایا تھا، تو نے پوچھا ہی نہیں وہ کیا ہے؟

امرت کور:۔ ہاں بتایئے کیا کام ہے میں تو بھول ہی گئی یہ پوچھنا،

کرتار سنگھ:۔ تجھے اس جاسوس قیدی کی رکھوالی کرنی ہے،

امرت کور:۔ اطمینان رکھیے، اسے تکلیف و اذیت پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا جائے گا!

کرتار سنگھ:۔ شاباش مجھے تم سے یہی امید تھی۔

امرت کور:۔ بس تو اب آپ اطمینان سے سدھاریے،

کرتار سنگھ:۔ ہاں اب میں جاتا ہوں ـــــــــ لیکن دیکھو ایک بات کا ضرور خیال رکھنا،

امرت کور:۔ فرمایئے، آپ جو حکم دیں گے اس کی پوری پوری تعمیل کی جائے گی۔

کرتار سنگھ :۔ کیا جاتا ہے ——— جب ضرورت ہوا

امرت کور :۔ وہ کون انسان ہیں جن کا شکار کرنے آپ جا رہے ہیں ؟

کرتار سنگھ :۔ مسلمان ———.

امرت کور :۔ مسلمان ——— ؟ کیا وہ بغاوت پر آمادہ ہو گئے ہیں ؟

کرتار سنگھ :۔ بغاوت کریں گے تو اس طرح کچل دیئے جائیں گے، جس طرح ہر روز نہ جانے کتنی چیونٹیاں قدموں تلے روندی جاتی ہیں،

امرت کور :۔ پھر کیا کیا ہے انہوں نے ———؟

کرتار سنگھ :۔ کچھ شورہ پشت مسلمان ہندوستان سے ہمارے حدود مملکت میں داخل ہو گئے ہیں، ان کی سرکوبی مقصود ہے، گیدڑ کی جب موت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے ان لوگوں کے سروں پر بھی موت کھیل رہی ہے جو انہوں نے ہماری سرزمین پر قدم رکھا ہے

امرت کور :۔ انہیں کس نے آنے دیا ہے ———؟

کرتار سنگھ :۔ یہ بڑے جگر کا راستہ کاٹ کر چپکے سے داخل ہو گئے، اور اب یہ واپس نہیں جا سکیں گے !

امرت کور :۔ انہیں واپس جانا بھی نہیں چاہئے ——— یہ آئے ہیں تو ہم ان کی مہمانداری کریں گے، انہیں یہیں قتل کریں گے اور یہیں دفن کریں گے !

کرتار سنگھ نے ایک زوردار قہقہہ لگایا، اور امرت کور کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا۔

شاباش، آخر تو کس کی لڑکی اور کس کی بہن ہے، یہی جذبہ ہونا چاہیئے، تیرے اندر ———!

امرت کور :۔ یہ شخص جسے آپ نے قید کیا ہے، یہ بھی تو مسلمان ہی ہے۔

کرتار سنگھ :۔ ہاں مسلمان بھی ہے، اور پٹھان بھی اور دشمن کا جاسوس بھی!

امرت کور :۔ پھر اب تک آپ نے اسے زندہ کیوں رکھا ہے ؟

کرتار سنگھ :۔ (ہنستے ہوئے) کیا قتل کر ڈالوں ؟

امرت کور :۔ اور کیا ——— ایسے آدمی کی ہلکی سے ہلکی سزا قتل ہو سکتی ہے ،
کرتار سنگھ :۔ ٹھیک کہتی ہے تو، ضرور قتل ہوگا لیکن ابھی نہیں ———!
امرت کور :۔ پھر کب ———؟
کرتار سنگھ :۔ اس کے کچھ ساتھی بھی جمع ہو لیں تب ——— ایک آدمی کے قتل کرنے سے کیا فائدہ ، پورا ریوڑ جمع ہو جائے ، تب سب کی گردن پر ایک ساتھ چھری پھیری جائے گی ———!
امرت کور ہنسنے لگی ، اس نے کہا ،
ہاں بھیا یہ ٹھیک ہے ——— لیکن بہت سے مسلمان پکڑ لائیے گا۔
کرتار سنگھ :۔ اطمینان رکھ بہت سے لاؤں گا۔ ان کے قتل کا تماشہ دیکھنے کی چیز ہوگا !
امرت کور :۔ ہاں بھیا ، مجھے یہ تماشہ دیکھنے کا بڑا اشتیاق ہے !
کرتار سنگھ :۔ تیرا یہ اشتیاق بہت جلد پورا ہوگا ——— لیکن میں نے جس کام کے لئے تجھے بلایا تھا ، تو نے پوچھا ہی نہیں وہ کیا ہے ؟
امرت کور :۔ ہاں بتایئے کیا کام ہے میں تو بھول ہی گئی یہ پوچھنا ،
کرتار سنگھ :۔ تجھے اس جاسوس قیدی کی رکھوالی کرنی ہے ،
امرت کور :۔ اطمینان رکھیے ، اسے تکلیف واذیت پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا جائے گا !
کرتار سنگھ :۔ شاباش مجھے تم سے یہی امید تھی۔
امرت کور :۔ بس تو اب آپ اطمینان سے سدھاریئے ،
کرتار سنگھ :۔ ہاں اب میں جاتا ہوں ——— لیکن دیکھو ایک بات کا ضرور خیال رکھنا ،
امرت کور :۔ فرمایئے ، آپ جو حکم دیں گے اس کی پوری پوری تعمیل کی جائے گی۔

کرتار سنگھ :۔ اس مسلمان قیدی کو تکلیف چاہے جتنی دینا لیکن اس کی جان باقی رہنی چاہیے

امرت کور :۔ ریوڑی چڑھاکر، یہ کیوں بچتا ؟

کرتار سنگھ :۔ وہ ہمارے لئے ایک قیمتی اثاثہ ہے اسے زندہ رکھ کر ہم بہت سی باتیں معلوم کر سکتے ہیں۔

امرت کور :۔ یعنی اس سے آپ کچھ راز معلوم کریں گے ؟

کرتار سنگھ :۔ ہاں ——————— !

امرت کور :۔ خیر اس کی جان تو محفوظ رہے گی لیکن اس سے کسی راز کا معلوم ہونا مشکل ہے، بڑا بے غیرت ہے، کسی اور پر اتنا تشدد ہوتا تو سب کچھ اگل دیتا لیکن نہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا ہے۔ کہ اب تک اپنی ضد پر اڑا ہوا ہے

کرتار سنگھ :۔ لیکن کب تک ——————— آخر کسی نہ کسی دن راہ راست پر آئے گا ——————— اچھا اب میں چلتا ہوں،

امرت کور :۔ جایئے، سدھاریئے لیکن کب تک واپس آجائیں گے آپ ———؟

کرتار سنگھ :۔ بس یہی ہفتہ عشرہ میں ——————— !

اس گفتگو کے بعد کرتار سنگھ اپنی منزل مقصود کی طرف روانہ ہوگیا اور امرت کور اس کنیز کے ساتھ جو اسے بلانے آئی تھی اپنے کمرہ کی طرف چلی گئی جہاں سردجنی بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی !

راستہ میں وہ آہنی کٹہرا بھی پڑتا تھا جہاں حبیب خاں قید تھا۔ جاتے وقت اس نے اس کٹہرے کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا، آتے وقت وہ کٹہرے کے قریب پہنچ کر ذرا کے ذرا ٹھٹکی پھر کھڑی ہوگئی ؛

حبیب خاں سامنے کھڑا تھا !

دھوپ نے اس کے بدن کو جھلسا دیا تھا، تمازت آفتاب سے اس کا چہرہ سرخ

ہو رہا تھا۔ اور سارے دالان میں ایک گوشہ بھی ایسا نہیں تھا، جہاں ذرا بھی سایہ ہو اور وہ دھوپ سے پناہ لے سکے، اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں، اس کا چہرا اترا ہوا تھا اس پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی،

امرت کور کو مسلمانوں سے نفرت تھی یہ نفرت اسے ورثہ میں ملی تھی، ہوش کی آنکھیں کھول کر جس فضا میں وہ پروان چڑھی، جس گھر میں اس کی تربیت ہوئی تھی، وہاں اس نے مسلمانوں سے نفرت کرنا ہی سیکھا تھا۔ یہ حبیب خاں جب گرفتار ہو کر آیا تھا تو اس کا دل اس شخص کے خلاف اور مسلمانوں کے خلاف پہلے سے بھی زیادہ نفرت سے بھر گیا تھا، اسے نہ مسلمان سے کوئی ہمدردی تھی۔ نہ حبیب خاں پر ترس آیا تھا لیکن اس وقت حبیب خاں کی حالت دیکھ کر اس کا دل لرز گیا۔ اس کی انسانیت جاگ اٹھی۔ اس نے سوچا، یہ کتنا ہی بڑا مجرم اور کیسا ہی خطاکار سہی، لیکن کیا ایسے لرزہ خیز سلوک کا مستحق ہے؟

اس کا جی چاہا کہ اسے کسی سایہ دار مقام پر قید کرنے کا حکم دے لیکن ہمت نہ پڑی کہ آخر ا تنا بڑا اور انقلابی اقدام کرتار سنگھ کی عدم موجودگی میں محض اپنی صواب دید پر کر گزرے۔ اس نے سوچا، بھیّا جب واپس آئیں گے تو اس قیدی کو اس آہنی کٹہرے سے نکلوا کر ضرور سامنے والی کوٹھری میں قید کرا دوں گی، پھر نہ جانے یک بیک اسے کیا خیال آیا، اس نے کنیز سے پوچھا۔

" قیدی نے کھانا کھا لیا؟"

وہ بولی:۔

" نہیں!"

امرت کور نے ذرا غصّہ کے ساتھ دریافت کیا،

کیوں ——————؟

وہ کہنے لگی ،

"میں تو لائی تھی مگر اس نے انکار کر دیا !"

امرت کور نے براہِ راست حبیب خاں سے پوچھا

"کیوں قیدی ! تم نے کھانا کیوں نہیں کھایا "

"میں روزہ سے ہوں آج رمضان کی پہلی تاریخ ہے ——!"

امرت کور خاموش ہو گئی اور اپنے کمرہ میں چلی آئی !

باب ۱۶

قیدی مرگیا

امرت کور، حبیب خاں سے رخصت ہوکر اپنے کرہ میں پہنچی ایوں سمجھئے جہنم سے جنت میں آگئی، ابھی چند لمحوں کے لئے وہ حبیب خاں کے پاس کھڑی ہوئی تھی یا ذرا دیر کے لئے کرتار سنگھ کے کمرے کی طرف گئی تھی تو قدر عافیت معلوم ہوگئی تھی لو کی تپش، دھوپ کی سختی اور موسم کو جھلسا دینے والی شدت نے حواس پران کر دیے تھے اور اب جو اپنے کمرے میں پہنچی تو وہ تکلیف واذیت ایک خواب وخیال معلوم ہونے لگی۔

لیکن اس وقت وہ بہت مضمحل تھی، سروجنی سے اس کی یہ کیفیت چھپی نہ رہ سکی، اس نے ذرا بناتے ہوئے کہا۔

ارے کیا بات ہے، یہاں سے گئی تھیں، تو پھول کی طرح کھلی ہوئی تھیں، آئی تو مرجھائی ہوئی کیا کرتار سنگھ نے لسی کے بجائے "ڈانٹ پلادی!

امرت کور مسکرانے لگی، اس نے کہا۔

سروجنی :۔ پھر اتنی اداس کیوں ہو؟

امرت کور :۔ کچھ نہیں، گرمی نے بے حال کر دیا ——————— کس غضب کی لو چل رہی ہے!

سروجنی :۔ ہاں بہت زیادہ ——————— ذراان لوگوں کا تصور کرو، جنہیں اس دھوپ اور گرمی میں سارے کام کرنا پڑتے ہیں!

امرت کور :۔ ہاں، اوران سے بھی زیادہ وہ لوگ قابل رحم ہیں جو بھوک اور پیاس کی حالت میں

اس گرمی اور دھوپ کو سہتے ہیں۔

سروجنی :۔ ہاں اور کیا ؟

امرت کور :۔ کیوں سروجنی کچھ مسلمانوں کے بارے میں بھی جانتی ہو ؟

سروجنی :۔ ہاں کیوں نہیں جانتی ——— کچھ پوچھنا ہے ؟

امرت کور :۔ یہ روزہ کیا بلا ہے ؟ ہر مسلمان کو رکھنا پڑتا ہے ———؟

سروجنی :۔ ہاں، یہ بڑی سخت چیز ہے، ہر مسلمان دن بھر نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے۔ بالکل فاقہ سے رہتا ہے،

امرت کور :۔ عجیب حکم ہے یہ بھی،

سروجنی :۔ ہاں لیکن مسلمان بڑے شوق اور جوش سے اس کی تعمیل کرتے ہیں، میرے پڑوس میں ایک مسلمان خاندان رہتا ہے، میں تو ہر روزان کے یہ تماشے دیکھتی رہتی ہوں، تم نے تو کاہے کو کبھی کسی روزہ دار کو دیکھا ہوگا ؟

امرت کور :۔ آج دیکھ لیا،

سروجنی :۔ میں سمجھ گئی وہ مسلمان قیدی روزے سے ہوگا کم بخت ———؟

امرت کور :۔ ہاں وہی،

سروجنی :۔ اس بیچارے کو تو سحری بھی نہیں ملی ہوگی ؟

امرت کور :۔ سحری کیا چیز ہوتی ہے ———؟

سروجنی :۔ جو لوگ روزہ رکھتے ہیں وہ صبح ہونے سے پہلے کچھ کھا پی لیتے ہیں ۔ تو دن ذرا آسانی سے کٹ جاتا ہے !

امرت کور :۔ واقعی یہ بدنصیب شخص ہے اکا ہے کو اسے سحری ملی ہوگی !

سروجنی :۔ لیکن اس بیوقوف نے روزہ رکھا کیوں ؟ نہ رکھتا تو کوئی اس کا کیا بگاڑ لیتا، میں نے تو سنا ہے، مجبوری کی حالت میں روزہ ملتوی بھی کیا جا سکتا ہے۔

امرت کور :۔ میں نہیں جانتی ہوگا، وہ تو بہر حال روزے سے ہے، اور سچ کہتی ہوں اس حالت میں اسے دیکھ کر، اگرچہ مسلمانوں کی نفرت سے میرا دل بھرا ہوا ہے، لیکن میرا دل کڑھا!

سروجنی :۔ (مسکراکر) تم جیسے سنگدل بھی رحم کا اظہار کر سکتے ہیں ؟

امرت کور :۔ بھئی ہر وقت ہنسی دل لگی کی باتیں نہ کیا کرو،

سروجنی :۔ تو کیا بہت دل کڑھ رہا ہے، تمہارا اس کے حالِ زار پر ؟

امرت کور :۔ ہاں بہت زیادہ، اور تم دیکھو گی تو تمہارا دل بھی کڑھے گا ؟

سروجنی :۔ میرا دل صرف ایک ہی آدمی پر کڑھتا ہے۔

امرت کور :۔ (مسکراکر) اور وہ ہے مہندر ؟ ——— کیوں کیسی رہی ؟

سروجنی :۔ ہاں ٹھیک ہے، ہم تمہاری طرح جھوٹی شرم کے قائل نہیں ہیں۔ ہم تو ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں،

ہاں ہاں محبت اس سے کی اور ضرور کی، وہ مجھے چاہتا ہے، میں اس سے محبت کرتی ہوں!

امرت کور :۔ تو تمہیں چاہنے سے کون منع کرتا ہے، اسے چاہو اور دوسروں پر رحم کرنا سیکھو!

سروجنی :۔ تمہاری طرح سے ——— کیوں ؟

امرت کور :۔ ہاں ہاں تو پھر ؟

سروجنی :۔ پھر تم مجھے اپنا رقیب تو نہیں سمجھ لوگی ؟

امرت کور :۔ بھی چھی کیسی ناپاک اور گندی باتیں کرتی ہو ——— اٹھو کھڑی ہو جاؤ فوراً!

سروجنی اُٹھ کھڑی ہوئی،

"کیوں کیا بات ہے ———؟"

امرت کور نے کنیز کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"سروجنی کو حبیب خاں سے ملالا!"

سروجنی بیٹھ گئی،

"اے واہ، میں کیوں ملنے لگی اس سے؟ نہیں جاتی۔"
امرت کور نے کہا "
"نہیں جانا پڑے گا، یہ ہمارا حکم ہے!"
پھر اس نے دوستانہ لب و لہجہ میں کہا،
"کہنا مانو جاکر اس کا حال زار اپنی آنکھوں سے دیکھ تو آؤ!
سروجنی:۔ لیکن اس سے فائدہ کیا ہے؟
امرت کور:۔ نقصان بھی تو کچھ نہیں ہے، جاؤ ———————— ابھی چلی آنا!
سروجنی کچھ تامل کے بعد کنیز کے ساتھ حبیب خاں کا حال زار دیکھنے کے لئے روانہ ہوئی
تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آئی تو اس کی آنکھیں پُرنم تھیں، امرت کور نے کہا۔
"دیکھ آئیں؟"
سروجنی:۔ ہاں دیکھ آئی، کاش! تم نے مجھے وہاں نہ بھیجا ہوتا، سچ کہتی ہوں، یہ پاپ ہے بلکہ مہاپاپ ہے۔
امرت کور:۔ اب قائل ہوئیں تم؟
سروجنی:۔ میری تو آنکھیں کھل گئیں، سچ کہتی ہوں، یہ بہت بڑا ظلم ہے، یا تو اس کا روزہ تڑاؤ یا وہاں سے ہٹاؤ، ورنہ وہ مر جائے گا۔
امرت کور:۔ نہیں اسے مرنا نہیں چاہیئے، بھیّا کہہ رہے تھے، اس کا زندہ رہنا ہمارے مقاصد کے لئے ضروری ہے، اگر وہ مر گیا تو بہت سے قیمتی راز بھی اپنے ساتھ لے جائے گا۔
سروجنی:۔ تو میں تم سے انسانیت کے نام پر التجا کرتی ہوں، اتنا ظلم نہ کرو، مسلمانوں سے مجھے بھی کوئی ہمدردی نہیں ہے، لیکن اس شخص کی بیچارگی نے کم از کم اس سے ضرور پیدا کر دی ہے
امرت کور:۔ بات تو ٹھیک کہتی ہو، ایسی کیفیت میری بھی ہے!

سروجنی :- تو پھر کیوں نہیں اس جہنم سے اسے نکالتیں ،

امرت کور :- ڈرتی ہوں کہیں بھیّا خفا نہ ہو جائیں ،

سروجنی :- پگلی کہیں کی ، بھیّا کیوں خفا ہونے لگے ؟ کیا انہوں نے یہ نہیں کہا ہے کہ اسے مرنے نہ دینا ؟

امرت کور :- کہا تو ہے ، مجھے اچھی طرح یاد ہے !

سروجنی :- اور پھر بھی اسے مرنے دے رہی ہو ۔ سچ کہتی ہوں ۔ وہ مر جاتے گا ، ہرگز اس سختی کی تاب کوئی آدمی نہیں لا سکتا !

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ وہی کنیز دوڑتی ہوئی آئی اور اس نے کہا " وہ ، وہ ——— وہ قیدی مر گیا ! "

باب ۱۷

التفات

حبیب خاں مرا نہیں تھا، بیہوش ہوا تھا، امرت کور کی ہدایت کے مطابق فوراً ہی اسے آہنی سلاخوں کے کٹہرے سے نکال کر اس کے کمرہ میں پہنچا یا گیا۔ یہاں کی فضا نے جادو کا سا اثر کیا، اور چند لمحوں کے بعد اس نے آنکھیں کھول دیں، اسے زندہ دیکھ کر امرت کور اور سروجنی کو بہت خوشی ہوئی، سروجنی نے امرت کور سے کہا۔

ارے یہ زندہ ہے، یہ کم بخت تو کہہ رہی تھی مر گیا ——!

امرت کور حبیب خاں کے قریب آئی، وہ پھٹی پھٹی سی آنکھوں سے ان لوگوں کو نیم بیہوشی کی حالت میں دیکھ رہا تھا، اس کے ہونٹوں پر اب بھی پیپڑیاں جمی ہوئی تھیں، اور بار بار وہ اپنی زبان ہونٹوں پر پھیر رہا تھا، یہ حالت دیکھ کر سروجنی نے کہا۔

ہا —————— بیچارہ بہت پیاسا ہے!

امرت کور نے کہا،

بہت زیادہ، لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں؟

سروجنی:۔ صندل کا شربت پلاؤ۔

امرت کور:۔ وہ تو ابھی آجاتے گا، لیکن پی لے گا یہ!

سروجنی:۔ پیئے گا، کیوں نہیں، کیا اپنی جان دے گا!"

امرت کور نے زبان سے کچھ نہ کہا، اس کنیز کی طرف دیکھا، جس کا مطلب یہ تھا، جاؤ فوراً شربت لے کر آؤ، وہ سمجھ گئی، اس نے ادب سے گردن جھکائی اور تعمیل ارشاد کے لئے چلی گئی

اور چند ہی لمحوں کے بعد شربت سے بھرپور گلاس لے کر آگئی۔

امرت کور نے گلاس اس کے ہاتھ سے لے لیا اور سروجنی کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا:———————۔

"لو تم پلا دو، اسے"!

سروجنی پھر مچل گئی،

اے واہ! میں کیوں پلاؤں، تم کیوں نہیں پلا دیتیں۔ بیچارے قیدی کو!"

امرت کور نے گلاس اس کے ہاتھ میں رکھتے ہوئے کہا،

"بس اسی بخشم بخشا میں اس کی جان لے لینا، ویسے ہمدردی تو بہت ہے۔ بیچاری کو،

سروجنی گلاس لے کر اس کی طرف بڑھی اور اس کے پاس جا کر گویا ہوئی۔

"لو قیدی، یہ شربت ہے، اسے پی لو، ابھی تم میں توانائی آجائے گی اور تم آنکھیں کھول دو گے!"

حبیب خاں کی نظر گلاس پر پڑی۔ تو وہ بیتاب ہوگیا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا بیتابی کے ساتھ اٹھنے کی کوشش کی، لیکن کمزور اتنا ہوگیا تھا کہ اٹھ نہ سکا۔ امرت کور نے کنیز کو دیکھا، وہ لپکی اور حبیب خاں کو سہارا دے کر اس نے گاؤ تکیہ سے ٹکا کر اسے بٹھا دیا! ایسا معلوم ہوتا ہے، وہ پیاس سے اتنا بے حال ہو رہا ہے۔ کہ سارا گلاس ایک ہی گھونٹ میں پی جائے گا۔ اس نے اضطراب کے ساتھ گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ نہ جانے کیا سوچ کر واپس ہٹا لیا، سروجنی اسے تعجب سے دیکھنے لگی، وہ اور قریب آگئی۔ اس نے کہا۔

"لو، پی لو"

حبیب خاں کا چہرہ اتر گیا، امرت کور نے کنیز کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا، اس نے اس طرح اس کی طرف سے منہ پھیر لیا، جیسے وہ کوئی ناپاک چیز ہے۔ اور اس کی طرف دیکھنا

بھی اسے منظور نہیں!

اب سروجنی کو غصہ آگیا، اس نے ذرا بگڑتے ہوتے لہجہ میں جس میں اپنایت بھی چھلک رہی تھی کہا۔

"بھاڑ میں جائے تمہارا روزہ کیا جان دے دو گے روزہ کے پیچھے؟"

حبیب خاں بہت زیادہ بے حال اور نڈھال ہو رہا تھا لیکن اس کے ہونٹوں پر تبسم کی خفیف سی لرزش پیدا ہوگئی، اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے جسے چاہے جلاتے، جسے چاہے زندہ رکھے

اب تو سروجنی کا پیمانۂ ضبط چھلک پڑا، اس نے بہت کڑوے کسیلے لب و لہجہ میں کہا۔

مجھے تو زیادہ نخرے دکھاہیے نہیں، نہیں پیتے نہ پیو، میں کچھ اپنی طرف سے تو دے نہیں رہی تھی، جن کے رامرت کور کی طرف اشارہ کرکے، قیدی ہوانی کا حکم تھا ——————،

پھر وہ امرت کور کی طرف مخاطب ہوئی۔

"لو بی بیہ اپنا شراب، تو یہ شربت کا گلاس، یہ گلفام صاحب نہیں پیتے انہیں پلانے کے لئے تو آسمان کی حوریں اور کوہ قاف کی پریاں چاہئیں!

امرت کور نے کنیز کی طرف دیکھا، اس نے بڑھ کر گلاس لے لیا، اور چلی گئی امرت کور نے سروجنی سے کہا،

"کیوں ایک بیمار کے پیچھے پڑی ہو؟"

سروجنی بولی۔

"پھر وہ پیتا کیوں نہیں؟"

امرت کور:۔ مذہب کا معاملہ ہے، ہم مجبور تو نہیں کر سکتے۔ نہ ایسا کرنا چاہیئے!"

سروجنی :۔ آہستہ سے (تم خود مجبور ہوتی جارہی ہو، کسی کو مجبور کیا کروگی ——— ؟

امرت کور :۔ (تیکھی نظروں سے دیکھ کر) کیا مطلب تمہارا ؟

سروجنی :۔ (ہاتھ باندھ کر) غلطی ہوئی میری زبان بڑی خراب ہے نہ جانے منہ سے کیا نکل جاتا ہے، معاف کرو۔

امرت کور مسکرانے لگی !

باب ۱۸

سروجنی اور امرت کور

تھوڑی دیر کے بعد حبیب خاں کی حالت سدھر گئی، اور وہ بولنے کے قابل ہوگیا، اس نے کمزور لیکن صاف آواز میں سروجنی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کا بہت شکرگزار ہوں کہ آپ نے مجھ پر ترس کھایا!"

سروجنی نے ذرا ہنستے ہوتے کہا،

"جی مجھے تو بخشئے اپنے شکریہ سے، مجھے کیا پڑی تھی کہ آپ کے حال زار پر توجہ کرتی اور آپ پر ترس کھاتی، یہ عنایت تو آپ پر انہوں نے (امرت کور کی طرف اشارہ کر کے) کی ہے، ترس آگیا بیچاری کو آپ پر، لہٰذا شکریہ ادا کیجیے۔ تو ان کا واقعی کتنا بڑا فرق ہے، بھائی بہن میں، سردار کرتار سنگھ نے آپ کو جہنم میں قید کیا اور ان کی بہن امرت کور نے آپ کو جہنم سے جنت میں پہنچا دیا، لیکن ایک بات کا خیال رہے!"

حبیب خاں سروجنی کی طرف منتظر نظروں سے دیکھنے لگا،

"یہ جنت ہمیشہ کے لئے نہیں ہے، اب ذرا اچھے ہو چلے ہو، تھوڑی دیر میں پھر وہیں پہنچا دیئے جاؤ گے،

پھر وہی کنج قفس پھر وہی صیاد کا ڈر!

امرت کور اب تک خاموش تھی، اس نے حبیب خاں سے کسی قسم کی گفتگو نہیں کی تھی۔ اب وہ خاموش نہ رہ سکی اس نے کہا۔

"نہیں اب تم وہاں نہیں رکھے جاؤ گے، ہماری بارہ دری سے ملا ہوا جو کمرہ ہے، اس میں

رہوگے، اس کے نیچے تہ خانہ بھی ہے۔ دن کو وہاں رہنا، رات کو کمرہ میں!"

حبیب خاں نے شکرگزار نظروں سے امرت کور کو دیکھا، پھر جلدی سے نظریں نیچی کر لیں اور کہا

"آپ کی اس مہربانی اور نوازش کا شکریہ کن الفاظ میں ادا کروں گا!"

امرت کور نے "شکریہ کی کوئی ضرورت نہیں، میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا ہے۔ جو کچھ کیا ہے وہ انسانی فرض سمجھ کر کیا ہے۔

حبیب خاں خاموش ہوگیا۔ سروجنی نے کہا۔

"اب تو خوش ہو؟ ——————— اس جہنم سے نجات مل گئی تمہیں!"

حبیب خاں نے جواب دیا۔

میں نے جب گھر سے قدم نکالا تھا اس وقت ہی سوچ لیا تھا بڑی بڑی کڑیاں جھیلنا پڑیں گی، میں تکلیفوں اور اذیتوں سے نہیں گھبراتا میں ——————— آگے امرت کور نے کچھ نہ کہنے دیا، وہ بول پڑی۔

"قیدی زیادہ باتیں نہ کرو، تمہاری طبیعت پھر خراب ہو جائے گی!"

حبیب خاں خاموش ہوگیا!

سروجنی نے آگے بڑھ کر حبیب خاں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ایک طبیب کی طرح اس کی نبض ٹٹولتی ہوئی گویا ہوئی۔

"واقعی حالت نازک ہے میاں قیدی کہیں مر نہ جانا!"

امرت کور نے سروجنی کو جھڑک دیا۔

"کیسی واہیات باتیں کرتی ہو سروجنی!"

سروجنی خاموش ہوگئی ———————!

پھر امرت کور نے سروجنی سے کہا۔

"قیدی سے پوچھو اب وہ کھانا کب کھائے گا۔؟"

سروجنی نے کہا ،

وہ تو بغیر پوچھے میں ہی بتا سکتی ہوں ، سورج غروب ہونے کے بعد یہ لوگ کھانا کھاتے یعنی روزہ افطار کرتے ہیں، پھر رات بھر جو چاہیں کھا پی سکتے ہیں ، سورج نکلنے سے پہلے روزہ کی نیت کر لیتے ہیں، اور پھر دن بھر کچھ نہیں کھاتے پیتے !" لہٰذا اب ان قیدی صاحب کے افطار کا انتظام کرو - دن تھوڑا ہی رہ گیا ہے !"

امرت کور نے اپنی کنیز کی طرف دیکھا اور اس سے گویا ہوئی ،

" جیسے ہی سورج ڈوبے قیدی کے لئے کھانا لے آنا !"

اس نے بہت اچھا کہا اور سر جھکا کر کھڑی ہوگئی ، امرت کور نے کہا -

ہمارے باورچی خانہ میں جو کھانا پکا ہو اس میں سے ایک خوان لاکر اسے دینا !"

اس نے پھر بہت اچھا کہا اور سر جھکا کر خاموش کھڑی ہوگئی ۔

سروجنی نے لقمہ دیا ،

اور شیریں ؟ ——— یہ لوگ روزہ شربت ہی سے تو افطار کرتے ہیں، ایک خوب بڑا سا گلاس شربت کا بھی بنا لانا سمجھی ———؟

اس نے پھر بہت اچھا کہا اور حسب معمول گردن جھکا کر کھڑی ہوگئی -

سروجنی :- امرت کور سے مخاطب ہو کر، ہاں ایک مشکل اور بھی تو ہے !"

امرت کور سوالیہ نظروں سے سروجنی کی طرف دیکھنے لگی ، سروجنی نے کہا -

" یہ مسلمان جھٹکہ کا گوشت نہیں کھاتے ، ذبیحہ کھاتے ہیں ، اب کیا کروگی ؟"

امرت کور نے سروجنی کو تو کوئی جواب نہیں دیا ، اپنی کنیز سے کہا ۔

" اری سنتی ہے ؟ ——— بھیا کے سواروں میں ایک مسلمان بھی تو ہے شجاع !

وہ بولی ۔

" ہاں ہے یہیں حویلی کے پاس ہی تو اس کا مکان ہے ——— وہ رہا

امرت کور نے کہا۔

"تو پھر اسی سے جاکر کہدے کہ جب تک قیدی ہمارے ہاں ہے، وہ افطار و سحر، اور پھر عید کے بعد دونوں وقت کھانا اپنے ہاں سے پکوا کر یہاں بھجوایا کرے، جو دام ہوں گے وہ ہم دے دیں گے!"

حبیب خاں نے کہا۔

"آپ کیوں یہ زحمت گوارا کرتی ہیں، جو کچھ مجھے ملتا ہے، میں بڑے شوق سے اُسے کھا لیتا ہوں!"

کنیز جاتے جاتے ٹھٹک گئی۔

سروجنی نے پوچھا۔

"تو روز قیدی کو کھانے کے لئے کیا دیتی ہے؟"

وہ بولی،

"ایک آب خوردہ پانی، اور دو سوکھی جو کی روٹیاں!"

سروجنی نے کہا۔

"بھلا یہ قیدی صاحب کچھ بے وقوف ہیں کہ اتنا اچھا کھانا چھوڑ کر اپنے مسلمان کے ہاں کا مزیدار تو کھانا کھائیں ——— ؟ خبردار اب ہو گئی شجاع کے ہاں اُبس یہی راتب ٹھیک ہے!"

امرت کور نے گھور کر کنیز کو دیکھا اور کہا۔

"تو نے سنا نہیں میں نے کیا کہا ہے؟"

وہ کان دبا کر شجاع کے ہاں چلی گئی! ——— اور سروجنی ہنسنے لگی!

باب ۱۹

سروجنی کی شرارتیں

ایک ہفتہ سے زیادہ کی مدت گزر چکی تھی، کرتار سنگھ اب تک نہیں آیا تھا، حبیب خاں بدستور محبوس و مقید تھا، امرت کور اس کی نگراں اور ذمہ دار تھی۔ شجاع کے ہاں سے کھانا آتا تھا اور وہی اس کو دیا جاتا تھا، جو کی سوکھی روٹیوں اور ایک آبخورہ پانی کا سلسلہ بند ہوچکا تھا، قید وہ اب بھی تھا، لیکن برتاؤ میں تبدیل ہوچکی تھی، اور کرتار سنگھ کی واپسی تک اس انتظام میں تبدیلی کا بظاہر کوئی امکان نہیں تھا

سروجنی اکثر امرت کور کے پاس روزانہ آیا کرتی تھی، ان دونوں میں بڑی گہری دوستی تھی، اور اس دوستی کی بنیادیں بڑی مستحکم تھیں، سروجنی اور امرت کور کی ماں اگرچہ ہندو اور سکھ تھیں۔ لیکن دونوں میں بچپن کی دوستی تھی، دونوں ایک ہی گاؤں کی رہنے والی تھیں، سروجنی اور امرت کور کے باپ آپس میں گہرے دوست تھے۔ اور دونوں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں ملازم تھے اور ان دونوں کی وفات کے بعد دونوں کے لڑکے ——— کرتار سنگھ اور دولت رام ——— مہاراجہ کے اور زیادہ مقرب اور معتمد ملازم بن گئے اور اب سروجنی اور امرت کور کی دوستی عہد شباب کو پہنچ چکی تھی، دونوں اگر ایک دن بھی ایک دوسرے کو نہ دیکھیں تو بیقرار ہوجاتی تھیں، یہی وجہ تھی کہ دونوں کا وقت زیادہ تر ساتھ ساتھ گذرتا تھا، امرت کور اپنے آپ کو لئے دیئے رہتی تھی، وہ باوقار اور نستعلیق بھی زیادہ تھی، سروجنی بڑی چنچل، بڑی شوخ اور شریر تھی، ماں باپ کے سامنے بھی سنجیدہ بیٹھنا اس کے لئے ناممکن ہوجاتا تھا، اور امرت کور کے سامنے پہنچکر تو وہ پھلجڑی بن جاتی تھی، ایسی ایسی ہنسنے ہنسانے

والی باتیں کرتی تھی کہ پیٹ میں بل پڑ پڑ جاتے تھے۔ جب تک وہ رہتی عجیب چہل پہل اور رونق کی کیفیت طاری رہتی، اس وقت بھی وہ یہیں براجمان تھی، اس نے امرت کور سے پوچھا :-

کہئے آپ کے قیدی صاحب کا کیا حال ہے ؟

امرت کور نے منہ بنا کر جواب دیا۔

میں نہیں جانتی ——— ایسا ہی اشتیاق ہے، تو جاؤ مل لو جاکر، تسلی پا جائے گا تمہارا قلب ناصبور!

سروجنی :- شکریہ اس نوازش کا لیکن میری جاتی ہے پیزار جاؤ تو۔ تم جاؤ!

امرت کور :- (مسکرا کر) تم تو لڑنے لگیں ———!

سروجنی :- اور نہیں تو کیا ——— اگر یہ راز کی بات انہیں معلوم ہوگئی تو میری چوٹی سلامت رہے گی ؟

امرت کور :- کسے معلوم ہوگئی ——— مہندر کو ؟

سروجنی :- (مصنوعی طور پر اترتے ہوئے) ہاں ——— جانتی تو ہو بڑے ظالم اور غصہ ور ہیں۔

امرت کور :- (ہنستے ہوئے) ہاں خوب جانتی ہوں، لیکن کیا وہ تجھ پر بھی غصہ کریں گے ؟ تجھ پر بھی ظلم کریں گے !

سروجنی :- وہ کون سے ایسے فرشتہ ہیں آخر ہیں تو مرد ہی اور مرد سب ایک !

امرت کور :- یعنی ظالم ——— کیوں ———؟

سروجنی :- ہاں بھئی ہاں، اب ہماری زبان زیادہ نہ کھلواؤ ورنہ نہ جانے کیا نکل جائے گا۔ ہمارے منہ سے !

امرت کور :- وہ بھی ہم بڑے شوق سے سنیں گے !

اتنے میں ایک خوان سر پر رکھے ہوتے امرت کور کی کنیز لاڈو اس طرف سے گزری،

سروجنی نے وہیں سے للکارا،

"کہاں جاتی ہے ادھر آ!"

لاڈو قریب آکر کھڑی ہوگئی،

"جی حکم!"

سروجنی نے کہا۔

"یہ کھانا کس کے لئے جارہی ہے؟ ——— قیدی کا؟"

لاڈو نے جواب دیا۔

جی ہی کا ———!

سروجنی نے اشتیاق کے ساتھ کہا۔

"کھول یہ خوان، ذرا دیکھوں تو کیا کیا ہے!"

لاڈو نے مسکراتے ہوئے تعمیل ارشاد کی، خوان کھول دیا، کئی قسم کا اچھا اچھا کھانا موجود تھا۔ سروجنی نے خوان ڈھک دیا اور لاڈو سے کہا۔

"جا لے جا!"

لاڈو کے جانے کے بعد وہ کہنے لگی،

"کیوں جناب یہ حرکتیں؟"

امرت کور نے انجان بن کر کہا۔

سروجنی:۔ یہ کھانا ایک قیدی کا تھا ———؟ سچ کہتی ہوں ایسا کھانا تو میں روز کھانے کو تیار ہوں ———!

امرت کور:۔ تم تو ہمیشہ سے بدنیت ہو، کھانے کے معاملہ میں جہاں کوئی اچھی چیز دیکھی اور رال ٹپک پڑی،

سروجنی :۔ یہ ترپال کھا کر تو قیدی صاحب بہت مٹا گئے ہوں گے ؟

امرت کور:۔ میں نہیں جانتی، ارے بھئی ایسا ہی شوق ہے تو جاؤ مل آؤ جاکر دیکھ آؤ جی بھر کے

سروجنی :۔ تم بھی چلو !

امرت کور :۔ میں کیا کروں گی جاکر ؟

سروجنی :۔ اونہ، ہر بات میں ضد نہیں کرتے، چلو تو ابھی آ جائیں گے ؟

امرت کور :۔ تم چلو میں آتی ہوں ابھی ،

سروجنی :۔ تو ساتھ چلنے میں کیا حرج ہے !

امرت کور :۔ ذرا موقع مل جائے تم دونوں کو اطمینان سے باتیں کرنے کا !

سروجنی :۔ (مصنوعی غصہ سے) پھر وہی باتیں ؟

امرت کور :۔ اچھا خفا نہ ہو، چلتی ہوں !"

دونوں ساتھ ساتھ حبیب خاں کے مجلس میں پہنچیں، حبیب خاں اس وقت کسی گہری فکر میں مستغرق تھا، اس کی حالت اور صحت پہلے کے مقابلہ میں واقعی بہتر ہو گئی تھی، لیکن اس کے چہرے پر اداسی اور افسردگی تھی، اضمحلال اور فکر کے آثار موجود تھے، وہ کچھ کھویا کھویا سر جھکائے بیٹھا تھا، نہ جانے کیا سوچ رہا تھا، نہ جانے کس عالم میں تھا، سروجنی اور امرت کور اس کے پاس جا کھڑی ہوگئیں، لیکن اسے پتہ بھی نہ چلا کون آیا ہے ؟ اور کون سر پر کھڑا ہے کچھ دیر تامل کے بعد سروجنی نے کھنکھار اکھنکھار کی آواز سن کر حبیب خاں چونکا، امرت کور کو دیکھ کر وہ یکدفعہ کھڑا ہوگیا، سروجنی نے کہا۔

"اب کیسے ہو ؟"

حبیب خاں :۔ اچھا ہوں، خدا کا شکر ہے، احسان ہے !

سروجنی :۔ اس حال میں بھی خدا کا شکر ادا کرتے ہو !

حبیب خاں :۔ خدا کا شکر ہر حالت میں واجب ہے۔

سروجنی:۔ اگر تمہیں پھانسی دے دی جائے۔گولی سے اڑا دیا جائے تو بھی ؟
حبیب خاں:۔جی ہاں میں جب بھی خدا کا شکر ادا کروں گا ،
سروجنی:۔ جھوٹے ہو۔
حبیب خاں:۔ (خفیف سے تبسم کے ساتھ) تو ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے ۔ گولی مار کر ، یا زہر پلاکر دیکھ لیجئے ؟
سروجنی:۔ (ہنستے ہوئے) واقعی تمہاری شامت آئی ہے ،
حبیب خاں:۔ وہ تو اسی دن آگئی تھی جس روز میں گرفتار ہوکر یہاں آیا تھا ، جب سے (امرت کور کی طرف معصوم نظروں سے دیکھ کر) آپ نے اس جہنم سے نکال کر مجھے یہاں رکھا ہے وہ ذرا ٹل گئی ہے ، لیکن جانتا ہوں کہ جس روز سردار کرتار سنگھ واپس آئے اس دن میری خیر نہیں ہے۔
امرت کور:۔ نہیں قیدی تم ایسا خیال نہ کرو ،
سروجنی:۔ (ہنستے ہوئے) انہیں تکلیف ہوتی ہے ، جب تم اس طرح باتیں کرتے ہو!
یہ کہہ کر وہ مسکرانے لگی اور اس نے شریر آنکھوں سے امرت کور کی طرف دیکھا ، لیکن اس کی چڑھی ہوئی تیوریاں دیکھ کر خاموش ہوگئی ،
امرت کور:۔ تمہیں کھانے وغیرہ کے سلسلہ میں کوئی تکلیف تو نہیں ہے !
سروجنی:۔ اگر ہو تو بتاؤ ، فوراً اس کا تدارک کیا جائے گا ،
حبیب خاں:۔ (امرت کور سے مخاطب ہوکر) جی نہیں آپ کی اس کرم گستری کے بعد تکلیف کا کیا سوال ہے ، میں بہت آرام سے ہوں !
امرت کور:۔ کھانا خراب تو نہیں آتا ——————— ؟
سروجنی:۔ اگر خراب ہوتا ہو بتاؤ ہم پکانے والے کے کان اینٹھیں گے اور اسے عبرت انگیز سزا دیں گے ۔

حبیب خاں :۔ (امرت کور کی طرف دیکھ کر) جی نہیں کھانا تو بہت عمدہ ہوتا ہے اور اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ سب کا سب مجھ سے کھایا بھی نہیں جاتا۔

امرت کور :۔ لیکن اس وقت تو تم نے کچھ بھی نہیں کھایا، ویسا کا ویسا رکھا ہے!

حبیب خاں :۔ جی ہاں ——— آج میں نہیں کھاؤں گا!

سروجنی :۔ یہ کیوں؟ کیا اب بھی روزہ سے ہو؟

حبیب خاں :۔ جی ہاں روزہ سے تو ہوں،

امرت کور :۔ اب تو رمضان کا مہینہ ختم ہو چکا!

حبیب خاں :۔ جی ہاں ختم تو ہو چکا لیکن ویسے بھی کبھی کبھی رکھ لیتا ہوں ———!

امرت کور، حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی، سروجنی نے پوچھا :۔

کیا تم یہاں روزے رکھنے کے لئے آتے ہو؟

میں اگر کھانا مانگوں تو آپ اعتراض کر سکتی ہیں، لیکن نہ کھاؤں تو آپ کا کیا ہرج ہے ———؟

امرت کور :۔ یہ تو ٹھیک ہے ہمیں تمہارے روزے پر کوئی اعتراض نہیں، لیکن جس دن رکھنا ہو بتا دیا کرو!

سروجنی :۔ ہاں تاکہ تمہاری سحری اور افطار کا بندوبست کر دیا جایا کرے ———؟ ہم چاہتے ہیں تم اس گھر کو اپنا گھر سمجھو، تکلف کیسا؟

یہ کہہ کر سروجنی پھر مسکرا دی، لیکن امرت کور کی سنجیدگی اور حبیب خاں کی معصومیت نے اسے یارائے تکلم نہ دیا۔

امرت کور نے لاڈو سے کہا۔

لاڈو، قیدی کے افطار کا انتظام کر دینا!"

حبیب خاں :۔ آپ کیوں زحمت فرماتی ہیں، افطار کے لئے نمک کی ایک ڈلی اور ایک

گلاس پانی کا کافی ہے۔

امرت کور:۔ واہ یہ بھی کوئی بات ہوئی ———— شربت کا ایک گلاس کچھ اتنا قیمتی تو نہیں ہوتا۔

سروجنی:۔ اور اگر ہو بھی تو ہم کس خدمت سے باہر ہیں۔ ؟ ———— ہوا کرے۔

حبیب خاں:۔ شکریہ نوازش!

سروجنی:۔ کافی مہذب آدمی معلوم ہوتے ہو، ہم نے تو شروع میں تمہیں بالکل جانگلی سمجھا تھا!

حبیب خاں:۔ آپ نے پہلے جو کچھ سمجھا تھا، وہی صحیح رائے تھی،

سروجنی:۔ ارے تم تو خفا ہو گئے، اچھا ہم اپنے الفاظ واپس لیتے ہیں ————!

حبیب خاں:۔ آپ مجھے بہت زیادہ شرمندہ کرتی ہیں۔

سروجنی:۔ لیکن کھلا پلا کر اس کی داد نہ دو گے، تم کہاں تھے! اور ہم نے تمہیں کہاں پہنچا دیا؟

حبیب خاں:۔ امرت کور پر ایک ممنون نظر ڈال کر) میں جب تک زندہ ہوں آپ کا شکرگزار ہوں گا!

سروجنی:۔ ہم تو یہ سوچ کر آئے تھے تمہاری حالت اور صحت پہلے سے بہتر ہوگی، لیکن ہم نے تو آج تمہیں بہت زیادہ رنجور اور غمگین پایا، ضرور اس کا کوئی سبب ہوگا؟

حبیب خاں:۔ جی کوئی خاص سبب تو نہیں، کبھی کبھی ماحول کی یکسانیت سے جی گھبرا اٹھتا ہے۔

سروجنی:۔ ہاں یہ تو تم سچ کہتے ہو، ہمیں تم سے ہمدردی ہے، لیکن ہم تمہیں رہا کر دیں یہ نہیں ہو سکتا، اپنی جان بھی سب کو عزیز ہوتی ہے۔

حبیب خاں:۔ (ایک عزم کے ساتھ) میں نے رہائی کی التجا اور استدعا تو کبھی نہیں کی، میں ہرگز نہیں چاہتا کہ آپ مجھے رہا کر دیں ———— یہ خیال آپ کے

۔ دل میں کیسے آیا ؟

سروجنی :۔ رسٹ پٹاکر، کیا خیالات کی آمدورفت پر بھی پابندی عائد کی جا سکتی ہے ؟

حبیب خاں :۔ نہیں ——————— لیکن الفاظ کے استعمال پر تو ہر شخص کو خود رضاکارانہ پابندیاں عائد کر دینا چاہئیں، تاکہ کوئی غلط اور غلط فہمی پیدا کرنے والی بات اس کے منہ سے نہ نکل جائے ۔

سروجنی :۔ غلط ——————— یہاں تک تو ٹھیک ہے، لیکن غلط فہمی پیدا کرنے والی بات سے تمہارا کیا مطلب ہے ! ان باتوں سے غلط فہمی کیسے ہو سکتی ہے ؟

حبیب خاں :۔ رامرت کور کی طرف اشارہ کرکے، میں مانتا ہوں، آپ نے مجھ پر احسان کیا ہے اور بغیر میری التجا او دراستد عا کے کیا ہے، یہ آپ کی شرافت، عالی ظرفی اور انسانیت دوستی کی دلیل ہے، لیکن میں نے ایک لمحہ کے لئے بھی یہ بات نہیں سوچی کہ آپ کی اس کرم گستری، بندہ نوازی سے ناجائز فائدہ اٹھاؤں ——————— !

امرت کور :۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو قیدی ——————— ؟

حبیب خاں :۔ میں چاہتا ہوں، آپ مجھے اس آہنی کٹہرے میں پہنچا دیں جہاں سے میں یہاں لایا گیا ہوں !

امرت کور :۔ یہ کیوں آخر ؟

حبیب خاں :۔ رسروجنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، انہوں نے جو کچھ رہائی کے بارے میں کہا ہے، اس سے آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ میں آپ کی نوازش سے ناجائز فائدہ اٹھانے پر تل گیا ہوں ۔ آپ نے ایک کرم مجھ پر یہ کیا کہ وہاں سے یہاں لے آئیں، دوسرا کرم یہ ہونا چاہیئے کہ مجھے رہا کر دیں، اگر یہ خیال آپ کے دل میں آیا تو میں خود اپنی نظر میں اور آپ کی نظر میں کتنا ذلیل ہو جاؤں گا

میں اسے گوارا نہیں کر سکتا!

امرت کور:۔ (مسکراکر) نہیں یہ بات نہیں ہے! یہ سروجنی جو کچھ کہتی ہے خود اسے معلوم نہیں ہوتا کہ کیا کہہ رہی ہے ———————۔

اور پھر وہ مسکراتی ہوئی سروجنی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر واپس چلی گئی!

باب ۲۰

وہ جُھکی جُھکی نگاہیں!

امرت کور نے حبیب خاں کے سامنے تو سروجنی سے کچھ نہیں کہا، لیکن اپنے کمرہ میں آکر اس کی خوب خبر لی،

"میں کہتی ہوں، آخر تمہاری زبان چپ کیوں نہیں رہتی؟ ہر وقت ٹر ٹر کیوں کیا کرتی ہو؟

سروجنی نے مسکرا کر کہا۔

عادت جو ہے ـــــــــ تمہاری عادت ہے خاموش رہنا، ہماری عادت ہے بک بک کرنا، تم اپنی خو نہ چھوڑ دگے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں!"

امرت کور:۔ لیکن آج تو اس تیز کلامی کا مزہ مل گیا نا خوب ـــــــــ!

سروجنی:۔ دانجان بن کر) کیا ہوا؟

امرت کور:۔ تیدی نے کیسی کھری کھری سنائی، لاجواب ہوگئیں، کچھ بھی نہ بول سکیں، بڑا ترس آیا مجھے تیری بیچارگی پر،

سروجنی:۔ شکریہ اس عنایت کا، آپ کو ترس آیا تو کسی اور پر نہیں، مجھ پر سہی! یہی غنیمت ہے،

امرت کور:۔ سچ کہتی ہوں سروجنی بڑی بے غیرت ہو تم،

سروجنی:۔ کیا ہوا؟ آخر میں بے غیرت کہاں سے ہوگئی؟

امرت کور:۔ اور کیا، ہار ماننا تو تم نے سیکھا ہی نہیں ہے۔

سروجنی:۔ تمہاری طرح اگر میں اس طرح کے بے حقیقت لوگوں سے ہار مان لیا کروں

توسروجنی بن کر رہ چکی ،

امرت کور:۔ پھر وہی باتیں جن کا نہ سر ہے، نہ پیر

سروجنی:۔ کبھی ہم تو اس طرح کی باتیں کرتے ہیں، جس کا جی چاہے سنے ۔ نہ جی چاہے کانوں میں انگلیاں دے لے، روئی ٹھوس لے، بہرا بن جائے!

امرت کور:۔ میرا مطلب یہ ہے ۔

سروجنی:۔ تمہارے کہنے سے اپنی عادت بدل دوں؟

امرت کور:۔ ہاں ——— تم نے غور نہیں کیا ۔ وہ بیچارہ کتنا متاثر نظر آتا تھا ۔

سروجنی:۔ کون بیچارہ ؟ ——— وہی قیدی ؟

امرت کور:۔ ہاں ——— کہہ رہا تھا مجھے پھر اسی آہنی کٹہرے میں بھیج دیجئے ،

سروجنی:۔ تو پھر بھیج دو، منع کس نے کیا ہے ؟

امرت کور:۔ یہ اثر ہوا تم پر اس کی دلدوز باتوں کا ؟

سروجنی:۔ مجھ پر مکر کا اثر ذرا بھی نہیں ہوتا ۔

امرت کور:۔ تمہارے خیال میں قیدی مکار ہے ۔

سروجنی:۔ اول درجہ کا ——— بھلا اس سے بڑھ کر بھی مکاری ہو سکتی ہے کہ کہنے لگا کہ میں اپنی نظر میں ذلیل ہو جاؤں گا ،

امرت کور دیوی کی نظر میں ذلیل ہو جاؤں گا، ہوگا، اور میں کہتی ہوں تو ہے کب نہیں ذلیل، ہوا، ہوا جاسوس، غدار، بے ایمان آنے دو کرتار سنگھ کو اس کی گردن اپنے ہاتھ سے کاٹ کر رقص بسمل کا تماشہ نہ دیکھا ہو، تب کہنا، یہ گستاخ اور دریدہ دہن مجھے سمجھتا کیا ہے ؟ ——— میرا نام سروجنی ہے!

امرت کور:۔ وہاں تو مسکراتی رہیں غصہ یہاں آیا ہے، ہماری سرکار کو ؟

سروجنی:۔ غصہ کا کوئی وقت مقرر ہوتا ہے ،

امرت کور:۔ اور کیا وہ سروجنی ہے جو جب چاہے چمک پڑے!

سروجنی:۔ ہمارا غصہ تو ایسا ہی ہے۔

امرت کور:۔ (مسکراتے ہوئے) تو یہ پھر اترے گا کس طرح؟

سروجنی:۔ جس طرح بخار اپنے وقت پر اتر جاتا ہے، یہ بھی اتر جائے گا۔

امرت کور:۔ (ہنستے ہوئے) لیکن معلوم تو ہو کب اترے گا؟

سروجنی:۔ کیوں کوئی کام ہے؟

امرت کور:۔ ہاں بڑا ضروری،

سروجنی:۔ تو لو اتر گیا، کہو کیا کہنا چاہتی ہو ——— تو یہ کہتے تو ہم ہیں کیا عرض کرنا چاہتی ہو؟

یہ کہہ کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

امرت کور: واقعی کوئی ایسی تدبیر سوچو کہ یہ قیدی رہا ہو جائے۔

سروجنی:۔ (مسکراکر) یہ میں کیا سن رہی ہوں؟

امرت کور:۔ ہاں سروجنی مجھ سے اس کا حال زار نہیں دیکھا جاتا!

سروجنی:۔ جی تو میرا بھی بہت کڑھتا ہے!

امرت کور:۔ تو پھر سوچو نہ کوئی تدبیر ——— ایسی جو کسی طرح پٹ نہ پڑے۔

سروجنی:۔ لیکن ایسی کیا تدبیر ہو سکتی ہے؟

امرت کور:۔ یہ تم جانو، آخر تمہاری یہ تیزی، طراری، ذہانت، اور فراست کس دن کام آئے گی۔

سروجنی:۔ واہ کیا اچھا مصرف سوچا ہے آپ نے میری تیز طراری کا ——— بھر پایا بہن تم سے تو!

امرت کور:۔ یہ کام اس دنیا میں اگر کوئی کر سکتا ہے تو صرف تم!

سروجنی:۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ میں کرنا نہیں چاہتی!

امرت کور:۔ کیوں؟ ——— وجہ یا سبب؟

سروجنی:۔ آخر کیوں کروں؟

امرت کور:۔ کیا ایک انسان پر احسان کرنا کوئی معمولی کام ہے،

سروجنی:۔ ہاں بالکل معمولی، میں اگر احسان کر سکتی ہوں تو صرف امرت کور پر،

امرت کور:۔ یہ کیا کہہ گئیں تم میری سمجھ میں ذرا بھی نہیں آیا!

سروجنی:۔ اگر وہ قیدی رہا ہو جائے کسی طرح تو کیا تم میرا احسان مانوگی!

امرت کور:۔ (کچھ سوچتے ہوئے) ہاں مانوں گی،

سروجنی:۔ کیا تم اس سے محبت کرتی ہو؟

امرت کور کے چہرے کا رنگ بدل گیا،

سروجنی:۔ جواب دو، میں کیا پوچھ رہی ہوں؟

امرت کور:۔ تم احمق ہو بکواس کر رہی ہو!

سروجنی:۔ صرف اس شرط پر میں کچھ کر سکتی ہوں کہ تم محبت کا اقرار کر لو!

امرت کور:۔ ایک انسان کی جان بچانے کے لئے میں جھوٹ بھی بول سکتی ہوں ——— ہاں میں اس سے محبت کرتی ہوں۔

اور پھر خود بھی اس کی نگاہیں جھک گئیں، چہرہ سرخ ہو گیا۔

باب ۲۱

لُٹ گئی نگری دِل کی!

تھوڑی دیر کے بعد سروجنی چلی گئی، اور امرت کور عالم خیال کی سیر کرنے لگی، اس کے سامنے رہ رہ کر حبیب خاں کی تصویر آ رہی تھی، وہ مسلمانوں سے نفرت کرتی تھی، لیکن ایک مسلمان حبیب خاں سے نفرت کرنا اس کے بس سے باہر تھا، وہ اس سے محبّت کرنے لگی تھی، اس جیالے، دلیر، خوب صورت اور بانکے نوجوان کی تصویر اکثر ایسا ہوتا کہ اس کے دل کا پٹ کھول کر اندر جاتی، بیٹھ جاتی اور وہ اس کا خیر مقدم کرنے پر مجبور ہو جاتی، وہ بڑی باوقار اور باکردار لڑکی تھی، رکھ رکھاؤ اور سبھاؤ سے زندگی بسر کرنے کا فن جانتی تھی، آج تک اس نے حبیب خاں کے سامنے کیا سروجنی کے سامنے بھی کوئی ایسی بات نہیں کی تھی، جو اس کے دل کی غمازی کر سکتی اس کے دل کا راز افشا کر سکتی، خود اپنے آپ سے بھی اس نے اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کی، لیکن کامیاب نہ ہو سکی، اس نے بہت ٹالا، بہت باتیں بنائیں طبیعت کو بہتیرا دوسری طرف راغب کیا، لیکن حبیب خاں کا خیال وہ دل سے نہ نکال سکی، اس کا کوئی رازدار نہ تھا، وہ اپنے دل تک کو اپنا رازدار بناتے ہوئے ہچکچاتی تھی، سروجنی نے اپنی فراست اور شرارت سے بہت سی باتیں نہیں بلکہ اس کے انداز و اطوار تاڑ لئے تھے، وہ ہنسی مذاق میں دل لگی کے پیرایہ میں شوخی اور شرارت کے انداز میں اس کی گرفت کرتی رہتی تھی، لیکن وہ اس کے قابو میں اب تک نہ آئی تھی، وہ ہنسی کا جواب دل لگی میں شوخی کا شوخی میں شرارت کا شرارت میں دیتی تھی، لیکن اعترافِ محبت کی جراًت اب تک اس میں پیدا نہیں ہو سکی تھی۔ لیکن اس کی یہ خاموشی ایک بہت بڑے طوفان کو اپنے دامن میں لئے ہوئے تھی۔

سروجنی کے جانے کے بعد اس نے اپنا جی بہلانے کے لاکھ لاکھ جتن کئے لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکی، رہ رہ کر حبیب خاں کی تصویر اس کی چشم تصور کے سامنے نمودار ہوتی تھی، رہ رہ کر اس کے کانوں کے پردہ سے حبیب خاں کے سوز و اثر سے بھرے ہوئے وہ الفاظ ٹکرانے لگتے تھے جنہوں نے اس کے دل کی دنیا تہ و بالا کر دی تھی، کس درد کے ساتھ اس نے کہا تھا، مجھے اس آہنی کٹہرہ میں واپس کر دیجئے، ان بے جان الفاظ میں کتنا درد تھا، کیسا سوز تھا؟

اور پھر وہ سوچنے لگی، کرتار سنگھ کے آنے کے بعد حبیب خاں کا کیا حشر ہوگا؟ اور یہ سوچ کر اس کا دل بلبلا تا کہ اسے جان سے مار دیا جائے گا،

وہ یہی باتیں سوچ رہی تھی کہ لاڈو ہانپتی، کانپتی اس کے حضور میں حاضر ہوئی ——

امرت کور نے اس حالت میں اسے دیکھا تو گھبرا گئی، پوچھا۔

"کیا بات ہے لاڈو، تو اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہے؟"

بڑی مشکل سے اس کے منہ سے الفاظ نکلے،

"مہاراجہ"

امرت کور کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

"کیا ہوا مہاراجہ کو؟ —— زندہ تو ہیں؟"

لاڈو نے ہانپتے ہوئے جواب دیا،

وہ تشریف لائے ہیں۔

یہ سن کر مہاراجہ رنجیت سنگھ اس کے غریب خانہ پر تشریف لائے ہیں، اس کا خون کھولنے لگا، وہ اس شخص کی ہوس پرستی سے بیحد متنفر تھی، جب کبھی آمنا سامنا ہو جاتا کبھی بھی کوئی ایسی بات نہ کہتی، جس سے مہاراجہ کے سوکھے دھانوں میں پانی پڑتا، کرتار سنگھ کی موجودگی میں تو از راہ بندہ پروری وہ کبھی بھی تھوڑی دیر کے لئے تشریف لایا کرتے تھے۔ —— لیکن اس کی عدم موجودگی میں کبھی آئے ہوں یہ آج تک نہیں ہوا تھا، پھر آج کیوں آئے

ہیں ؟ یہ سوچ کر وہ گھبرا گئی ۔ اس سوچ میں تھی کہ لاڈو نے ادب اداب بالائے طاق رکھ کر کہا ۔

چلئے ——————— ۔

امرت کور اٹھ کھڑی ہوئی ، پوچھا ،

"کیا واقعی آئے ہیں ؟"

لاڈو مسکرائی ،

"چلئے دیکھ لیجئے ، چل کر ! میں کچھ جھوٹ تھوڑے کہتی ہوں آپ سے ؟

امرت کور نے نہ اس کے تبسم پر توجہ کی ، نہ اس کے جھوٹ سچ پر وہ سیدھی کرتار سنگھ کی بارہ دری میں پہنچی ، جہاں اس وقت مہاراجہ صاحب رونق افروز تھے ، اور گھر کے تمام چھوٹے بڑے ادب سے دور ایک کونہ میں گردن جھکائے کھڑے تھے ، امرت کور پہنچی تو مہاراجہ پھول کی طرح کھل گئے انہوں نے ایسی نگاہ سے اسے گھورا جس میں شفقت پدری بھی تھی ، اور ہوس کی جھلک بھی ، پھر تبسم کناں ارشاد فرمایا ۔

"امرت کور آؤ بیٹھو ، کہاں تھیں تم ؟"

وہ سر جھکا کر ادب سے بولی ،

"اطلاع ملتے ہی حاضر ہوگئی ، وہاں اپنے کمرہ میں کچھ کام کر رہی تھی ۔"

رنجیت سنگھ :۔ ہاں ——————— یہ تو کہو کرتار سنگھ کب تک آ رہا ہے ؟"

امرت کور :۔ مہاراج مجھے کیا معلوم ؟ یہ تو آپ ہی جانتے ہوں گے ؟

رنجیت سنگھ :۔ (ہنس کر) ہاں ہم جانتے ہیں ——————— وہ بڑا کام کا آدمی ہے ، بڑا ضروری کام کر رہا ہے ، ہمیں اس کی وفاداری اور جاں نثاری پر فخر ہے ، ہم اسے کوہ نور سے بھی زیادہ گراں سمجھتے ہیں !

امرت کور :۔ نوازش ہے آپ کی ،

رنجیت سنگھ :۔ آج ہمیں وہ بہت یاد آ رہا ہے ، جی چاہا تم سے مل لیں ، آخر اس کی بہن ہو ،

امرت کور نے کوئی جواب نہیں دیا، مہاراجہ کو اس کے جواب سے اتنی دلچسپی نہ تھی جس قدر اپنی گفتگو جاری رکھنے سے، انہوں نے فرمایا۔

"یہ تو کہو اس قیدی کا کیا حال ہے؟"

یہ الفاظ بجلی بن کر امرت کور پر گرے!

اس کے دل میں خیال آیا کہ مہاراجہ نے قیدی کے بارے میں بے وجہ سوال نہیں کیا ہے ضرور دال میں کالا ہے، ہو نہ ہو کسی نے مخبری کی ہے اب شاید وہ اس لئے آئے ہیں کہ قیدی کو واپس لے جائیں اور کرتار سنگھ کے آنے تک اپنے ہی پاس نظر بند رکھیں اور ہاں یہ بھی تو ہو سکتا ہے اسے قتل کرنے آئے ہوں، یہیں کسی سپاہی کو حکم دیں اور وہ اس کی گردن مار دے، مہاراجہ کی طبیعت سے آخر بعید کیا ہے۔

یہ سوچ کر اس کا چہرہ سفید پڑ گیا، اس کا دل کانپنے لگا، اب تک وہ مہاراجہ سے بے خائف سے پیش آتی تھی، دفعتہً اس کا انداز بدل گیا، اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جو ہونا چاہئے!"

مہاراجہ کو اس برجستہ جواب پر ہنسی آگئی،

"لیکن اتنی سختیوں کے بعد آخر وہ کچھ بولا بھی!"

امرت کور:۔ یہ تو میں نہیں جانتی بھتیا نے اس پر اس سے زیادہ سختیاں کیں، جتنی کسی انسان پر کی جا سکتی ہیں، مگر اس نے کچھ نہیں بتایا"

رنجیت سنگھ:۔ ہم نے تو پہلے ہی کرتار سنگھ سے کہا تھا، ان تلوں میں تیل نکلنے والا نہیں ہے۔ قتل کر دو اسے!"

امرت کور:۔ (دل ہی دل میں کانپ کر) آپ کی رائے بڑی معقول تھی، لیکن بھتیا کی بات بھی حکمت سے خالی نہیں ہے!

رنجیت سنگھ:۔ بھئی کرتار کی بات میں حکمت کیا ہے بتاؤ؟

امرت کور :۔ وہ کہتے تھے اس کے ذریعے سے دشمن کی بہت سی باتیں معلوم ہو سکیں گی، اور ان سے ہم فائدہ اٹھائیں گے، اس لئے چلتے وقت وہ تاکید کر گئے تھے، اس پر خوب سختیاں کرنا، لیکن جان سے نہ مارنا چاہئے۔

رنجیت سنگھ :۔ (مسکرا کر) تو تم اس پر سختیاں کر رہی ہو؟

امرت کور :۔ (دل میں کانپ کر) ہاں لیکن اس کی جان بچا کر،

رنجیت سنگھ :۔ تم بھائی بہنوں کی یہ حکمت ہماری سمجھ میں تو آئی نہیں، لیکن کرتار سنگھ ہے تیکھے مزاج کا، اس کی عدم موجودگی میں ہم دخل نہیں دینا چاہتے، اس کے کسی معاملہ میں لیکن وہ آئے تو ہم رائے یہی دیں گے کہ اسے قتل کر دیا جائے ——— ہم نے آج تک دشمن کو یا اس کے کسی آدمی کو زیادہ دنوں تک زندہ رہنے کا موقع نہیں دیا —!

امرت کور :۔ مجھے تو تعمیل حکم میں کوئی عذر نہیں، کہیے تو ابھی قتل کر دوں!

رنجیت سنگھ :۔ (ہنستے ہوئے) نہیں نہیں جلدی کی ضرورت نہیں کرتار کو آ لینے دو،

امرت کور :۔ لیکن میں چاہتی ہوں جب بھی آپ اس کے قتل کا حکم دیں تو قتل کی خدمت مجھے سونپی جائے،

رنجیت سنگھ :۔ یعنی تم اسے اپنے ہاتھ سے قتل کرنا چاہتی ہو؟

امرت کور :۔ جی ——— ——— میری یہی آرزو ہے!

رنجیت سنگھ :۔ تمہاری ہر آرزو پوری ہوگی، تمہاری آرزو پوری کرنے کے لئے ہم خود بھی قتل ہو سکتے ہیں، لیکن یہ جذبہ تمہارے دل میں پیدا کیوں ہوا؟

امرت کور :۔ مجھے میدان جنگ میں جانے کی اجازت نہ آپ دیتے ہیں نہ بھیا، حالانکہ میں نے کئی مرتبہ اصرار کیا ———

رنجیت سنگھ :۔ ہاں ہم جانتے ہیں تم نے کئی مرتبہ اصرار کیا، اور اگرچہ ہمارے لئے اس سے بڑھ کر مسرت بخش کوئی بات نہیں کہ جو تم کہو، وہ کریں، لیکن یہی ایک ایسی بات ہے

جسے نہ ہم مان سکے نہ مان سکتے ہیں ؟

امرت کور:۔ کیا صرف اس لئے کہ میں عورت ہوں!

رنجیت سنگھ:۔ نہیں صرف یہ بات نہیں ——— ہم کسی طرح بھی اسے گوارا نہیں کر سکتے کہ تم کسی خطرہ سے دوچار ہو،

امرت کور:۔ اس سے کیا ہوتا ہے ——— کیا میں کوئی موم کی گڑیا ہوں ؟ کیا میں تلوار چلانا نہیں جانتی! ؟

رنجیت سنگھ:۔ جانتی ہو، صرف تلوار ہی چلانا نہیں (مسکرا کر) تیر چلانا بھی، لیکن یہ کام تم گھر میں بیٹھ کر بھی کر سکتی ہو ——— کیا کوئی گردن ایسی بھی ہے جو تمہاری تلوار کا نشانہ بننے سے انکار کر سکے ؟ کیا کوئی سینہ ایسا بھی ہے جو تمہارے تیر سے چھدنا اپنے لئے باعث فخر و ناز نہ سمجھے ؟

کوئی اور وقت ہوتا تو ان باتوں کے جواب میں امرت کور ضرور کوئی ایسی بات کہہ دیتی، جو اگرچہ حد ادب سے باہر نہ ہوتی، لیکن مہاراجہ کا ولولہ پست ہو جاتا، اور پھر وہ گفتگو کا موضوع بدل لیتے، لیکن اس وقت نہ صرف یہ کہ وہ مہاراجہ کا حوصلہ پست نہیں کرنا چاہتی تھی، بلکہ ایک حد تک حوصلہ افزائی کرنا چاہتی تھی تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ خوش اور مسرور ہو کر واپس جائیں۔ اس نے ایک ادا کے ساتھ کہا۔

"آپ تو نہ جانے کیا کیا کہنے لگتے ہیں۔ ہم نہیں جانتے ان باتوں کو!"

مہاراجہ نے تبسم فرمایا اور کہا۔

"ہم کچھ غلط تو نہیں کہتے ——— ؟"

امرت کور:۔ ہم نہیں جانتے آپ سچ کہتے ہیں یا غلط، لیکن بہرحال قیدی کی گردن میری تلوار سے کٹے گی!

رنجیت سنگھ:۔ اگر تم یہ چاہتی ہو تو ضرور ایسا ہوگا ——— لیکن کیوں ؟

امرت کور :- بتا تو رہی تھی، لیکن آپ نے دوسری باتیں شروع کر دیں ۔

رنجیت سنگھ :- (قہقہہ لگاتے ہوئے) اچھا ہم کچھ نہیں کہتے، کہو کیا کہہ رہی تھیں تم!

امرت کور :- میں میدان جنگ میں جا کر دشمن کا سر نہیں کاٹ سکتی، لیکن اگر وہ گھر میں آجائے میرے قبضہ میں ہو تو بھی اس کا خون اگر میری تلوار نہ پئے تو مجھے بڑی کوفت ہو گی۔

رنجیت سنگھ :- (بے انتہا نازاں اور مسرور ہو کر) یہ بات ہے ——— تم ہمارے دشمن کو اپنے ہاتھ سے قتل کرنا چاہتی ہو،

امرت کور :- جی ——— آپ کا دشمن صرف آپ کا دشمن نہیں ہے، پوری سکھ قوم کا دشمن ہے!

رنجیت سنگھ :- سچ کہتی ہو!

امرت کور :- تو پھر آپ وعدہ کرتے ہیں؟

رنجیت سنگھ :- ہاں پختہ وعدہ کرتا ہوں ——— اگر چاہو تو ابھی اس کی گردن اُڑا دو!

امرت کور :- (گھبرا کر) نہیں ابھی نہیں،

رنجیت سنگھ :- کیوں ——— تمہارا وہ جذبہ سرد کیوں پڑ گیا،

امرت کور :- جذبہ تو سرد نہیں پڑا، لیکن بھیا کو آ لینے دیجئے!

رنجیت سنگھ نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور کہا۔

"کرتار سنگھ سے تم بھی ڈرتی ہو؟ ——— اچھا بھئی اچھا آ لینے دو اسے!

امرت کور مسکرانے لگی!

باب ۲۲

پردہ کیا کچھ ہائے کہ جی کو بھا گیا

رنجیت سنگھ اپنے قدم وچشم کے ساتھ واپس چلا گیا، لیکن امرت کور کو ایک عجیب پریشانی میں مبتلا کر لیا۔ اس کی نگاہِ تصور کے سامنے حبیب خاں کی کٹی ہوئی گردن اور تڑپتا ہوا لاشہ تھا، اور وہ دل ہی دل میں لرز رہی تھی۔ کہ آج کی گفتگو کا انجام کیا ہوگا؟ کیا واقعی حبیب خاں قتل کر دیا جائے گا۔ اور اگر ایسا ہوا تو ——— ؟ کیا پھر میں زندہ رہ سکوں گی؟ کیا یہ زندگی پھر میرے لئے کوئی کشش رکھے گی؟

اور سوچنے لگی میں حبیب خاں سے کیوں محبت کرتی ہوں؟

میرا اور اس کا مذہب جُدا ہے، قوم الگ ہے، تہذیب اور معاشرت میں زمین آسمان کا اختلاف ہے، میری اور اس کی مادری زبان بھی مشترک نہیں ہے۔ یہی نہیں ہم دونوں قومی اعتبار سے ایک دوسرے کے دشمن بھی ہیں، لیکن اس کے باوجود میں اس سے محبت کرتی ہوں!

ہاں میں اس سے محبت کرتی ہوں ——— انکار کر ہی نہیں سکتی، چاہوں تو بھی نہیں لیکن کیوں؟

مجھے اس سے کیوں محبت ہے ؟

میں نے اس کی کون سی ایسی بات دیکھی ہے، جس پر دل ہار گئی۔ اور اس طرح ہاری کہ ننگ و ناموس تک کا خیال راستہ کا پتھر بن کر نہیں حائل ہو پاتا؟

لیکن میں نے اس سے محبت کی بھی تو کس وقت؟ جب اس کا آفتاب زندگی لب بام

آچکا ہے، جب اس کے قتل کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں، جب اس کی جان لینے کا فیصلہ ہو چکا ہے جتیار کرتار سنگھ کے ہاتھ سے تو شاید وہ بچ بھی جاتا لیکن رنجیت سنگھ کا فیصلہ اٹل ہوتا ہے، اور وہ فیصلہ کر چکا ہے کہ دشمن قوم کے اس فرد کو کسی قیمت پر زندہ نہیں رہ جانے گا، اس کے اس فیصلہ کو کوئی نہیں بدل سکتا —————— وہ خود بھی نہیں بدل سکتا، اس کی طبیعت ہی کچھ اس طرح کی ہے؟

بار بار دل کو راغب کرتی ہوں کہ اس سے نفرت کرنے لگے، لیکن وہ نفرت نہیں کرتا اور زیادہ محبت کرنے لگتا ہے، کہیں زیادہ بیتابی اور بیقراری کے ساتھ ——————.

چاہتی ہوں اس کا خیال دل سے نکل جائے —————— مگر نہیں نکلتا.

میں اس سے بات نہیں کرتی، اس کے پاس آتی جاتی نہیں اسے دیکھتی نہیں، پھر بھی دل ہے کہ اسے پوچ رہا ہے آخر کیوں؟

مانا کہ وہ حسین ہے لیکن یوسف وقت تو نہیں؟

مانا کہ وہ بہادر اور شجاع ہے، لیکن رستم واسفند یار تو نہیں؟

مانا کہ وہ بانکا اور جیالا ہے لیکن بانکپن کچھ اس پر ختم تو نہیں ہوگیا ہے؟

بار بار دل کو تولتی ہوں اس کا احتساب کرتی ہوں، جائزہ لیتی ہوں، دل جہاں جا کر اٹکتا ہے، وہ صرف اس کا کردار اور اس کی شخصیت ہے ——————!

اس نے آج تک مجھ سے نگاہ ملا کر بات نہیں کی!

اس نے آج تک مجھے نظر بھر کر نہیں دیکھا!

اور پھر اس کی شخصیت —————— کیا میں اسے بھول سکتی ہوں کہ کوڑوں سے اس کا بدن لہولہان ہوگیا لیکن وہ اپنی قوم کے خلاف غداری پر آمادہ نہ ہوا، رہ رہ کر میرے دل میں اس دن کا وہ منظر پھر جاتا ہے جب آہنی سلاخوں کے کٹہرے میں بھی وہ سختیاں جھیلتا رہا لیکن اس نے روزہ نہ توڑا، میرے کہنے سے بھی نہیں، سردجنی کے اصرار سے بھی نہیں.

میں خود بھی ایک بہادر قوم کی گود میں پلی اور بڑھی ہوں، میری آنکھوں نے اس مختصر سی عمر میں بہادری اور شجاعت کے بہت سے رُوح فرسا اور لرزہ خیز مناظر دیکھے ہیں۔ مجھے اپنی قوم پر اپنے پنتھ پر فخر بھی ہے، ناز بھی ہے، لیکن سچ بہر حال سچ ہے، حبیب خاں کی سی آن میں نے آج تک کسی میں نہیں دیکھی ——— یہی چیز ہے جس نے میرا دل چھین لیا، مجھے شکست دی اور میں نے ہار مان لی اور اس ہار پر مجھے فخر ہے۔

لیکن کیا محبت سے بڑھ کر بھی دنیا میں کسی کی حالت قابلِ رحم ہو سکتی ہے، ———

میں اسے چاہتی ہوں محبت کرتی ہوں، اس پر جان دیتی ہوں، لیکن اسے موت کے پنجہ سے نہیں چھڑا سکتی، اس کی جان نہیں بچا سکتی۔ میرے گھر میں میرے سامنے اس کے قتل کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اور میں کچھ نہیں کر سکتی، سوائے بے بسی کے ساتھ ہاں میں ہاں ملانے کے!

اتنے میں گھومتی پھرتی سروجنی آگئی، امرت کور کو اس کے آنے کا پتہ بھی نہیں چلا، اس نے دبے پاؤں آکر پیچھے سے دونوں ہاتھوں سے اس کی آنکھیں بند کر لیں، لیکن فوراً ہی ہاتھ ہٹا لئے

ہائیں آنسو ——— امرت کور تو رو رہی ہے۔

کیا ہوا ———؟

باب ۲۳

کوئی تدبیر بن نہیں آتی !

سروجنی امرت کور سے جتنی زیادہ بے تکلف تھی، اتنا ہی زیادہ اسے چاہتی بھی تھی، اس کی آنکھیں پُرنم دیکھ کر وہ بھی اپنے آنسو ضبط نہ کر سکی، پھر اس نے بڑے پیار اور بڑی اپنایت کے ساتھ اس کے دل کو ٹٹولا اور آخر امرت کور سے اعتراف محبت کرا ہی لیا، یہ اعتراف سروجنی کے لئے نیا تھا لیکن وہ ایک عرصہ سے محسوس کر رہی تھی کہ امرت کور کو حبیب خاں کو چاہتی ہے وہ اس کی ٹوٹے ضبط اور وضع احتیاط سے واقف تھی، لیکن اس کے رازِ پنہاں سے واقف نہ ہو، یہ بات نہ تھی اور آج کے اعتراف نے تو بقول اس کے سارا "بھانڈا" پھوڑ دیا تھا۔

سروجنی نے امرت کور سے کہا،

ہاں کہتی تو سچ ہو، اب حبیب خاں کی جان بچتی نظر نہیں آتی پھر کیا کیا جائے ؟"

امرت کور نے اس کی ذہانت پر طنز کرتے ہوئے کہا ۔

دیسے تو بڑی افلاطون بنتی ہو، لیکن اتنی معمولی سی مشکل بھی نہیں حل کر سکتیں تو، تف ہے تم پر ـــــ میں نہیں جانتی کوئی بھی تدبیر اس کی رہائی کی نکالو، ورنہ تم آخر پھر دوا کس مرض کی ہو۔

سروجنی:- مشکل یہ ہے کہ چوکی پہرہ اتنا سخت ہے کہ قیدی کو بھگا نہیں سکتے :

امرت کور:- یہی تو سب سے بڑی مشکل ہے، ورنہ وہ کب اپنے گھر پہنچ چکا ہوتا اب تک !

سروجنی:- لیکن تم اس کی رہائی کی جو اتنی کوشش کر رہی ہو، یہ تو بتاؤ اس کی جدائی برداشت کر سکو گی !"

امرت کور:- اس کی جان کے مقابلہ میں ہر چیز ہیچ ہے، پہلے وہ بچنی چاہیئے۔ پھر دوسری باتیں

سوچ لی جائیں گی !"

سروجنی :۔ اوہو، آج تو بڑی حکیمانہ باتیں ہو رہی ہیں —————— بہت خوب میں نے ایک تدبیر سوچ لی !"

امرت کور :۔ (خوش ہو کر) سچ ؟ ———— تو بتاؤ پھر ؟

سروجنی : سچ کہتی ہوں، ایسی تدبیر ہے جو پٹ ہی نہیں پڑ سکتی !

امرت کور :۔ تو بتاؤ نا پھر، کیا ہے وہ ترکیب ———— ؟

سروجنی :۔ داد دینا پڑے گی تمہیں میری ذہانت کی،

امرت کور :۔ آخر اپنی تعریف ختم بھی تو کرو مجکو کسی طرح ———— بتاؤ کیا ترکیب سوچی ہے تم نے ؟

سروجنی :۔ وہ ترکیب یہ ہے کہ چلو ہم تم حبیب خاں کو اس بات پر راضی کریں کہ جو کچھ اس سے پوچھا جائے بتا دے !

امرت کور :۔ کیوں بتا دے ؟ ———— اس لئے تاکہ اس کی جان کو خطرہ ہے۔

سروجنی :۔ ہاں اور کیا ———— کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی وجہ ہو سکتی ہے ؟

امرت کور :۔ اگر اسے اپنی جان کی پروا ہوتی تو پہلے ہی دن بتا دیتا، سب کچھ ! اب تمہارے یا میرے کہنے سے وہ کیوں اپنی راز کی باتیں بتا دے گا، بڑی ذہین بنتی ہو، لیکن اتنی معمولی سی بات سمجھ میں نہیں آتی !

سروجنی :۔ (کچھ سوچتے ہوئے) ہاں بات تو ٹھیک ہے پھر،

امرت کور :۔ یہ میں بتاؤں ؟

سروجنی :۔ اس کی جان بچنے کی صرف یہی صورت ہے کہ سب کچھ اگل دے !

امرت کور :۔ ناممکن ہے میں اس کے مزاج کو پہچان چکی ہوں وہ گردن کٹا لے گا۔ مگر ایسا نہیں کرے گا

سروجنی :۔ جھوٹ موٹ، انٹ سنٹ کہہ دے جو چاہے، کسی طرح جان تو بچے، پھر دیکھا جائے گا

امرت کور:۔ گردن ہلاتے ہوئے) نا — یہ بیل بھی منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی!

سروجنی:۔ یہ کیوں؟ اس میں کیا قباحت ہے؟

امرت کور:۔ کیا تم سچ کہتی ہو، سمجھتی ہو وہ انٹ سنٹ باتیں کرنے پر رضامند ہو جائے گا؟ فرض کرو
ہو بھی جائے، راضی تو کیا اس طرح اس کی جان بچ جائے گی؟

سروجنی:۔ ضرور بچ جائے گی۔

امرت کور:۔ نہیں ———— وہ سچ کہے یا جھوٹ، رہا اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا، جب
تک یہ جنگ نہ ختم ہو جائے اور اس اثنا میں ضرور جھوٹ کی قلعی کھل جائے گی، اور پھر وہ
بہت زیادہ اذیتیں دے کر ہلاک کیا جائے گا۔

سروجنی:۔ کچھ سوچتے ہوئے) ہاں یہ بھی سچ ہے ———— (سر کھجاتے ہوئے) آخر پھر کیا کیا
جائے اس شخص کے لئے؟ یہ تو ہمارے لئے مفت کا دردِ سر بن گیا ہے۔

امرت کور:۔ (برا مانتے ہوئے) ایسا نہ کہو اگر کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تو خاموش رہو، کچھ نہ
کرو، مگر ایک بے گناہ شخص کو برا بھلا کہنے سے کیا فائدہ؟

سروجنی:۔ (ہنستے ہوئے) او ہو بہت برا لگا آپ کو۔

امرت کور:۔ بات تو ایسی ہی تھی جو بری لگے!

سروجنی:۔ تو پھر کوئی ایسی تدبیر کرو کہ وہ بھاگ جائے۔

امرت کور:۔ (مسکراتے ہوئے) تدبیر تو میں شوق سے کروں، لیکن کیوں کر؟ یہ بھی تو بتاؤ!

سروجنی (منہ بنا کر) سچ کہتی ہوں درد ہونے لگا سر میں سوچتے سوچتے؟ کہیں میں پاگل نہ ہو جاؤں

امرت کور: اچھا ہو مت زیادہ، معلوم ہو گئی آپ کی حقیقت، اپنا کام آپ ہی خوب ہوتا
ہے، تم کچھ نہ کر سکیں، ہم کر کے دکھائیں گے ——!

باب ۲۴

آنکھیں چار ہوئیں اور جھک گئیں

جو بات امرت کور نے اب تک نہیں کی تھی، وہ آج اس سے سرزد ہوئی!

اب تک وہ حبیب خاں سے تنہا نہیں ملی تھی ——— آج ملی ——! !

اب تک حبیب خاں سے اس نے خود سے کوئی گفتگو نہیں کی تھی آج کی!

کافی رات گزر چکی تھی، گھر کے لوگ سو چکے تھے، حویلی کے پھاٹک پر —— مسلح سپاہی پہرہ دے رہے تھے، امرت کور جاگ رہی تھی، وہ اٹھی جیسے ہی وہ اٹھی لاڈو آ کر اس کے پاس کھڑی ہو گئی، امرت کور نے اس سے کچھ نہ کہا، لیکن وہ سایہ کی طرح اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی ایک مدھم سی شمع لاڈو کے ہاتھ میں تھی، آہستہ آہستہ قدم رکھتی ہوئی دونوں حبیب خاں کے مجلس میں پہنچ گئیں، وہ فرش پر لیٹا کروٹیں بدل رہا تھا، نیند اس کی آنکھوں سے اڑی تھی۔ اور یہ کوئی نئی بات نہ تھی، کسی روز بھی جب سے وہ گرفتار ہوا تھا اپنی نیند نہ سو سکا، جب رات کا سناٹا ہوتا اور گھر کے لوگ سو جاتے، اور وہ بھی نماز عشا سے فارغ ہو کر سونے کی تیاریاں کرتا، تو طرح طرح کے خیالات اس کے دماغ میں آنے لگتے، اور بڑی دیر تک کروٹیں بدلنے کے بعد کہیں نیند آتی، آج بھی وہ حسبِ معمول سونے کی ناکام کوشش کر رہا تھا کہ اسے پہلے تو ہلکی سی روشنی نظر آئی۔ پھر قدموں کی چاپ سنائی دی، پھر دو سائے اپنی طرف بڑھتے نظر آئے، اس نے غور کر کے دیکھا تو امرت کور اور لاڈو کو پہچان لیا۔

خود بخود اس کے دل میں خیال آیا،

"اتنے ناوقت، یہ کیوں آ رہی ہیں؟"

مگر کوئی جواب سمجھ میں نہ آیا، اتنے میں امرت کور سامنے آکر کھڑی ہوگئی، حبیب خاں بھی اٹھ کر کھڑا ہوگیا، امرت کور نے اس سے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"تم نے کھانا کھا لیا قیدی؟"

وہ بولا۔

"جی ہاں بہت دیر ہوئی کھا چکا!"

امرت کور:۔ تمہیں کوئی تکلیف یا شکایت تو نہیں ہے؟

حبیب خاں:۔ جی بالکل نہیں میں آپ کا شکریہ نہیں ادا کر سکتا، آپ کے بار احسان سے میری گردن جھکی ہوئی ہے!

امرت کور:۔ ایسی باتیں کر کے تم ہمیں شرمندہ کرتے ہو!

حبیب خاں:۔ لیکن یہ میرے دل کی آواز ہے!

امرت کور:۔ تم اب تک سوئے نہیں ——— ؟

حبیب خاں:۔ مجھے نیند بہت دیر میں آتی ہے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آتی ہی نہیں

امرت کور:۔ کیوں ——— ؟ شائد گھر تمہیں بہت یاد آتا ہے؟

حبیب خاں:۔ کیونکر انکار کروں؟ ——— یقیناً بہت یاد آتا ہے، وہ بوڑھی ماں جس کی تمناؤں اور آرزوں کا مرکز صرف میری ذات ہے، وہ بوڑھا باپ جو اندھا ہو چکا ہے اور جس کا عصائے پیری میں ہوں، وہ چھوٹے بھائی اور بہن جن کی خوشیوں اور مسرتوں کا سہارا صرف میں ہوں ——— سوچتا ہوں میرے پیچھے ان سب کا کیا حال ہو رہا ہوگا!

امرت کور:۔ خود تمہارے کوئی اولاد نہیں ——— ؟

حبیب خاں:۔ نہیں میں نے ابھی شادی نہیں کی،

امرت کور:۔ تمہارے پیچھے تمہارے باپ، ماں، بھائی اور بہن کا کفیل کون ہوگا۔

جبیب خاں :۔ یوں تو ماشاءاللہ میرا کنبہ بہت بڑا ہے، چچا زندہ ہیں، خالو موجود ہیں چچازاد اور ماموں زاد پھوپھی زاد بھائی ہیں اور یہ سب اپنے سینہ میں محبت بھرا دل رکھتے ہیں یقیناً یہ خبر لیتے ہوں گے، لیکن سب سے بڑا سہارا خدا ہے، میں اس پر انہیں چھوڑ کر آیا ہوں!

امرت کور :۔ آخر ان سب کو اس حالت میں چھوڑ کر تمہیں گھر سے نکلنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟

جبیب خاں :۔ فرض، ذاتی قرابت مندیوں، رشتوں اور عزیزداریوں سے بہت اونچا ہے!

امرت کور :۔ عجیب بات کہہ رہے ہو تم!

جبیب خاں :۔ ممکن ہے یہ بات آپ کو عجیب معلوم ہوتی ہو، لیکن غلط نہیں ہے، جب میری قوم پر تباہیوں کے بادل منڈلا رہے ہوں، جب میری ملت ہلاکت کا نشانہ بن رہی ہو جب میرا مذہب خطرہ میں ہو، میں کیونکر چین کی زندگی بسر کر سکتا ہوں؟ یہ کیونکر ممکن ہے کہ میں گھر میں بیٹھا رہوں، قوم، ملت اور مذہب پر مجھے میرے باپ کو، میری ماں کو میرے بھائی کو اور بہن کو، میرے سارے خاندان کو قربان ہو جانا چاہیے، اگر قوم باقی ہے تو ہم سب کا وجود باکار ہے، قوم نہیں تو ہم زندہ رہ کر کیا کریں گے؟ ـــ زندگی وہ اچھی جو آبرو اور عزت، وقار اور عظمت کی زندگی ہو، وہ زندگی موت سے بدتر ہے جو غلامی ذلت اور رسوائی کی زندگی ہو،

امرت کور :۔ ہاں یہ تو ٹھیک ہے، لیکن تم اکیلے کیا کر دگے؟

جبیب خاں :۔ بارش کا پہلا قطرہ اگر یہ سوچے کہ میں اکیلا سوکھے کھیتوں کو ہریالی نہیں عطا کر سکتا، سوکھی زمین میں سرسبزی نہیں پیدا کر سکتا، پھولوں کی مہک باغ و چمن کی رعنائی کلیوں اور شگوفوں کی زیبائی مجھ اکیلے دم سے قائم نہیں رہ سکتی، تو یقین کیجئے، نہ بارش ہو، نہ دنیا میں کہیں سرسبزی و شادابی نظر آئے، لیکن اسی ایک قطرہ کی دیکھا دیکھی پھر قطروں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور ساری دنیا ایک نئی زندگی سے

روشناس ہو جاتی ہے، میں اکیلا ہوں، میرے ساتھی بہت کم ہیں، جو سرفروش کفن سر سے باندھ کر میدان جہاد میں اترے ہیں، ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے، لیکن ہمارے فنا ہونے، مٹنے اور ختم ہونے کے بعد یقیناً دوسرے لوگ ہماری جگہ لیں گے، اور پھر یہ سلسلہ قائم ہو جائے گا، اور اس وقت تک قائم رہے گا، جب تک حق کامیاب نہ ہو جائے، اور باطل ناکام نہ ہو جائے۔ خواہ اس میں کتنی ہی دیر لگے، کتنا ہی وقت صرف ہو

امرت کور:۔ کچھ تمہیں خبر بھی ہے یہاں تمہارے بارے میں کیا فیصلہ ہو چکا ہے،

حبیب خاں:۔ میں نہیں جانتا،

امرت کور:۔ آج مہاراجہ آئے تھے اور وہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ تمہیں ہلاک کر دیا جائے۔

حبیب خاں:۔ یہ، مجھے پہلے سے معلوم تھا کہ ایسا ہوگا!

امرت کور:۔ پھر اب کیا ہوگا؟

حبیب خاں:۔ رہے پروائی سے، دنیا کے کروڑوں آدمیوں میں سے ایک آدمی کم ہو جائیگا۔

امرت کور:۔ بس صرف یہی؟

حبیب خاں:۔ جی ہاں، اور یہ بہت معمولی بات ہے!

امرت کور:۔ تمہارے نزدیک!

حبیب خاں:۔ آپ کا کیا خیال ہے۔

امرت کور:۔ اگر ایسا ہوا تو دنیا ایک بہت اچھے بڑے اونچے اور نہایت بلند کردار انسان کے وجود سے محروم ہو جائے گی، ایسا نہیں ہونا چاہیئے ———!

حبیب خاں:۔ یہ آپ کا حسنِ ظن ہے، آپ خود بہت اچھی ہیں، اس لئے آپ کو دوسروں میں بھی اچھائی کے پہلو نظر آتے ہیں ———!

ورنہ میں کہتا ہوں اسے کوئی مہاراجہ یا سردار کرتار سنگھ سے پوچھے! وہ میرا وجود نہیں برداشت کر سکتے ———!

امرت کور :۔ ہاں یہ تو اپنی اپنی رائے ہے!

حبیب خاں :۔ یہی میں بھی عرض کر رہا تھا، آپ چاہتی ہیں کہ میرا وجود قائم رہے، لیکن آپ بھی اس معاملہ میں اتنی ہی بے بس ہیں، میں اس کے لئے تیار ہوں، انشاء اللہ ہنسی خوشی اپنی جان اپنے دین اور ملّت پر قربان کروں گا ——————!

امرت کور :۔ ہاں یہ سچ ہے کہ تمہارے قتل کا فیصلہ ہو چکا ہے، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ تمہاری رہائی کا فیصلہ بھی ہو چکا ہے۔ قتل کا فیصلہ رنجیت سنگھ نے کیا ہے اور رہائی کا ہم نے!

حبیب خاں :۔ لیکن نافذ وہ فیصلہ ہوگا، جو رنجیت سنگھ کا ہے!

امرت کور :۔ نہیں —————— وہ فیصلہ نافذ ہوگا جو ہمارا ہے۔ ہم اسی لئے آئے ہیں کہ تمہیں رہا کر دیں، ہم نے سارا انتظام کر لیا ہے لاڈو کو جانتے ہو نا، یہ ہماری جاں باز اور وفادار سہیلی ہے، اس نے سارا انتظام مکمل کر لیا ہے۔ —————— تیار ہو جاؤ، یہاں سے جانے کے لئے!

حبیب خاں :۔ آپ کے احسانات ویسے بھی کچھ کم نہ تھے، لیکن آج کا احسان تو ایسا ہے کہ اس کے شکریہ کے لئے الفاظ نہیں ملتے، لیکن میں آپ کے اس کرم سے فائدہ نہیں اٹھا سکوں گا!

امرت کور :۔ (حیرت سے) کیا مطلب؟ کیا تم رہا ہونا نہیں چاہتے؟

حبیب خاں :۔ میں اتنا بے حمیت نہیں ہوں کہ خود رہا ہو کر آپ کو خطرہ میں ڈال دوں، میری رہائی کا الزام صرف آپ ہی پر عائد ہو سکتا ہے، میں اپنی جان بچا لوں اور آپ کو خطرہ میں مبتلا کر دوں یہ کسی طرح ممکن نہیں۔

امرت کور :۔ تم میری فکر نہ کرو، میں بھگت لوں گی، جو کچھ گزرے گی!

حبیب خاں :۔ یہ نہیں ہو سکتا،

امرت کور :۔ میرا کہنا مانو!

حبیب خاں :۔ آپ کے ایک اشارہ پر گردن کٹا سکتا ہوں، لیکن اس حکم کی تعمیل سے معذور ہوں۔

امرت کور :۔ آخر تم کس طرح جاؤ گے۔

حبیب خاں :۔ صرف ایک شرط ہے۔

امرت کور :۔ (مسکرا کر) وہ شرط بھی بتا دو۔

حبیب خاں :۔ میں یہاں سے قدم نہیں نکال سکتا، جب تک آپ بھی ساتھ نہ ہوں!

دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں اور پھر جھک گئیں :

باب ۲۵

میں ہوں اور آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی...

جبیب خاں کے اس دلچسپ مطالبہ نے امرت کور کو ہکا بکا کر دیا۔ اس کا بدن سنسانے لگا، دل دھڑکنے لگا، درو دیوار گھومتے اور جھومتے ہوئے نظر آئے ——————!

اس کے مطالبہ نے کتنی باتیں امرت کور کے سامنے کر دیں، یہ کہ وہ تنہا جبیب خاں کو نہیں چاہتی، جبیب خاں بھی اسے چاہتا ہے اس سے بڑھ کر اور کیا چاہت ہو گی

وہ جسے یاد کریں پھر اسے کیا یاد رہے؟

نیز یہ جبیب خاں کی محبت اتنی شدید ہے کہ بغیر اس کے وہ اس قید خانہ سے نکلنے کے لئے تیار نہیں، یعنی اسے مرجانا گوارا ہے، لیکن اپنے محبوب کے بغیر اس محبس سے رخصت ہونا منظور نہیں،

اور پھر امرت کور کے سامنے ایک ہولناک تصویر آئی۔

یہ رنجیت سنگھ کی تصویر تھی ——————وہ سوچ رہی تھی، جبیب خاں کے یہاں سے بچ نکلنے اور میرے اس کے ساتھ جانے سے اس بوڑھے شیر پر کیا گزرے گی؟ وہ انتقام کی کیسی کیسی تدبیریں سوچے گا، اور جو کچھ اس کے بس میں ہو گا ضرور گزرے گا!

اور پھر اس کی نظروں کے سامنے ایک اور تصویر نمایاں ہوئی،

یہ کرتار سنگھ تھا——————!

اس حادثہ کا اثر کرتار سنگھ پر کیا ہو گا؟

وہ کیا کرے گا! اگر میں اس کے ہاتھ آگئی، اور جبیب خاں کو اس نے گرفتار کر لیا تو ہم

دونوں کے ساتھ اس کا سلوک کیا ہوگا ؟

وہ یہی سوچ رہی تھی کہ حبیب خاں کی آواز فضا میں گونجی ،

"میں نے ایک نہایت بے تکی بات کہہ دی ہے اور میں اس کی معافی چاہتا ہوں"

امرت کور چونک پڑی گویا اس نے کچھ سنا ہی نہیں ، اس نے کہا ۔

"قیدی تم نے کیا کہا ؟"

حبیب خاں :۔ میں نے یہ عرض کیا کہ میں نے نہایت ہی ان ہونی بات آپ سے کہہ دی مجھے میرے حال پر چھوڑ دیئے جو قسمت میں لکھا ہے وہ پورا ہوگا ۔

امرت کور :۔ یعنی جو موقع تمہیں دیا جا رہا ہے اس سے تم فائدہ نہیں اٹھاؤ گے ؟

حبیب خاں :۔ جی نہیں شکریہ کے ساتھ میں انکار کرنے پر مجبور ہوں ۔

امرت کور :۔ (تاثر کے عالم میں) کیوں تم اپنی جان کے پیچھے ہاتھ دھو کے پڑے ہو ؟

حبیب خاں :۔ یہ نہ کہئے قسمت نہ آپ بدل سکتی ہیں ، نہ کوئی اور ، میری قسمت میں محرومی اور ناکامی کی موت لکھی ہے وہ ضرور آئے گی ۔

جی کا جانا ٹھیر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا ! ــــــــــــ !

امرت کور :۔ لیکن آخر تم چلے کیوں نہیں جاتے ؟

حبیب خاں :۔ کیسے چلا جاؤں ؟

امرت کور :۔ تمہارے راستہ کی رکاوٹ کیا ہے ؟

حبیب خاں :۔ (آنکھیں نیچی کرکے) آپ ــــــــــــ !

امرت کور :۔ یہ تو تم ناسمجھی کی باتیں کرتے ہو ،

حبیب خاں :۔ اس کا مجھے بھی اقرار ہے ، میں واقعی ناسمجھی اور بے وقوفی کی باتیں کر رہا ہوں ، لیکن کیا کروں مجبور ہوں ۔

امرت کور :۔ وہی مجبوری تو سمجھ میں نہیں آتی !

جبیب خاں :۔ میرے راستے میں دو مجبوریاں ہیں ،ایک تو یہ شرافت اور انسانیت سے بعید ہے کہ میں اپنے محسن کو خطرہ میں چھوڑ کر چلا جاؤں میری رہائی کی باز پرس نہ لاڈو سے ہوگی ،نہ کسی اور سے ،صرف آپ سے ہوگی ،اور آپ اس جرم سے انکار کر دیں تو بھی کوئی یقین نہیں کرے گا —— !

امرت کور :۔ ہاں یہ ٹھیک ہے لیکن دوسرا سبب کیا ہے ؟

جبیب خاں :۔ آپ کا سبھاؤ آپ کا برتاؤ آپ کی شرافت ،آپ کا جمال کردار آپ کی صورت و سیرت دیکھ کر میں اب کسی ایسی جگہ زندگی نہیں بسر کر سکتا ،جہاں آپ نہ ہوں ،میں جہاں کہیں بھی ہوں گا ،آنکھیں آپ کو ڈھونڈیں گی ،دل آپ کو تلاش کرے گا ،کان آپ کی آواز سننے کی تمنا کریں گے ،میری یہ زندگی تلخ ہو جائے گی ۔اس غم کو میں برداشت نہ کر سکوں گا مر جاؤں گا ۔ پھر جب مرنا ہی ہے تو موت کے آنے سے پہلے تک میں یہیں کیوں نہ رہوں ! یہاں کم از کم آپ تو ہیں —— میرے لئے یہی بہت ہے کہ کبھی کبھی آپ تشریف لے آتی ہیں ،کبھی کبھی مجھ سے گفتگو کر لیتی ہیں یہی چیزیں اب میری زندگی بن چکی ہیں !

امرت کور نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور کچھ کہنے کی کوشش کرنے کے باوجود کچھ نہ کہہ سکی لاڈو کے لئے اب ضبط کرنا ناممکن ہو گیا ،اس نے تیکھے انداز میں کہا ۔

واہ رے مردوئے —— تم تو دامن پکڑتے پکڑتے پہنچا ،پکڑنے لگے ہماری سرکار تو تم پر یہ احسان کر رہی ہیں کہ تمہیں اس قید سے آزاد کئے دیتی ہیں اور تم ہو کہ جھونپڑی میں رہ کر محلوں کے خواب دیکھ رہے ہو ،تم چاہتے ہو ،وہ بھی تمہارے ساتھ چلیں ،کہیں ایسا ہو سکتا ہے ؟ کہیں ٹاٹ میں مخمل کا پیوند لگا ہے ؟

امرت کور نے لاڈو سے کہا ،

" تو چپ رہ کیوں بک بک کر رہی ہے !"

حبیب خاں نے لاڈو کو جواب دیا ۔

"تم سچ کہتی ہو واقعی میں جھونپڑی میں رہ کر محلوں کے خواب دیکھنے لگا، اور یہ میری غلطی ہے لیکن کوئی آدمی بھی سمجھ کر غلطی نہیں کرتا۔ مجبور ہو کر کرتا ہے، میں یہ خواب دیکھنے پر مجبور ہوں، کوئی بھی یہ خواب دیکھنے سے مجھے روک نہیں سکتا۔

لاڈو:- واہ اچھی زبردستی ہے یہ بھی!

حبیب خاں:- اس میں زبردستی کی کیا بات ہے؟

لاڈو:- بھلا کہیں ایسا ہو سکتا ہے کہ سرکار تمہارے ساتھ چلی جائیں؟

حبیب خاں:- میں جانتا ہوں نہیں ہو سکتا، اسی لئے جانے سے انکار کرتا ہوں۔ میں اپنے لئے سرکار کو خطرہ میں کیوں ڈالوں ———— ؟

لاڈو:- نہ ڈالو جاؤ اپنی ایسی تیسی میں!

امرت کور:- میں کہتی ہوں تو نہیں چپ رہے گی؟———— چپ!

لاڈو خاموش ہو گئی حبیب خاں نے کہا۔

"آپ اس پر خفا نہ ہوں، سچ ہی تو کہتی ہے، بھلا میرا اور آپ کا کیا جوڑ؟———.

کہاں ریت کا ایک ذرّہ، کہاں ایک جگمگاتا ہوا آفتاب، کہاں ایک فقیر، کہاں ایک بادشاہ کہاں ایک اُجڈ پٹھان کہاں ایک مہذب، دولت مند اور برسر اقتدار گھرانے کی حسین و جمیل شریف اور عالی ظرف لڑکی ————.

امرت کور:- (بھرائی ہوئی آواز میں) قیدی تم ایسی باتیں کیوں کرتے ہو؟

حبیب خاں:- کچھ غلط تو نہیں عرض کرتا ہوں؟

امرت کور:- وہ کون سی خوبی ہے جو تم میں نہیں ———— ؟

حبیب خاں:- (متحیر ہو کر) مجھ میں اس خاکسار میں؟

امرت کور:- ہاں ———— کیا تم بہادر نہیں ———— کیا تم شریف نہیں ہو؟

کیا تم جیالے اور جوان مرد نہیں ہو؟ کیا تم میں وہ تمام خوبیاں نہیں جو ایک شریف، اونچے اور نہایت ہی قابلِ قدر آدمی میں ہوا کرتی ہیں؟

حبیب خاں:۔ جذبات سے مغلوب ہو کر ۔ میں۔

امرت کور:۔ ہاں تم ——— کیوں تم نے اپنے آپ کو اتنا حقیر سمجھ لیا ہے!

حبیب خاں:۔ میں اگر اپنے آپ کو حقیر سمجھتا تو اپنے علاقہ کی سب سے بڑی اور مضبوط حکومت سے ٹکر لینے کی جرأت نہ کرتا ——— لیکن آپ کے سامنے، آپ کے معاملہ میں بے بس بھی ہوں، حقیر اور فرومایہ بھی، حقیر اور ہیچ بھی ———۔

امرت کور:۔ غلط ——— تم تم ہو، مجھے فخر ہے کہ تم مجھ سے محبت ———۔

یہ کہتے کہتے وہ رُک گئی، پھر کچھ نہ کہہ سکی، شرم نے اس کی آنکھیں جھکا دیں، غیرت نے اس کی آواز بند کر دی،

حبیب خاں کو ایک موقع مل گیا، اس نے کہا۔

"یہ میں کیا سن رہا ہوں؟"

امرت کور اب بھی خاموش تھی،

حبیب خاں نے جذبات اور از خود رفتگی کے عالم میں کہا۔

"یہ میں کیا سن رہا ہوں؟ کیا میں آپ سے محبت کر سکتا ہوں؟ کیا میری محبت قبول ہو سکتی ہے؟ کیا میں اس قابل ہوں کہ آپ کے دل میں میری جگہ ہو؟

امرت کور:۔ قیدی یہ تمہاری کیا کیفیت ہو رہی؟

لیکن قیدی کوئی جواب نہ دے سکا، وہ بیہوش ہو چکا تھا!

باب ۲۶

چل بگلی!

حبیب خاں کی بیہوشی نے سارا پروگرام تہس نہس کر دیا، امرت کور نے پکڑ کر لاڈو سے کہا "تو بڑی احمق ہے، آخر تجھے اس طرح کی باتیں کرنے کی کیا ضرورت تھی!

لاڈو نے معذرت آمیز لہجہ میں کہا،

"میں اس کی گستاخی نہ برداشت کر سکی وہ آپ سے محبت ظاہر کرتا تھا۔

امرت کور نے بڑے تیکھے لہجہ میں کہا،

"توکون سا غضب ہوگیا ———— وہ اگر مجھ سے محبت کرتا ہے تو یہ میرے لئے باعث فخر ہے، میں تو اس کی خاک پا کے برابر بھی نہیں ہوں ———— وہ مجھے ٹھکرا دیتا، تو ایک بات بھی تھی، اسے حق تھا اس کا، لیکن کیا میں بھی ٹھکرا سکتی ہوں؟ کیا میں بھی آئی ہوئی نعمت سے منہ موڑ سکتی ہوں؟ اور اگر میں ایسا کروں تو کیا مجھ سے بڑھ کر بھی کوئی احمق اور دیوانہ ہوگا ————! ٹکڑ ٹکر میرا منہ کیا دیکھ رہی ہے جا جلدی سے گلاب اور کیوڑا لا، اور قیدی کو ہوش میں لانے کی تدبیر کر سچ کہتی ہوں اگر اسے کچھ ہوگیا تو تیری جان کی خیر نہیں، پھر میری جان بھی نہ بچ سکے گی! ہائے یہ ایسا وقت اور ایسی جگہ ہے کہ ہم کسی طرح حکیم یا وید کو بھی نہیں بلا سکتے ————!

یہ کہتے کہتے امرت کور رونے لگی، لاڈو نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا، سرکار گھبرایئے نہیں یہ ابھی اچھے ہو جائیں گے۔ بیہوش ہو گئے ہیں ————!

امرت کور نے جواب دیا۔ "کم بخت تو باتیں کئے جا رہی ہے، جا کسی طرح گلاب اور کیوڑا تو لا!"

لاڈو نے کہا،-"ابھی لائی" !

اور وہ آہستہ آہستہ قدم رکھتی ہوئی تیزی سے نکل گئی، تھوڑی دیر میں وہ پھر واپس آگئی، امرت کور نے اپنے ہاتھ سے حبیب خاں کے چہرے پر گلاب اور کیوڑے کا عرق چھڑکا پھر اپنے دامن سے اسے ہوا دینے لگی، ذرا دیر میں حبیب خاں نے آنکھیں کھول دیں، امرت کور کا چہرہ اندھیرے میں بھی خوشی سے چمکنے لگا۔ اس نے خوشی کا جھولا جھولتے ہوئے اپنی محرم راز اور وفادار کنیز سے کہا۔

لاڈو انہوں نے آنکھیں کھول دیں!"

لاڈو خوش ہوکر آگے بڑھی، اس نے قیدی کا چہرہ جھک کر دیکھا پھر اس کی نبض ہاتھ میں لی اور اپنی مالکہ سے کہا۔

"ہاں سرکار انہیں ہوش آگیا۔

حبیب خاں اٹھ بیٹھا،

امرت کور نے کہا۔

"قیدی تم لیٹے رہو، بہت کمزور ہوگئے ہو!"

لاڈو بولی۔

سرکار، یہ پہلے بھی اچھے تھے، انہیں کچھ نہیں ہوا تھا، یہ بن رہے تھے، مکر کر رہے تھے، (حبیب خاں سے مخاطب ہوکر) بڑے وہ ہو تم بھی، ہماری سرکار کو پریشان کر دیا، حقیقت میں اگر تم ہوش میں نہ آتے، تو انہیں بھی نہ جانے کیا ہوگیا ہوتا، بھگوان نے ان کی جان بچالی، واہ بڑے اچھے رہے!

حبیب خاں:۔ (کچھ کھوتے ہوئے انداز میں) نہیں میں اچھا ہوں،

لاڈو:۔ (مسکراکر) یہ لو ———— یہ اپنی خیریت سنا رہے ہیں!

امرت کور:۔ (مسکراکر) چپ، پھر بولی؟

لاڈو :۔ سرکاران کی باتیں بھی تو سنئے کیا کہہ رہے ہیں قیدی میاں ذرا پھر سے تو کہنا۔

حبیب خاں :۔ میں بالکل اچھا ہوں، ذرا ڈگمگا گیا تھا!

لاڈو :۔ تو پھر اب سو جاؤ میٹھی نیند، ٹانگیں پھیلا کے، گھوڑے بیچ کے!

حبیب خاں لیٹ گیا۔

امرت کور نے کہا:

"اب انہیں سونے دو"!

لاڈو بولی،

"ہاں سرکار چلئے ——————!"

لاڈو اور امرت کور پھر اپنے کمرہ کی طرف واپس ہوئیں، راستہ میں لاڈو نے کہا، سرکار معلوم ہے، یہ قیدی کیوں بیہوش ہوا تھا؟

وہ بولی،

میں نہیں جانتی ——————تیری دل شکن باتوں سے!

لاڈو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں سرکار، یہ خوشی کی بیہوشی تھی، آپ نے اس کا دماغ آسمان پر پہنچا دیا، وہ ضبط نہ کر سکا اتنی بڑی خوشی سہ نہ سکا، بیہوش ہوگیا!

امرت کور نے اس کے سر پر ایک محبت بھری چپت لگاتے ہوئے کہا،

"چل پگلی —————— بڑی آئی کہیں کی ویدجی بن کر!"

باب ۲۷

بوڑھا عشق

حبیب خاں کے پاس سے واپس آنے کے بعد امرت کور کو بڑی دیر تک نیند نہیں آئی۔ جب وہ سونے کا ارادہ کرتی، حبیب خاں کی دل آویز، اور خوبرو تصویر، اپنی ساری رعنائیوں اور طرحداریوں کے ساتھ اس کے سامنے آکر کھڑی ہو جاتی تھی، وہ بار بار اس تصویر کو چشم تصور کے سامنے سے ہٹانے کی کوشش کرتی تھی، لیکن کامیابی کو اس سے بیر ہو چکا تھا۔

صبح ہوتے ہوتے اس کی آنکھ جھپکی، اور پھر وہ بڑی دیر تک سوتی رہی، وہ بستر راحت پر مصروف خواب تھی، کہ سروجنی آئی، اس نے خلافِ معمول اب تک جو امرت کور کو سوتے دیکھا تو لاڈ و سے پوچھا۔

کیا بات ہے تمہاری سرکار اب تک آرام فرما رہی ہیں ؟

وہ بولی،

میں نہیں جانتی، شاید دیر میں نیند آئی ہو رات کچھ درد سر کی شکایت کر رہی تھیں !

سروجنی نے چادر اٹھا کر اسے جھنجھوڑ ڈالا، امرت کور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور سروجنی کو گھورتے ہوئے دیکھ کر کہا،

بڑی خراب ہو ——— رات بھر مجھے نیند نہیں آئی، اب ذرا آنکھ لگی تھی کہ آکر اٹھا دیا ——— لیٹتے ہوئے، ہمیں سونے دو!

سروجنی نے پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھا دیا۔

"واہ بڑی آئیں رات بھر جاگنے اور دن بھر سونے والی، اٹھو، ورنہ پانی کی پوری ٹھلیا

انڈیل دوں گی ——————!

امرت کور اٹھ کر بیٹھ گئی ۔

"کہو کیا ہے ؟"

سروجنی پاس بیٹھتے ہوئے بولی ۔

"ہوتا کیا ——— ؟ باتیں کریں گے !"

اور پھر دونوں میں باتیں شروع ہو گئیں ۔

سروجنی نے کہا ۔

"کہو تمہارے قیدی کا کیا حال ہے ؟"

امرت کور بولی ،

اپنی زلفوں سے پوچھو جنہوں نے اسے گرفتار کیا ہے، میرا تو وہ قیدی نہیں مہمان ہے !

سروجنی :۔ اور ہو بہت باتیں بنانا آگئی ہیں ——— آج تم اتنی خوش کیوں نظر آ رہی ہو ؟

امرت کور :۔ میں غمگین کس دن تھی ؟

سروجنی :۔ اسے ہے وہ باتیں بھول گئیں ——————— قیدی پہ دل کڑھ رہا ہے اس کی رہائی کی تدبیریں ہو رہی ہیں ، پروگرام بنائے جا رہے ہیں ، میری خوشامدیں کی جا رہی ہیں کہ میں کچھ مدد کروں !"

امرت کور :۔ تم جھوٹی ہو ——————— میں کیوں خوشامدیں کرتی ! مجھے کیا پڑی ہے کسی کی خوشامد کرنے کی ؟

سروجنی :۔ اچھا تو پھر وہ لاڈو ہوگی ؟

امرت کور :۔ میں نہیں جانتی ، اگر وہ تھی تو اس سے اس طرح کی باتیں کرو !

سروجنی :۔ اچھا یہ باتیں چھوڑو ۔ بتاؤ کوئی تدبیر سوچی اس غریب کی رہائی کی ؟

امرت کور :۔ اگر اس کی قسمت میں لکھا ہوگا ، تو رہا ہو جائے گا ۔ ورنہ یہیں پڑا سڑتا

رہے گا۔

سروجنی :۔ ارے اس غریب سے بھی خفا ہو گئیں ؟

امرت کور :۔ مجھے کسی سے خوش یا خفا ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے ؟

سروجنی :۔ اچھا ایک خوشخبری سناؤں ؟

امرت کور :۔ تمہاری خوش خبری میں بھی نہ جانے کتنے نقشے پنہاں ہوں گے
کہو کون سی نئی بات سوچ کر آئی ہو ؟

سروجنی :۔ جاؤ ہم نہیں بولتے —————— !

امرت کور :۔ اچھا خوش ہو جاؤ۔ ہم نے اپنے الفاظ واپس لے لئے۔ کہو کیا کہہ رہی تھیں!

سروجنی :۔ اس روز مہاراجہ آئے تھے نا تمہارے ہاں ؟

امرت کور :۔ (دل میں پریشان ہو کر) ہاں آئے تھے۔ وہ تو کبھی کبھی آتے ہی رہتے
ہیں، پھر ؟

سروجنی :۔ اس مرتبہ بہت خوش گئے ہیں ۔

امرت کور :۔ خوش ہی ہمیشہ جاتے ہیں —————— یہ بھی کوئی نئی بات نہیں۔

سروجنی :۔ ارے بھئی اس مرتبہ بہت خوش گئے ہیں، بہت زیادہ ۔

امرت کور :۔ اس نوازش کی وجہ ؟

سروجنی :۔ دن گن رہے ہیں کہ کب سردار کرتار سنگھ بہادر کی سواری آئے اور قلعہ سے
بارات آئے اور اس حویلی سے نئی نویلی دلہن کا ڈولا شاہانہ شان کے ساتھ نکلے
مگر کرتار سنگھ آ ہی نہیں چکتے کسی طرح ؟

امرت کور :۔ (تیوری پر بل ڈال کر) پھر تم نے اس طرح کی باتیں شروع کیں ؟

سروجنی :۔ میں نے تمہیں ایک خبر سنائی ہے ۔ خفا ہوتی ہو چپ ہوئی جاتی ہوں۔

امرت کور :۔ ہاں، چپ ہو جاؤ۔ اس طرح کی باتیں مذاق میں بھی نہ کیا کرو ——————

کیا تم نہیں جانتیں، میں مہاراجہ کو ناپسند کرتی ہوں، کسی قیمت پر ان سے شادی نہیں کر سکتی۔

سروجنی:۔ جانتی تو ہوں، لیکن ہم تم ٹھہریں عورت ذات، بھلا مردوں کے سامنے ہماری کیا چلے گی؟

امرت کور:۔ تو پھر تم دباؤ میں آکر مہاراجہ سے شادی کر لو۔

سروجنی:۔ (خفا ہو کر) واہ بھر منہ کیسی بات تم نے کہہ دی؟ تم نے مجھے گالی دی مہندر کو کوسا ——— !

امرت کور:۔ (گلے میں بانہیں ڈال کر) بھلا کہیں ایسا ہو سکتا ہے؟ میں تجھے گالی دوں گی ——— ؟ مہندر کو کوسوں گی؟ تو مجھے بہن سے زیادہ عزیز، مہندر کو میں بھائی کی طرح مانتی اور چاہتی ہوں۔ تم دونوں میں سے کسی کا بھی بُرا چاہ سکتی ہوں؟ میں نے یونہی جل کر تمہاری شرارت کے جواب میں ایک بات کہہ دی تھی۔

سروجنی:۔ (منہ پھلا کر) ائے کیا کر ایسی باتیں!

امرت کور:۔ (مسکرا کر) بہت خوب! اب ایسی غلطی نہیں ہوگی، لیکن اس مرتبہ تو خطا بخش دیجئے۔

سروجنی:۔ (ہنستے ہوئے) ——— جا تجھے آزاد کیا۔

امرت کور:۔ شکریہ سرکار کی اس نوازش کا ——— لیکن آزاد کرنا ہے تو اپنے قیدی مہندر کو کیجئے، ہم تو ویسے ہی آزاد ہیں۔ لیکن اگر تم نے مہندر بیچارے کو آزاد کر دیا تو وہ زہر کھائے گا، دیکھ لینا۔

سروجنی:۔ پھر تم نے ان کا نام لیا ——— ؟

امرت کور:۔ اوہو، واقعی بڑی غلطی ہوگئی۔ اس نام کا وظیفہ پڑھنے کا حق صرف تمہی کو ہے

کان پکڑتی ہوں ۔

سروجنی نے مسکرا کر اس کے ایک زوردار چٹکی لی ، وہ بلبلا گئی ۔

"ہٹو، بڑی شریر ہو تم ۔"

باب ۲۸

سروجنی نے کیا کہا؟

سارا دن بہت اچھی طرح ہنسی خوشی میں گزرا۔ سروجنی جب تک بیٹھی رہی امرت کور اس سے گھل مل کر باتیں کرتی رہی، جب وہ چلی گئی تو اس کی باتیں یاد آنے لگیں اور پھر اس کی وہ بات بھی یاد آئی جو اس نے رنجیت سنگھ کے بارے میں کہی تھی اور پھر وہ نہ جانے کیوں تنہا بیٹھے بیٹھے مسکرانے لگی ۔

اس عالم میں لاڈو آگئی، لاڈو نے جو اپنی سرکار کو مسکراتے دیکھا، وہ خود بھی مسکرانے لگی، امرت کور نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ذرا تیوری چڑھا کر پوچھا

"تو مسکرا کیوں رہی ہے؟"

وہ بولی

"سرکار کو مسکراتے دیکھا، میں بھی مسکرانے لگی ——————!"

امرت کور کو ہنسی آگئی۔ وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی، ایسا معلوم ہوا، جیسے اس کے ساتھ در و دیوار بھی ہنس رہے ہیں، پھر اس نے ہنسی کی رفتار میں تخفیف کرتے ہوئے کہا۔

"واہ ری پگلی! جو کچھ میں کروں گی وہی تو بھی کرے گی ——————!"

لاڈو نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا

"میری زندگی کا مقصد ایک ہی تو ہے، سرکار کو خوش دیکھوں تو خوش ہو جاؤں، اور اگر غمگین پاؤں تو خود بھی اپنے دل کا خون کر لوں۔"

امرت کور نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

"ہم جانتے ہیں تو ہماری کتنی وفادار اور جاں نثار ہے یہی وجہ ہے کہ ہم نے تجھے اپنا محرم اسرار اور ہمدم و ہمراز بنایا ہے، ورنہ جانتی ہے کہ سروجنی سے کتنا بہنا پا ہے لیکن راز کی بات اسے بھی نہیں بتاتے ——————!

لاڈو نے شکرگزار نظروں سے اپنی سرکار کو دیکھا، اور کہا

"میں جانتی ہوں میری سرکار! اسی لئے تو ہر وقت اپنی جان آپ کے لئے ہتھیلی پر لئے رہتی ہوں۔"

امرت کور:۔ (تبسم کے ساتھ) جانتی ہے میں اس وقت کیوں مسکرا رہی تھی!

لاڈو:۔ نہیں ——————لیکن ضرور کوئی خوشی کی بات ہوگی، ورنہ اکیلے میں یوں بیٹھے بیٹھے سرکار ایک دم کیوں مسکرانے لگتیں!

امرت کور:۔ ہاں ——————لیکن تو نے پوچھا نہیں وہ کیا بات تھی!

لاڈو:۔ پوچھ کر کیا کروں، سرکار خود ہی بتا دیں گی۔ ان کی کونسی بات مجھ سے چھپی ہوئی ہے!

امرت کور:۔ سروجنی جب آئی ہے تو تھی تو!

لاڈو:۔ ہاں پھر اپنے کام کو چلی گئی تھی۔

امرت کور:۔ تو اس نے مہاراجہ کے بارے میں جو کچھ کہا وہ تو نے نہیں سنا!

لاڈو:۔ نہیں سرکار! میں تھی کہاں جو سنتی!

امرت کور:۔ کہنے لگی مہاراجہ بہت بیقرار ہیں ——————۔

لاڈو:۔ اسے ہے بڑے بے قرار ——————میرا تو بس نہیں چلتا ورنہ لوکاٹھ ونس دوں منہ میں۔

امرت کور:۔ (ہنستے ہوئے) سن تو سہی ——————وہ کہہ رہی تھی، مہاراجہ بہت بیقرار ہیں، لیکن جانتی ہے کیوں ——————؟

لاڈو:۔ ان کے قرار اور بے قراری کا کیا ٹھکانا! گھڑی میں کچھ گھڑی میں کچھ، نہ خوشی کا اعتبار

نہ ناخوشی کا بھروسہ۔

امرت کور:- وہ تو ہے، لیکن یہ بڑی دلچسپ بات ہے۔

لاڈو:- جی ——————

امرت کور:- سروجنی کہہ رہی تھی مہاراجہ بھیا کے منتظر ہیں، جیسے ہی وہ آئے، بس فوراً اسی دن، اسی وقت، اسی گھڑی —————— اور پھر وہ کچھ نہ کہہ سکی ہنسنے لگی۔

اب تو لاڈو کے کان کھڑے ہوئے کہ یہ سرکار کو آج کیا ہوگیا ہے۔ یہ کیسی بہکی بہکی باتیں کررہی ہیں؛ کہیں خدانخواستہ دماغ تو نہیں الٹ گیا ہے؟ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"تو سرکار! اسی آن اور اسی گھڑی کیا کریں گے مہاراجہ صاحب؟"

امرت کور نے ہنستے ہوئے کہا۔

شادی —————— وہ شادی کریں گے، جانتی ہے کس سے؟

لاڈو:- میں یہ جان کر کیا کروں گی ——————؟ اور مہاراجہ کی شادی میں نئی بات کیا ہوگی اتنی بہت سی شادیاں تو کرچکے ہیں، تھوڑے دنوں میں تو شاید اتنی مہارانیاں جمع ہو جائیں کہ محل میں تل دھرنے کی جگہ بھی باقی نہیں رہے گی۔

لاڈو کے اس بے ساختہ جملہ پر امرت کور کو پھر ہنسی آگئی۔ اس نے بڑی مشکل سے ہنسی پر غالب آتے ہوئے کہا

"اب کب ہے جو آئندہ باقی رہے گی ——————؟ میرے خیال میں مہاراجہ کی بیویاں سو کے قریب تو ہوں گی؟

لاڈو نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا

"ابھی کہی سو سے کیا ہوتا ہے؟ سینکڑوں ہیں سرکار سینکڑوں، بہت سی تو ایسی ہیں جن کی صورت بھی مہاراجہ نہیں پہچانتے۔

امرت کور پھر ہنسنے لگی۔

"اور باندیاں ان کے علاوہ"

لاڈو نے جواب دیا

"جی ہاں، ان کی تو کوئی گنتی ہی نہیں"

امرت کور:- خیر ہمیں مہاراجہ سے یا ان کی مہارانیوں سے یا ان کی باندیوں سے کوئی دلچسپی نہیں یہ تو بادشاہوں کا کھیل ہے جسے وہ کھیلتے ہی رہیں گے۔

لاڈو:- جی اور کیا ———— بالکل یہی بات ہے۔

امرت کور:- لیکن تجھے مہاراجہ کی ہونے والی نئی مہارانی کا نام بتائے دیتی ہوں۔ سن لے اور گرہ میں باندھ لے۔

لاڈو اشتیاق و انتظار کے ساتھ امرت کور کی طرف دیکھنے لگی۔ امرت کور نے کہا

"اس کا نام ہے امرت کور"

اور یہ کہہ کر پھر بے ساختہ وہ ہنسنے لگی۔

لاڈو نے جل کر کہا۔

"ہونہہ ———— یہ منہ اور مسور کی دال، ہماری سرکار کے دشمن بھی اس کے محل میں قدم نہ رکھیں گے ———— کچھ سوچ کر) لیکن آپ اتنی خوش کیوں ہیں؟

امرت کور:- کیا یہ خوشی کی بات نہیں ہے؟ کیا تو خوش نہیں ہوئی یہ بات سن کر؟

لاڈو:- (جل کر) کیا آپ خوش ہیں؟ آپ پسند کرنے لگی ہیں مہاراجہ کو؟

امرت کور:- میرے دل کا حال تو مجھ سے زیادہ جانتی ہے۔

لاڈو:- (مسکرا کر) وہ تو جانتی ہوں ———— میں نے تو آپ کو خوش دیکھ کر یہ پوچھا، ورنہ مجھے کیا نہیں معلوم؟

امرت کور:- (ہنستے ہوئے) تو پاگل ہے، دیوانی ہے، یہ ہنسی وہ نہیں ہے، جو کسی بات پر خوش ہو کر آتی ہے ————!

لاڈو:۔ (حیران ہوکر) پھر یہ کیسی ہنسی ہے سرکار ؟

امرت کور:۔ وہ جو ایک بے وقوف آدمی کی سادہ لوحی اور حماقت پر آتی ہے ۔ اس ہنسی میں مسرت نہیں طنز ہے، ترس ہے، لطف ہے ۔

لاڈو:۔ (ہنس کر) اب میں سمجھ گئی ۔

اور پھر وہ بھی امرت کور کے ساتھ مل کر ہنسنے لگی، لاڈو کی ہنسی میں صرف طنز تھا —— ترس اور لطف ذرا بھی نہیں ۔ پھر وہ اپنی سرکار سے کہنے لگی :۔

"کتنا مزہ آئے گا ——————!"

امرت کور نے لطف لیتے ہوئے کہا

"ہاں، بہت زیادہ، لیکن افسوس ہم نہ دیکھ سکیں گے، کاش وہ پرلطف منظر ہماری نظروں کے سامنے گزرتا۔ کاش ہم اس سے لطف لے سکتے، اُسے دیکھ سکتے ۔ لیکن ایسی قسمت کہاں ؟

باب ۲۹

لاڈو

پھر وہی رات کا وقت تھا۔

لیکن آج کی رات کل کے مقابلہ میں بدلی ہوئی تھی۔

کل موسم بڑا سہانا تھا، چاندنی چھٹکی ہوئی تھی ہوا کے جھونکے چل رہے تھے، اور آج طوفان کی سی کیفیت چھائی ہوئی تھی، گھنگھور گھٹا تلی کھڑی تھی۔ بجلی چمک رہی تھی، بادل گرج رہے تھے بوندا باندی شروع ہو چکی تھی، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت جلد خوفناک بارش شروع ہو جائے گی ——— اندھیرے کا یہ عالم تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سجائی دیتا تھا۔ کتنا شور مچایئے لیکن بادل کی گڑگڑاہٹ میں وہ تحلیل ہو کر رہ جاتا تھا ———!

یہ وقت تھا جب لاڈو حبیب خاں کی کال کوٹھڑی میں ایک ہلکی سی شمع کو اپنے ہاتھوں میں لئے نمودار ہوئی۔

حبیب خاں اس دن کی گفتگو سے اس سے کچھ چڑ گیا تھا۔ ناوقت جو اسے آتے دیکھا تو تیوری چڑھا کر دریافت کیا

"اس وقت تمہارے آنے کا سبب؟"

لاڈو نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"کام ہے ———!"

حبیب خاں:۔ مجھ سے تمہیں کوئی کام نہیں ہو سکتا۔

لاڈو:۔ (جل کر) تو کیا تمہاری صورت دیکھنے آئی ہوں؟

حبیب خاں:۔ (برافروختہ ہوکر) میں نہیں جانتا۔

لاڈو:۔ لیکن میں تو جانتی ہوں۔

حبیب خاں:۔ مجھے تم سے کوئی مطلب نہیں۔

لاڈو:۔ خاں صاحب! تم تو اتنے خفا ہو جیسے میں نے کوئی خطا کی ہے۔

حبیب خاں:۔ اس وقت اتنی رات گئے تنہا یہاں آنا خطا نہیں ہے؟

لاڈو:۔ لیکن میں اپنے لئے تو نہیں آئی ہوں۔

حبیب خاں:۔ تو پھر کیا میرے لئے آئی ہو؟

لاڈو:۔ ہاں اور کیا ——— چلو جلدی کرو آج قدرت ہماری مدد پر کمربستہ ہے۔ رات بڑی اندھیری ہے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ بجلی چمک رہی ہے، ممکن ہے بارش بھی ہونے لگے تو اور اچھا ہوگا۔ بالکل کام بن جائے گا۔

حبیب خاں:۔ (تیوری چڑھاکر) کیا بک رہی ہو تم؟

لاڈو:۔ اے واہ رے مردوئے! خواہ مخواہ کے نخرے دکھا رہا ہے۔ ہم جو کچھ کہتے نہیں تو سر ہی چڑھ گئے ہیں سرکار! ہوش میں آؤ۔ عقل کی باتیں کرو ———۔ بتا چلنا ہے یا نہیں؟

حبیب خاں:۔ کہاں چلنا ہے۔؟

لاڈو:۔ تمہاری رہائی کا فیصلہ سرکار کر چکی ہیں۔ اس سے اچھا موقع نہیں ملے گا پھر

حبیب خاں:۔ مجھے ایسے موقع کی ضرورت نہیں ہے۔

لاڈو:۔ تو یہیں پڑے سڑو گے ———؟

حبیب خاں:۔ ہاں ——— تمہیں کیا

لاڈو:۔ میری جوتی سے ——— مرو، میں تو جاتی ہوں ———!

حبیب خاں:۔ شکریہ، تشریف لے جائیے۔

لاڈو:۔ (پلٹ کر) دیکھو میرے منہ نہ لگنا، کہے دیتی ہوں، میں بڑی ویسی ہوں۔

حبیب خاں:۔ تم چاہے ایسی ہو یا ویسی ہو، مجھے تم سے کوئی مطلب نہیں۔

لاڈو:۔ دیکھو اس موقع سے فائدہ اٹھا لو، ورنہ پھر پچھتاؤ گے۔

حبیب خاں:۔ مردوں کا فیصلہ کبھی نہیں بدلا کرتا، وہ اپنے فیصلوں پر کبھی نہیں پچھتاتے، عورتوں کی طرح ٹسوے بہانا انہیں نہیں آتا۔

لاڈو:۔ آخر تم چاہتے کیا ہو؟

حبیب خاں:۔ کچھ نہیں۔

لاڈو:۔ پھر یہاں سے دفان کیوں نہیں ہوتے!

حبیب خاں:۔ نہیں جاتے نہیں جائیں گے۔

لاڈو:۔ واہ، یہ بھی اچھی زبردستی ہے۔ لوگ قید سے رہائی کی دعائیں مانگتے ہیں اور یہ مردوا قید میں مرنے کے لئے تُلا ہوا ہے۔

حبیب خاں:۔ ہر قید یکساں نہیں ہوتی۔

لاڈو:۔ (طنز سے) او ہو سمجھ گئی مطلب حضور کا۔

حبیب خاں:۔ میں نے تو اپنا کوئی مطلب نہیں بیان کیا تم سے۔

لاڈو:۔ ہاں، لیکن میں سمجھ گئی جان گئی ——— منہ دھو رکھو۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ کسی طرح نہیں ہو سکتا، قیامت تک نہیں ہو سکتا۔ ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے جب بھی نہیں ہو سکتا ——— لو اور سنو۔ چھچھوندر لگائے چنبیلی کا تیل

عجب تیری قدرت عجب تیرے کھیل۔

حبیب خاں:۔ عجیب دیوانی ہو گئی ہو تم؟ آخر اس بکواس کا مقصد کیا ہے؟

لاڈو:۔ تم یہ چاہتے ہو کہ سرکار بھی تمہارے ساتھ جائیں، کیوں؟ ہے نا یہی بات؟

حبیب خاں:۔ میں نے تو تم سے کچھ نہیں کہا، تمہی جو تمہارے جی میں آ رہا ہے، کہہ رہی ہو

لاڈو :۔ کچھ غلط کہہ رہی ہوں؟ کل ہی کی تو بات ہے، میں نے ——— جو کچھ اپنے کانوں سے سنا تھا۔

حبیب خاں :۔ تم اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لو، تاکہ ہماری باتیں تمہارے سننے میں نہ آیا کریں۔

لاڈو :۔ آہا ہا۔ تم اپنا منہ سی لو۔

حبیب خاں :۔ بگڑ کر، تم نہیں جاؤگی یہاں سے ؟

لاڈو :۔ کیوں جائیں؟ کچھ تمہارا گھر ہے ؟ ہماری سرکار کی حویلی ہے یہ میاں قیدی ——— جاؤ، تم جہاں تمہارے سینگ سمائیں رہئے۔

حبیب خاں جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ایک سایہ اس طرف بڑھتا نظر آیا قریب پہنچا تو معلوم ہوا امرت کور ہے۔ اسے دیکھ کر لاڈو خاموش ہوگئی اور مسکرانے لگی۔ امرت کور نے پوچھا "کیا بات ہے، مسکرا کیوں رہی ہے ؟"

وہ بولی۔

سرکار! عجب آدمی سے پالا پڑا ہے، اتنی دیر سے سمجھا رہی ہوں، مگر کیا مجال ہے جو اس بھُس بھرے دماغ میں بات آجائے۔

امرت کور نے اسے ڈپٹتے ہوئے کہا۔

بہت شوخ ہوگئی ہے تو ——— خبردار! جو آئندہ اس طرح کی باتیں کی ہوں گی تو نے!

لاڈو چپ ہوگئی۔ پھر امرت کور حبیب خاں سے مخاطب ہوئی۔

"تم اب تک تیار نہیں ہوئے ؟"

حبیب خاں نے بے بسی کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

"کاہے کے لئے ؟ کیا آپ مجھے یہاں سے نکال دینے پر تل گئی ہیں ؟ کیا آپ

نے فیصلہ کر لیا ہے کہ مجھ سے میری ہر خوشی چھین لیں گی؟ کیا آپ اس پر بضد رہیں گی کہ کسی طرح بھی میرے ناکام و نامراد دل کو سکون نہیں پہنچنے دیں گی؟

حبیب خاں نے یہ باتیں بڑے درد اور سوز کے ساتھ کہیں۔ امرت کور بڑی حیرت سے اس کی باتیں سنتی رہی۔ آخر اس نے پوچھا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

حبیب خاں:۔ میری آپ سے صرف یہ استدعا ہے کہ مجھے یہاں سے نہ نکالئے۔ میری قسمت کا فیصلہ کرتار سنگھ یا رنجیت سنگھ کو کر لینے دیجئے۔

امرت کور:۔ (حیرت سے) لیکن تمہیں نکال کون رہا ہے؟

حبیب خاں:۔ (معصومیت کے ساتھ لاڈو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ عورت اتنی دیر سے میرے پیچھے پڑی ہے۔

امرت کور:۔ اس نے کیا کہا تم سے؟

حبیب خاں:۔ یہ مجھے مجبور کر رہی ہے کہ آج کے موسم سے فائدہ اٹھاؤں اور رات کی اس تاریکی میں جہاں میرے سینگ سمائیں چلا جاؤں، حالانکہ اس کے سامنے میں آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ میں یوں نہیں جاؤں گا۔ میں اس طرح رہا ہونا نہیں چاہتا۔

امرت کور نے گھور کر لاڈو کو دیکھا اور حبیب خاں سے پوچھا۔

"یہ کیا کہہ رہی تھی ———— ؟

حبیب خاں:۔ بس اس پر بضد تھی کہ میں چلا جاؤں ————!

امرت کور:۔ (لاڈو سے) کیوں لاڈو! تو نے ان سے صرف یہی کہا اور کچھ نہیں کہا ————؟

لاڈو مسکرانے لگی اس نے شوخ نظروں سے امرت کور کو دیکھا اور کہا۔

"بھول گئی تھی۔"

امرت کور حبیب خاں سے مخاطب ہوئی،

"یہ بہت شریر ہے، اس کی باتوں کا بُرا نہ مانیے ـــــــــ!"

حبیب خاں نے جواب دیا۔

"بہت اچھا، آپ کہتی ہیں تو اب اس کی باتوں کا بُرا نہیں مانا کروں گا۔ لیکن اس سے کہہ دیجئے یہ اس طرح کی باتیں نہ کیا کرے مجھ سے ؟"

امرت کور:۔ (مسکراکر) کہہ دوں گی۔ مجھے تیاری میں بہت دیر لگ گئی، ورنہ کافی دیر پہلے میں آچکی ہوتی۔ لیکن اب زیادہ دیر نہ ہونی چاہئے۔

حبیب خاں اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

لاڈو نے کہا

"اب تو آؤ باہر۔

امرت کور بولی۔

"ہاں کافی دیر ہوگئی ہے"۔

حبیب خاں نے پھر بڑے عاجزانہ اور مسکینی کے ساتھ کہا،

"تو واقعی آپ فیصلہ کرچکی ہیں کہ میں یہاں نہ رہوں۔ چلا جاؤں یہاں ؟"

امرت کور:۔ ہاں ـــــــــ لیکن تنہا نہیں۔

حبیب خاں امرت کور کی طرف حیرت واستعجاب کے عالم میں دیکھنے لگا۔ امرت کور نے کہا۔

"میں بھی ساتھ چل رہی ہوں"۔

حبیب خاں پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہوگئی، اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ اس نے پھر پوچھا،

"کیا واقعی ـــــــــ؟"

امرت کور نے زیرِ لب تبسم کے ساتھ کہا،

"ہاں کیا کروں؟ ——— آپ نہیں مانتے کسی طرح، تو مجبوری ہے چلنا پڑے گا مجھے۔"

حبیب خاں جلدی سے باہر آگیا۔ لاڈو نے اسے پھر چھیڑا۔

"کہیں راستہ میں بیہوش نہ ہو جانا جو ادر لینے کے دینے پڑیں ———!"

حبیب خاں مسکرانے لگا۔

آگے آگے امرت کور، پیچھے پیچھے حبیب خاں اور اس کے پیچھے لاڈو، یہ لوگ نہایت خاموشی کے ساتھ چور دروازہ سے باہر نکل گئے۔

باب ۳۰

ریشماں پر کیا گزری؟

اور عین اس وقت جب امرت کور اپنے چھوٹے سے قافلہ کو لے کر باہر نکل رہی تھی مہاراجہ رنجیت سنگھ اپنے قصر زرنگار میں داد عیش وعشرت دے رہے تھے، جام شراب ان کے ہاتھ میں تھا، اور ریشماں ان کے پہلو میں، وہ خوش تھے، بے انتہا خوش لیکن سپردگی کے باوجود ریشماں کا منہ پھولا ہوا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے وہ کسی بات پر خفا ہے، مہاراجہ اس سے بار بار دریافت کرتے تھے، کیا بات ہے، تم افسردہ کیوں ہو؛ لیکن وہ کوئی جواب نہ دیتی۔ آخری بار جب مہاراجہ نے پوچھا تو اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ مہاراجہ نے اس کی یہ کیفیت دیکھی تو سراپا اضطراب بن کر فرمایا۔

ریشماں! کیا بات ہے، تو رو کیوں رہی ہے؟

ریشماں نے پلّو سے آنسو پونچھ لئے۔ لیکن کوئی جواب نہ دیا۔ مہاراجہ نے ارشاد فرمایا تو بتاتی کیوں نہیں، کیا بات ہے؟ اگر کسی نے تجھ پر زیادتی کی ہو تو بتا میں اسے سزا دوں گا۔

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

وہ نام میری زبان پر نہیں آسکتا۔

رنجیت سنگھ:۔ وہ کوئی بھی ہو میں اسے سزا دوں گا۔

ریشماں:۔ ظالم خود ہی اپنا انصاف نہیں کر سکتا۔

رنجیت سنگھ:۔ تیرا اشارہ ہماری طرف ہے؟ —————— ہم نے ظلم کیا

ہے تجھ پر؟

ریشماں نے بڑی معصومیت سے اقرار میں گردن ہلا دی، مہاراجہ پر اس ادا نے وہی اثر کیا، جو جہانگیر پر نورجہاں کی اس ادا نے کیا تھا، جب اس نے کبوتر اڑا دیا تھا، اور جب جہانگیر نے پوچھا کیسے اڑا دہ کبوتر؟ تو اس نے دوسرے ہاتھ کا کبوتر بھی اڑا دیا کہ "یوں"

مہاراجہ نے سیماب کی طرح بیقرار ہوتے ہوئے کہا۔

- تم ہماری پروا بھی نہ کرو، اگر ہم نے کوئی زیادتی تم پر کی ہے تو بتاؤ ہم اپنے آپ کو بھی سزا دیں گے۔

ریشماں:۔ نہیں آپ اپنے آپ کو سزا نہ دیجئے۔ میں جس سزا کی مستحق ہوں، وہ مجھے مل گئی مل رہی ہے۔

رنجیت سنگھ:۔ لیکن آخر ہوا کیا؟ کچھ تو بتاؤ۔

ریشماں:۔ محل میں شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں، کیا یہ غلط ہے؟

رنجیت سنگھ کا چہرہ پھول کی طرح کھل گیا۔

- ہاں ہو تو رہی ہیں، تمہیں اعتراض ہے کچھ ——————؟

ریشماں:۔ میں کس منہ سے اعتراض کر سکتی ہوں۔ میری کیا یہ حیثیت کہاں کہ آپ کو کچھ یاد دلاؤں؟ میں تو دوسروں پر رشک کر سکتی ہوں اور اپنے اوپر آنسو بہا سکتی ہوں۔

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیماں کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارماں ہونگے

رنجیت سنگھ:۔ ریشماں! تم غلط راستے پر جا رہی ہو۔ تمہیں جو کچھ چاہیئے وہ حاصل ہے تمہارا منصب اور مرتبہ کسی طرح مہارانیوں سے کم نہیں۔ تمہیں اس پر قناعت کرنی چاہیئے اور ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں کہ امرت کور جب اس محل میں بیاہ کر آئے گی تو بھی تمہارے مرتبہ اور مقام میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔

ریشماں:۔ جو مرتبہ اور مقام اس وقت حاصل ہے وہ تو میں جانتی ہوں نہیں چھن سکتا۔ اس لئے کہ درحقیقت نہ وہ کوئی مرتبہ ہے، نہ مقام۔ ایک مغنیہ اور رقاصہ بھی کسی بھی مرتبہ اور مقام پر فائز ہو سکتی ہے! وہ تو اسی لئے ہوتی ہے کہ گائے ناچے، شراب پلائے اور اپنے آقا اور مالک کا کھلونا بنی رہے۔ اس سے جو وعدے کئے جاتے ہیں وہ اس لئے نہیں ہوتے کہ پورے کیسے جائیں ان کی حیثیت ایک وقتی گفتگو سے زیادہ نہیں ہوتی۔

رنجیت سنگھ:۔ تم اپنے آپ کو صرف رقاصہ اور مغنیہ سمجھتی ہو؟

ریشماں:۔ اگر اس کے علاوہ میں کچھ اور بھی ہوں تو بتا دیجئے، کم از کم مجھے تو نہیں معلوم ——!

رنجیت سنگھ (بگڑے ہوئے تیور کے ساتھ) کیا تمہیں ہماری بارگاہ میں شرفِ تقرب حاصل نہیں ہے۔

ریشماں:۔ وہ کسی رقاصہ اور مغنیہ کو جو دربار سے وابستہ ہے، نہیں حاصل ہے۔

رنجیت سنگھ:۔ کیا تم پر زیادہ سے زیادہ ہماری عنایتیں اور نوازشیں مبذول نہیں رہتی؟ کیا تم ہماری خلوت خاص میں باریابی نہیں پاتیں؟ کیا تمہیں دوسری رقاصاؤں پر ترجیح نہیں ہے۔

ریشماں:۔ پہلے تو بے شک میں یہی سمجھتی تھی، اسی لئے آپ کی وعدہ فراموشیوں کو بھول جاتی تھی، لیکن اب تو میں دیکھتی ہوں، میرے اعزاز اور مرتبہ کی شریک ہر وہ عورت ہے جس کا آپ گانا سن لیں، جس کا آپ رقص دیکھ لیں، اور پھر انہی سے مجھے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے خلوتِ خاص میں جو وعدے مجھ سے کر رکھے ہیں۔ وہی دوسروں سے بھی کر رکھے ہیں۔ صرف میں ہی مہارانی بننے کے خواب نہیں دیکھتی۔ نہ جانے کتنی مجھ جیسی بدقسمت عورتیں اس محل میں ہیں جو اس امید پر جی رہی ہیں کہ بہت جلد وہ مبارک وقت آنے والا ہے جب ان کا شمار بھی مہارانیوں میں ہوگا۔

رنجیت سنگھ :۔ برہمی کے ساتھ ہم اس اندازِ گفتگو کو پسند نہیں کرتے۔ " اندازِ گفتگو بہت زیادہ شوخ، گستاخانہ اور بے باکانہ ہے۔

ریشماں :۔ اسی لئے تو میں خاموش تھی۔ آپ ہی نے پوچھا، میں بتا دینے پر مجبور ہو گئی۔ یہ بات اگر آپ کو گراں گزری تو میں معافی چاہتی ہوں!

رنجیت سنگھ :۔ نکلا ہوا تیر واپس نہیں ہوا کرتا۔

ریشماں :۔ رسم کر، اگر میں گستاخ اور بے باک ہوں تو یہ بھی مہاراجہ ہی کی شفقت اور محبت کا نتیجہ ہے۔

رنجیت سنگھ :۔ نہیں، یہ سخن سازی ہے، ہم کسی قیمت پر بھی گستاخی کی اجازت نہیں دے سکتے یہ کہہ کر مہاراجہ نے جام شراب ہاتھ سے پھینک دیا اور تالی بجائی۔ ایک خادم حاضر ہوا، حکم دیا۔

"امر سنگھ کو بلاؤ۔"

یہ دربار کا غنڈہ یعنی مہاراجہ کا منہ چڑھا مصاحب تھا، فوراً حاضر ہوا۔ مہاراجہ نے ریشماں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ کنیز ہم تمہیں بخشتے ہیں۔"

امر سنگھ ایک عرصہ سے ریشماں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا کرتا تھا۔ دل کی مراد بر آئی شکر ادا کرنے کے لئے سجدہ میں گر پڑا۔ مہاراجہ نے پر جلال آواز میں کہا۔

"لے جاؤ اسے۔"

امر سنگھ نے ریشماں کا ہاتھ پکڑا اور اسے اس طرح لے گیا۔ جس طرح قصائی گائے کو لے جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے، لیکن ہاتھ امر سنگھ کی گرفت میں تھا وہ آنسو بھی نہیں پونچھ سکتی تھی۔

ریشماں کے حادثہ نے مہاراجہ کو بہت زیادہ مکدر کر دیا تھا، ابھی ان کا تکدر قائم

تھا، اور وہ سوچ رہے تھے کہ اسے کس طرح دور کریں کہ دربار کا ایک افسر گھبرایا ہوا حاضر ہوا، اور گردن جھکا کر کھڑا ہوگیا۔

رنجیت سنگھ نے اسے گھور کر دیکھا اور پوچھا

"کیا بات ہے، کوئی خاص خبر؟"

اس نے عرض کیا۔

"پشاور سر ہوگیا۔ مجاہدین نے اسے فتح کرلیا۔ پھر سب کوششوں کے باوجود ہم کچھ نہ کر سکے"

یہ سن کر رنجیت سنگھ کو سناٹا آگیا۔ پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ اس نے گرج کر کہا

دربار ——————!

مطلب یہ کہ اس وقت دربار خاص ہوگا اور اس میں اس صورت حال پر غور کیا جائے یکایک اس کی نظر مول چند پر پڑی۔ یہ کرتار سنگھ کا پرانا ملازم تھا۔ رنجیت سنگھ نے ایسے نا وقت اسے موجود پاکر دریافت کیا۔

"تو کیسے آگیا اس وقت؟"

وہ سجدہ میں گر پڑا، اس نے اسی حالت میں کہا۔

"نیدی بھاگ گیا،

امرت کور بھاگ گئی، لاڈو بھاگ گئی، اب گھر میں کوئی نہیں ہے"

رنجیت سنگھ قریب تھا کہ تیورا کر گر پڑے۔ لیکن اس نے ضبط کیا اور پوچھا۔

"یہ سب بھاگ گئے ——————؟"

اس نے سجدے میں پڑے پڑے کہا

"سرکار! سب بھاگ گئے، نہ جانے یہ کیا ہوا ——————؟"

رنجیت سنگھ کڑکا۔

"تم پہرے کے سپاہی سب مر گئے تھے کوئی نہ دیکھ سکا؟"

مول چند نے سجدے سے سر اٹھائے بغیر کہا

"چور دروازہ کھلا پڑا ہے، وہ لوگ اسی طرف سے گئے ہیں سرکار۔"

رنجیت سنگھ نے میان سے تلوار نکالی، شڑاپ کی آواز آئی۔

مول چند کا سر الگ تھا، دھڑ الگ۔

باب ۳۱

رنجیت سنگھ کا غصّہ

رنجیت سنگھ کی زندگی کشمکش اور سعی و کوشش کی زندگی تھی۔ اس نے بڑی بڑی کڑیاں جھیلی تھیں، اور بڑی بڑی ناکامیوں کا مقابلہ کیا تھا۔ بچپن میں وہ یتیم ہو گیا۔ معمولی آدمی ہوتا تو زمانہ کی ٹھوکروں کے لئے وقف ہو جاتا، لیکن ان مشکلات نے اس کے سمندِ عزم پر تازیانہ کا کام کیا وہ بڑھتا رہا، ترقی کرتا رہا، کامیابیاں حاصل کرتا رہا۔ یہاں تک کہ پہلے پنجاب کا پھر سرحد کا فرماں روا بن گیا۔ مسلمانوں سے اس نے علیہ اور بخشش کے طور پر لاہور کا پروانہ حکومت لیا تھا۔ لیکن بہت جلد وہ اس طویل و عریض علاقہ کے مسلمانوں کا "بادشاہ" بن گیا اور وہ اس کے "تابعدار" اور محکوم بن گئے۔

آج تک رنجیت سنگھ کو کسی ایسے حادثہ سے دوچار نہیں ہونا پڑا تھا، جس نے اس کے ہوش و حواس درہم برہم کر دیئے ہوں۔ جس نے اس پر سکتہ کی سی کیفیت طاری کر دی ہو جس نے دنیا اس کی نظروں میں تاریک کر دی ہو۔ وہ ناکامیوں کا مذاق اڑاتا تھا۔ مشکلات پر قہقہہ لگاتا تھا۔ دشواریوں کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ لیکن آج پہلی مرتبہ وہ اپنے آپ کو دنیا کا سب سے زیادہ ناکام انسان محسوس کر رہا تھا۔ اس نے سب کچھ ہار دیا —— اب اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔

ریشماں کا دماغ کوئی ایسا دماغ نہیں تھا۔ یہ تو اس کے قصرِ زمرد میں ہوا ہی کرتا تھا یہ آئی وہ گئی۔ یہ کنیز سر پر بیٹھ گئی۔ وہ باندی نظر سے گر گئی۔ اس حادثہ میں نہ کوئی تنوع تھا، نہ جدت —— !

پشاور کا ہاتھ سے نکل جانا اور اس پر مجاہدین کا قبضہ ہو جانا بہت بڑا سانحہ تھا۔ لیکن

گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

بادشاہوں اور کشور کشاؤں کو اس طرح کے حالات سے دوچار ہونا ہی پڑتا ہے۔ یہاں بڑھے وہاں پسپا ہوئے۔ ادھر جیتے، ادھر ہارے۔ اس شہر پر قبضہ کرلیا، وہ شہر چھوڑ دیا۔ اگر ہمت و حوصلہ قائم ہے، دم خم موجود ہے، تربیت یافتہ سپاہ اور سرفروش سپاہی موجود ہیں۔ تو ہاری ہوئی بازی جیتی جاسکتی ہے۔ چھنا ہوا شہر واپس لیا جاسکتا ہے۔ کھوئی ہوئی دولت واپس مل سکتی ہے۔

لیکن کیا امرت کور بھی واپس مل سکتی ہے؟ کیا وہ بھی جاکر واپس آسکتی ہے؟ اور آ بھی جائے تو کیا میرے لئے قابل قبول ہو سکتی ہے؟ اور اگر قابل قبول نہ ہو تو کیا وہ زخم بھر سکتا ہے۔ جو اس کی روپوشی سے دل میں پیدا ہوگیا ہے۔ وہ دُکھ سُکھ سے بدل سکتا ہے جو اس کی بے وفائی نے پیدا کر دیا ہے؟ وہ گھاؤ مندمل ہو جائے گا۔ جو اس کے فراق نے عطا کیا ہے؟

واقعی رنجیت سنگھ امرت کور کو بہت زیادہ چاہتا تھا۔ اس کا اندازہ آج ہی ہوا وہ سوچ رہا تھا۔

امرت کور کیوں گئی ——————— ؟ کیا وہ اس مسلمان جاسوس پر عاشق ہوگئی تھی؟ اور اس کا عشق اس درجہ تک پہنچ گیا تھا کہ وہ اپنے گھر بار کو، اپنے عزیزوں اور قرابت مندوں کو، اپنی سہیلیوں اور ہمجولیوں کو اور سب سے بڑھ کر اپنے عاشق زار بھائی کو، اس سے بھی بڑھ کر اپنے محبت کرنے والے شہنشاہ کو یوں چھوڑ کر چلی جائے؟

کیا ایسا ہو سکتا ہے ——————— ؟

کیا دنیا میں یہ بھی ہوتا ہے؟

اب میں اسے کہاں پاؤں گا؟

اب اس کی جدائی کی تلافی کس طرح ہو سکے گی؟

اتنے میں اسے خیال آیا، اس راز کا سراغ لگنا چاہیئے، کہیں یہ کوئی سازش تو نہیں ہے؟

اتنے میں قسمت کا مارا ہوا دولت رام آگیا، اسے دیکھتے ہی رنجیت سنگھ نے پہلو بدلا اور سنجیدگی سے کہا۔

"آؤ دولت رام! ہم تمہی کو یاد کر رہے تھے اس وقت ———!"

دولت رام ادب سے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مؤدبانہ طور پر عرض کیا

"میں حاضر ہوں"

رنجیت سنگھ:- تمہیں معلوم ہے وہ مسلمان جاسوس جو کرتار سنگھ کے گھر میں قید تھا، فرار ہو گیا؟

دولت رام:- میرے آقا! صبح اٹھتے ہی مجھے یہ خبر ملی، اور میں فوراً دردولت پر اطلاع دینے حاضر ہو گیا۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ آپ کے سمع مبارک تک یہ بات پہنچ چکی ہے۔

رنجیت سنگھ:- ہاں، ہم سے کوئی بات چھپی نہیں رہتی۔ ہر بات کا ہمیں علم ہو جاتا ہے۔

دولت رام:- اور وہ کم بخت اکیلا نہیں بلکہ ———

رنجیت سنگھ:- امرت کور کو بھی اپنے ساتھ لیتا گیا؟

دولت رام:- جی ——— بلکہ امرت کور ہی نہیں اس کی خادمہ لاڈو بھی اس کے ساتھ گئی۔

رنجیت سنگھ:- ہاں، ہم جانتے ہیں۔ لیکن تعجب ہے سروجنی اس کے ساتھ نہیں گئی۔

دولت رام:- (سراسیمہ ہو کر) جی وہ کیسے جا سکتی تھی؟ اگر اس سے اس طرح کی حرکت سرزد ہوتی، تو میں اسے مار ڈالتا۔

رنجیت سنگھ:- لیکن اسے پاتے کہاں ———؟

دولت رام:- اگر نہ پاتا تو تلوار کی نوک اپنے سینے میں پیوست کر لیتا۔

رنجیت سنگھ :۔ ڈپٹ کر) کیا سروجنی اور امرت کور میں غیر معمولی دوستی نہیں تھی ؟

دولت رام :۔ ضرور تھی ———— ہماری خاندانی دوستی ہے ہیں اور کرتار بڑے گہرے دوست ہیں۔ سروجنی اور امرت کور میں بڑی دوستی تھی۔ ہم دونوں کے باپ آپس میں بڑے گہرے دوست تھے۔ ہم دونوں کی راؤں میں بھی نہ ٹوٹنے والا محبت کا رشتہ قائم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب سے یہ خبر سنی ہے، دل قابو میں نہیں ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے امرت کور نہیں گئی سروجنی چلی گئی۔

رنجیت سنگھ :۔ ہوں ———— ٹھیک ہے۔

دولت رام :۔ سوچتا ہوں کہ کرتار سنگھ جب آئے گا۔ اور اسے خبر ملے گی تو اس بیچارے پر کیا گزرے گی ؟

رنجیت سنگھ :۔ بہت صدمہ ہوگا اس غریب کو۔ وہ ہمارا سچا جاں نثار اور وفادار ہے۔

دولت رام :۔ جی بے شک، اس کی وفاداری شک وشبہ سے بالاتر ہے۔

رنجیت سنگھ :۔ ہم بھی اسے تسلیم کرتے ہیں، مانتے ہیں۔

دولت رام :۔ بجا ارشاد ہوا۔

رنجیت سنگھ :۔ لیکن ایک بات کسی طرح ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔

دولت رام :۔ سراپا گوش بن کر، جی ارشاد۔

رنجیت سنگھ :۔ جب سروجنی اور امرت کور میں اتنی گہری دوستی تھی تو کیوں کر ممکن ہے کہ سروجنی اس کی ہمراز اور ہمدرد نہ ہو۔

دولت رام :۔ جی ————

رنجیت سنگھ :۔ اور یہ کیوں کر ممکن ہے کہ اتنا بڑا عجیب اور انقلابی فیصلہ وہ کسی سے صلاح مشورہ کے بغیر کرے ؟

دولت رام :۔ جی ہاں، یہ بات واقعی کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔ ممکن ہے اس نے کسی

سے صلاح مشورہ کرکے یہ کام کیا ہو۔

رنجیت سنگھ :۔ رکرُک کر) اور وہ سروجنی کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا ——————!

دولت رام :۔ بے انتہا پریشان ہوکر) اگی سروجنی ؟

رنجیت سنگھ :۔ ہاں —————— یقیناً وہ اس کی محرم راز ہے اور اسے سب کچھ معلوم ہے۔

دولت رام :۔ غلام کے خیال میں تو ایسا نہیں ہے۔

رنجیت سنگھ :۔ تم نہیں جانتے، تمہیں ہم شریک جُرم قرار نہیں دیتے۔ سوال تمہارا نہیں سروجنی کا ہے۔

دولت رام :۔ میں نے ابھی یہاں حاضر ہونے سے پہلے اس سے دریافت کیا تھا۔ یہ کیا ہوا ؟ کیسے ہوا ؟

رنجیت سنگھ :۔ پھر اس نے کیا کہا ؟ کیا جواب دیا ؟

دولت رام :۔ وہ رونے لگی —————— میں نے اس سے کہا۔ تو نے کیسے جانے دیا اسے ؟ وہ اور زیادہ رونے لگی۔ اس نے کہا اگر مجھے معلوم ہوتا، وہ ایسا کرے گی تو میں سایہ کی طرح اس کے ساتھ رہتی اور کسی طرح سے نہ جانے دیتی۔

رنجیت سنگھ :۔ تم ہمارے ہم خیال معلوم ہوتے ہو۔ اسی لئے تم نے اس سے پوچھا کہ اس نے امرت کور کو کیسے جانے دیا ؟

دولت رام :۔ جی —————— میرے آقا ——————!

رنجیت سنگھ :۔ اور تم نے ابھی کہا تھا وہ رونے لگی۔

دولت رام :۔ جی ہاں —————— وہ اب تک رو رہی ہے۔

رنجیت سنگھ :۔ یہ وہ نہیں رو رہی اس کا مجرم ضمیر رو رہا ہے —— سمجھے ؟

دولت رام :۔ لیکن میرے آقا ——————۔

رنجیت سنگھ:۔ اور تم نے یہ بھی کہا تھا کہ اس نے کہا، اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں سایہ کی طرح اس کے ساتھ رہتی اور اسے ہرگز نہ جانے دیتی ——————؟

دولت رام:۔ جی —————— یہ میں نے عرض کیا تھا۔ بے شک عرض کیا تھا۔

رنجیت سنگھ:۔ یہ بیان اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنا جرم چھپا رہی ہے۔

دولت رام:۔ جرم ——————؟ سروجنی مجرم ہے میرے آقا کی نظر میں۔

رنجیت سنگھ:۔ ہاں —————— کیونکہ ہماری اطلاع کے مطابق، جس رات کو امرت کور بھاگی ہے، اس دن سروجنی برابر اس کے ساتھ رہی اور ہنس ہنس کر اس سے باتیں کرتی رہی۔

دولت رام:۔ میں نہیں جانتا میرے آقا۔

رنجیت سنگھ:۔ ہاں ہم جانتے ہیں، تم نہیں جانتے۔ ہماری اطلاع بھی یہی ہے کہ اس واقعہ کا تمہیں علم نہیں۔

دولت رام:۔ جی بجا ارشاد ہوا۔

رنجیت سنگھ:۔ اور یہ بھی سن لو کہ ہمیں تمہاری وفاداری، جاں نثاری پر ذرا بھی شبہ نہیں ہے۔

دولت رام:۔ اگر ذرا بھی شبہ ہو تو مہاراجہ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں خود اپنی گردن اپنے ہاتھ سے کاٹ کر نذر کر دوں گا۔

رنجیت سنگھ:۔ راسمالت کے ساتھ، نہیں نہیں۔ ایسا خیال کبھی بھولے سے بھی نہ کرنا۔ ہمارے دل میں تمہاری عزت ہے، قدر ہے، منزلت ہے —————— بے شک ہم سروجنی کا بیان لیں گے، اس پر جرح کریں گے اور اگر وہ مجرم ثابت ہوئی تو اسے سزا بھی دیں گے۔ لیکن تمہاری قدر و منزلت اور عزت و توقیر میں کوئی فرق نہیں آئے گا بلکہ کچھ اضافہ ہی ہوگا۔ ہو سکتا ہے سروجنی کو مجرم ثابت ہونے پر جو سزا

دی جائے وہ تمہاری سربلندی کا ذریعہ بن جائے ۔

یہ عجیب وغریب بات دولت رام کی سمجھ میں ذرا بھی نہ آئی ۔ وہ بکا بکا اپنے آقائے ولی نعمت کا منہ دیکھنے لگا ۔

رنجیت سنگھ نے اس کی یہ کیفیت بھانپ لی ۔ اس نے بڑے شفقت بھرے لہجہ میں کہا :۔

۔تم ذرا بھی ہراساں نہ ہو ۔ تمہیں کسی طرح کا گزند نہیں پہنچ سکتا ، لیکن سردجنی ضرور کسوٹی پر کسی جائے گی ۔ اس کا امتحان ہم ضرور لیں گے ۔ ہم نے اسے بلوایا ہے ۔ وہ آتی ہی ہو گی ۔ ابھی تمہیں معلوم ہو جائے گا ۔ ہمارا خیال صحیح ہے یا غلط ———— ۔

باب ۳۲

دولت رام کی گھبراہٹ

مہاراجہ کی ان باتوں نے دولت رام کو حواس باختہ کر دیا۔ وہ سوچنے لگا۔ آج صبح میں کس کا منہ دیکھ کر اٹھا تھا، جو نا شدنی اور ناگفتنی بلکہ ناقابلِ برداشت حوادث کا شکار ہو رہا ہوں ——————؟

وہ سوچنے لگا بھلا ایسا ہو سکتا ہے کہ میری بہن سروجنی مجرم ہو؟ وہ امرت کور کو فرار ہونے میں مدد دے؟

لیکن مہاراجہ کو یقین ہے کہ یہ جرم اس سے سرزد ہوا۔ وہ اسے سزا دینے پر تلے ہوئے ہیں اور ستم ظریفی تو دیکھئے۔ فرماتے ہیں سروجنی کو سزا ضرور ملے گی۔ لیکن یہ سزا میری سربلندی کا ذریعہ ثابت ہوگی۔ شائد اشک شوئی کے لئے وہ میری تنخواہ و منصب اور مقام و مرتبہ میں اضافہ کردیں گے۔ لیکن لعنت ہے ایسے بھائی پر جو اپنی چھوٹی اور چھوٹی بہن کو سزا دلائے۔ اپنے لئے سربلندی حاصل کرے۔ جاہ و منصب حاصل کرے؟ میں سروجنی کی سزا یابی کے بعد ہرگز کوئی انعام، کوئی بخشش، کوئی جاگیر، کوئی عطیہ نہیں قبول کر سکتا۔ بلکہ جو کچھ میرے پاس ہے اس سے بھی دست بردار ہو جاؤں گا۔

میں جانتا ہوں مہاراجہ کی سزا کیسی ذلت بخش اور عبرت انگیز اور لرزہ خیز ہوتی ہے میری آنکھوں کے سامنے میری بہن کو سزا دی جائے، اور میں زندہ رہوں؟ میں دیکھتا رہوں؟ میں یہ سب کچھ برداشت کروں؟ —————— ناممکن، قطعاً ناممکن، میں نہیں کہہ سکتا اس وقت جب اسے سزا مل رہی ہوگی، مجھ سے کیا کچھ سرزد ہو جائے۔ لیکن کچھ نہ کچھ سرزد ضرور ہوگا۔

مہاراجہ کی نیّت کا اندازہ تو اس بات سے ہو جاتا ہے کہ انہوں نے سروجنی کو خود اپنے سپاہی بھیج کر طلب فرمایا ہے۔ مانا یہ خلوتِ خاص ہے، یہاں اس وقت کوئی اور موجود نہیں جو گفتگو ہو گی اس میں کوئی غیر شریک نہیں ہو گا۔ لیکن اگر نیّت صاف تھی تو مجھی کو حکم کیوں نہیں دیا کہ جاؤں اور اسے لے آؤں؟ بطورِ خود بلوانے کے صاف معنی یہ ہیں کہ مہاراجہ اسے اور مجھے ذلیل کرنا چاہتے ہیں اور بیان لینے سے پہلے یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ وہ مجرم ہے اور اسے سزا ملے گی، اٹل کر رہے گی۔

خود بخود دولت رام کا ہاتھ تلوار کی میان پر چلا گیا۔

اس نے ہاتھ سے ٹٹول کر محسوس کر لیا کہ میان خالی نہیں ہے، اس میں تلوار ہے لیکن اس تلوار کا مصرف کیا ہو سکتا ہے؟

یہ تلوار میں اپنے آقا پر تو نہیں چلا سکتا، میں اس کا نمک خوار ہوں۔ میرا سارا خاندان اس کی نمک خواری پر فخر کرتا ہے۔ ہم اس کی جاں نثاری اور خدمت گزاری پر فخر کرتے ہیں یہ تلوار کتنی ہی تیز ہو۔ لیکن آقا پر تو نہیں اٹھ سکتی۔

پھر میں کیا کروں گا؟ کیا یہ دلدوز منظر چپ چاپ گم صم بیٹھا دیکھتا رہوں گا؟

نہیں ——————— میں اپنے آقا پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا۔ اس کے قتل کا ارادہ نہیں کر سکتا۔ اس کے ساتھ گستاخی اور سختی سے نہیں پیش آ سکتا۔

لیکن کیا یہ بھی نہیں کر سکتا کہ جو شخص سروجنی کو قتل کرنے کے لئے یا اسے "سزا" دینے کے لئے مہاراجہ کے حکم سے آگے بڑھے، اس کی گردن کاٹ لوں اور پھر اس تلوار کی نوک اپنے سینہ میں پیوست کر لوں۔

بس یہ ٹھیک ہے، یہ کام مجھے کرنا ہے اضرور کروں گا۔ خواہ کچھ ہی ہو۔

کوئی بزدل اور بے غیرت آدمی بھی اتنا بے حس نہیں ہو سکتا کہ اپنی عزّت، آبرو ناموس اور خاندان کی لاج کو اپنی آنکھوں سے لٹتے دیکھے اور خاموش رہے۔ سروجنی صرف

میری بہن نہیں ہے، صرف میرے باپ کی بیٹی نہیں ہے۔ وہ ہمارے خاندان کی ناک ہے، آن ہے، وقار ہے، عزّت ہے، لاج ہے۔ اس کی زندگی بچانے کے لئے اسے ذلّت سے محفوظ رکھنے کے لئے میں سب کچھ کر سکتا ہوں، اور یہ تو وہ کم سے کم ہے جو مجھے کرنا چاہیئے۔

باب ۳۳

بچاری سروجنی

دولت رام اسی فکر میں بیٹھا پہلو بہ پہلو بدل رہا تھا کہ سروجنی حاضر ہوگئی ۔ اس وقت اس کی صورت اور کیفیت دیکھنے کے قابل تھی ۔ اسی اضطراب واضطرار نے اس کے چہرے پر ایک عجیب قسم کی دل آویزی اور رعنائی پیدا کر دی تھی ۔ اس کے دل میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے ۔ وہ سخت فکر مند تھی کہ مہاراجہ نے اسے کیوں طلب فرمایا ہے ؟

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

اس نے مہاراجہ کو بارہا دیکھا تھا ۔ ایک آدھ مرتبہ کچھ دیر کے لئے وہ اس کے غریب خانہ پر تشریف لائے تھے ، وہ ایک بار امرت کور کے گھر میں اور اس کی موجودگی میں اسے ہمکلام ہونے کی عزت بھی حاصل ہوئی تھی ۔ لیکن اس طرح دردِ دولت پر تو انہوں نے کبھی یاد نہیں فرمایا تھا ———— پھر ———— آج یہ نئی بات کیوں ہوئی

پھر یہاں آکر اس نے اپنے بھائی دولت رام کو جس حالت میں دیکھا ۔ اسے دیکھ کر وہ اور گھبرا گئی ۔ اس کا چہرہ اترا ہوا کیوں ہے ؟ یہ پریشان کیوں نظر آرہے ہیں ؟

ان کے چہرے پر ہوائیاں کیوں اُڑ رہی ہیں ؟ خوف اور دہشت کے آثار کیوں نظر آرہے ہیں ؟

اور پھر جس بارہ دری میں اس وقت مہاراجہ رونق افروز تھے ۔ وہاں کی فضا ایسی ڈراونی

اور وحشت انگیز کیوں ہے؟ ———— یہ سناٹا، یہ سکوت، یہ گھٹی گھٹی سی فضا آخران سب باتوں کا کیا مطلب ہے؟

وہ یہ سوچ رہی تھی اور مہاراجہ بار بار اس پر اس پر نگاہِ غلط انداز ڈال رہے تھے۔ دفعتہً قفل سکوت ٹوٹا، فضا میں مہاراجہ کی آواز گونجی۔

"سروجنی! تم آگئیں ————؟"

وہ ادب اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ گویا ہوئی۔

"آگئی میرے آقا! آپ نے طلب فرمایا تھا ایسا کیوں کر ممکن تھا کہ کنیز حاضر نہ ہوتی۔"

رنجیت سنگھ:۔ ہوں ———— تمہیں امرت کور کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟

سروجنی:۔ بس صرف اتنا ہی کہ وہ چلی گئی۔

رنجیت سنگھ:۔ کہاں گئی، یہ نہیں معلوم ————؟

سروجنی:۔ بالکل نہیں، وہ میری بڑی عزیز سہیلی تھی، میری اس سے، اس کی مجھ سے کوئی بات پوشیدہ نہیں تھی۔ ہم دونوں کا زیادہ تر وقت آپس ہی کی تفریحوں اور دلچسپیوں میں گزرتا تھا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے اپنی کوئی بات اس سے یا اس نے مجھ سے چھپائی ہو۔

رنجیت سنگھ:۔ تم سچ کہہ رہی ہو۔ ہم تمہاری صاف بیانی اور راست گوئی سے خوش ہوئے۔

سروجنی:۔ لیکن زندگی میں پہلی مرتبہ یہ فرار کا کام اس نے مجھ سے چھپا کر کیا، وہ بھاگ گئی اور مجھے پتہ بھی نہ چل سکا۔ میں اس کے عندیہ، چہرے بشرے، چال ڈھال وضع و انداز کسی چیز سے بھی یہ نہ سمجھ سکی کہ اس کا ایسا ارادہ ہے۔

رنجیت سنگھ:۔ یہ جھوٹ ہے۔ تم غلط کہتی ہو، تمہیں سب کچھ معلوم ہے۔

سروجنی:۔ (برہمی کے ساتھ تلملا کر) میں کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ کسی کے سامنے بھی نہیں۔ خواہ میری گردن پر تلوار ہی کیوں نہ رکھ دی جائے۔

رنجیت سنگھ:- تو پھر تمہیں بتانا چاہیئے۔ تم امرت کور کے بارے میں کیا کیا جانتی ہو؟
سروجنی:- جو کچھ جانتی تھی بتادیا۔ اگر آپ کوئی خاص بات پوچھنا چاہتے ہیں تو پوچھئے۔ اگر معلوم ہوگا تو بتادوں گی ورنہ انکار کر دوں گی۔
رنجیت سنگھ:- سروجنی کی بیباکی سے متاثر ہوکر) تو بتاؤ امرت کور اور مسلمان جاسوس کے درمیان کیسے تعلقات تھے؟
سروجنی:- مجھے صرف اتنا علم ہے کہ وہ اس کی ہمدرد تھی۔ اس کے مصائب سے کڑھتی تھی۔
رنجیت سنگھ:- (بہت زیادہ برہمی کے ساتھ چیخ کر) وہ اس کی ہمدرد تھی، اس کے مصائب پر کڑھتی تھی۔
سروجنی:- کٹہرے والا واقعہ بیان کر کے) میری آنکھوں نے صرف یہ دیکھا ہے اور سچی بات یہ ہے کہ میرا دل بھی قیدی کی اس مصیبت پر کڑھتا تھا۔ ——————
رنجیت سنگھ:- اپنا ذکر نہ کرو —————————— ہاں تو امرت کور اس کے لئے کڑھا کرتی تھی۔
سروجنی:- جی بہت زیادہ۔
رنجیت سنگھ:- کیا دونوں میں بات چیت بھی ہوا کرتی تھی؟
سروجنی:- میں نے تو قیدی کو بے شک کئی دفعہ چھیڑا، بنایا، پریشان کیا، دق کیا۔ لیکن امرت کور کو اس سے بات کرتے کبھی نہیں دیکھا۔
رنجیت سنگھ:- وہ گھُنی تھی —————— اچھا یہ بات تھی؟
سروجنی:- جی —————— میں تو اتنا ہی جانتی ہوں۔
رنجیت سنگھ:- تو ضرور امرت کور اس فکر میں ہوگی کہ اسے بھگا دے؟
سروجنی:- جی ہاں —————— اس نے کئی مرتبہ مجھ سے کہا کہ میں کوئی ایسی تدبیر بتاؤں جس سے قیدی کی گلو خلاصی ہوسکے۔

رنجیت سنگھ :۔ اچھا معاملہ یہاں تک پہنچ چکا تھا ــــــــــــ پھر تم نے کوئی تدبیر بتائی؟

سروجنی :۔ جی ہاں، دو ایک تدبیریں بتائیں تو، لیکن وہ اسے پسند نہ آئیں۔

رنجیت سنگھ :۔ اُف ــــــــــــ کیسے کیسے سانپ پلتے رہے ہیں؟ ــــــ پھر؟

سروجنی :۔ بس اور کچھ نہیں۔

رنجیت سنگھ :۔ تمہاری تدبیریں سن کر اس نے کیا کہا؟

سروجنی :۔ کہنے لگی، تم کچھ نہیں کر سکتیں، اپنا کام اپنے ہی سے خوب بنتا ہے۔

رنجیت سنگھ :۔ (مشتعل ہو کر) اپنا کام ــــــــــــ یہ اس کا کام تھا۔ کورنمک!

سروجنی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

رنجیت سنگھ :۔ پھر ــــــــــــ اس کے بعد ــــــــــــ؟

سروجنی :۔ بس اس کے سوا میں کچھ نہیں جانتی، جو کچھ معلوم تھا، بتا دیا۔

رنجیت سنگھ نے دولت رام کی طرف دیکھا اور گرج کر کہا۔

"کیا اب بھی تم کہو گے کہ سروجنی بے گناہ ہے؟"

دولت رام کی گردن جھکی رہی، اس نے کچھ جواب نہیں دیا۔

رنجیت سنگھ :۔ سروجنی کو معلوم ہے کہ امرت کور قیدی کو رہا کر دینا چاہتی تھی۔ لیکن یہ نہیں معلوم کہ اس سے محبت کرتی تھی۔ یہ معلوم ہے کہ وہ قیدی کے لئے کڑھا کرتی تھی۔ اس کے مصائب دیکھ دیکھ کر پریشان ہوتی تھی۔ لیکن یہ نہیں معلوم کہ وہ اس کے ساتھ گئی یا نہیں؟ اور گئی تو کیوں گئی؟ کس طرح گئی؟ ہم یہ سمجھتے تھے۔ کہ واقعی سروجنی کو امرت کور کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں معلوم ہوگا۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ وہ سب کچھ جانتی ہے ــــــــــــ کیوں دولت رام! کیا اب بھی تم اسے بے گناہ اور معصوم سمجھتے ہو؟

دولت رام کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔

رنجیت سنگھ نے سروجنی سے کہا۔

"تم نے بہت بڑا جرم کیا۔ ہم سے یہ باتیں چھپائیں۔ تمہارا فرض تھا کہ ان واقعات سے ہمیں مطلع کرتیں؛

سروجنی:۔ کیا اپنی بہن اور سہیلی کی مخبری کرتی؟

رنجیت سنگھ:۔ ہاں، ملک، قوم اور بادشاہ کے لئے سہیلی کیا چیز ہوتی ہے؛ تمہارا فرض تھا کہ ان تمام باتوں کو ہمارے علم میں لاتیں۔ لیکن تم نے خاموشی اختیار کی سروجنی خاموش کھڑی ہوئی تھی۔

رنجیت سنگھ:۔ تم پر دو جرم عاید کئے جاتے ہیں۔

یہ کہ تم نے امرت کور کے حالات ہم سے چھپائے۔ نیز یہ کہ تم اب بھی اس کے تمام واقعات ہمیں بتانے پر تیار نہیں ہو۔ اور یہ جرم بہت زیادہ سنگین ہو جاتا ہے جب ہم جانتے ہیں تم اس حقیقت سے بے خبر نہ تھیں کہ امرت کور بہت جلد اس محل کی مہارانی کی حیثیت سے آنے والی تھی، اور یقیناً تم اس سے بھی بے خبر نہیں ہو سکتیں کہ ہم اس سے محبت کرتے تھے ——— تم نے ہماری محبت کو کچلا ہمارے جذبات کو پاؤں سے روند ڈالا۔ ہم پر ظلم کیا۔ ہماری زندگی غارت کر دی۔ ہماری آرزوئیں خاک میں ملا دیں۔ ہمیں کہیں کا نہ رکھا، حالانکہ اگر وقت پر یہ باتیں ہمارے علم میں آگئی ہوتیں تو امرت کور آج مہارانی ہوتی اور اس قیدی کی گردن تڑپتی ہوئی نظر آ رہی ہوتی۔

دولت رام اور سروجنی دونوں کے منہ پر سکوت لگا ہوا تھا اور مہاراجہ جوش و خروش کے عالم میں فرما رہے تھے۔

"اس جرم سے تم انکار نہیں کر سکتیں، تمہیں اس کی سزا ملے گی، اور ضرور ملے گی ——— ہرگز کسی قیمت پر بھی تم سزا سے نہیں بچ سکتیں۔

سروجنی:۔ (استقلال سے) میں سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔

رنجیت سنگھ:۔ (دولت رام سے مخاطب ہوکر) تو سروجنی کو سزا یہ دی جاتی ہے۔

کہ امرت کور کے بجائے وہ ہماری مہارانی بنے گی۔

یہ کہہ کر رنجیت سنگھ نے ایک قہقہہ لگایا۔

دولت رام حیرت سے اپنے آقا کا منہ دیکھنے لگا۔

اور سروجنی اس طرح پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی جیسے اسے سکتہ ہوگیا ہو۔

باب ۳۴

"سروجنی! مَیں بالکل بے بس ہوں"

عام حالات میں اگر رنجیت سنگھ سروجنی کو مہارانی بنانے کا ارادہ کرتا تو شاید دولت رام بھی فرطِ مسرت سے بے قابو ہو جاتا اور سروجنی بھی اس رشتہ کو فخر سے قبول کر لیتی۔ لیکن بدقسمتی سے وہ مہندر سے محبت کرتی تھی۔ مہندر اس سے محبت کرتا تھا۔ ان دونوں کی محبت ہی نے دولت رام کو مجبور کیا تھا کہ وہ دونوں کو ایک دوسرے کا رفیقِ زندگی بننے کی اجازت دے دے۔ منگنی ہو چکی تھی۔ بیاہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس رشتہ سے دونوں گھروں کے تعلقات اور زیادہ مستحکم ہو گئے تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ بھی اس بات سے بے خبر نہیں تھے کہ سروجنی اور مہندر کی شادی ہونے والی ہے۔

سروجنی تو مہاراجہ کا حکم سن کر چکر میں آ گئی۔ اس کی قوّت گویائی سلب ہو گئی۔ دولت رام سے اس کی یہ حالت نہ دیکھی گئی۔ اس نے محسوس کر لیا، اس معصوم اور بے گناہ لڑکی پر اس وقت کیا گزر رہی ہے؟ رنجیت سنگھ کے سامنے زبان کھولنا شیر سے پنجہ لڑانا تھا۔ لیکن دولت رام بہن کی محبت میں یہ کام بھی کر گزرا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ادب کے ساتھ کہا۔

"ہمارے لئے اس سے بڑھ کر خوش بختی کیا ہو سکتی ہے کہ مہاراجہ سے ہمارا رشتہ قائم ہو ——————۔

مہاراجہ نے بات کاٹ کر فیصلہ کن لہجہ میں کہا۔

"ہم جانتے تھے تم یہی کہو گے۔ تمہاری وفاداری اور جاں نثاری کے بارے میں جو رائے ہم نے قائم کی ہے وہ غلط نہیں ہو سکتی۔ اب تمہارا اعزاز بڑھے گا، منصب میں

ترقی ہوگی، اپنے ہم پیشوں اور ہم عصروں میں تمہارا اعزاز زیادہ ہوگا۔ اب تک تم حکومت کے رکن رکین تھے، اب رنجیت سنگھ کی ناک کا بال ہو گے۔ دوسرے لوگ تم سے جلیں گے۔ رشک کریں گے۔ تم پر، تمہارے خلاف سازشیں کریں گے شکایتیں کریں گے اور ہم سازش کرنے والوں کو سزا دیں گے۔ شکایت کرنے والوں کی زبان کاٹ لیں گے۔

دولت رام میں یہ ہمت نہیں تھی کہ وہ مہاراجہ کا قطع کلام کر سکتا، یہ مفصل تقریر کر کے مہاراجہ دم لینے کے لئے رکے۔ دولت رام نے سوچا، اس مختصر سے وقت میں جو کچھ مجھے کہنا ہے کہہ ڈالوں، اس نے کھکھار کر کہا

"جی ——— بجا ارشاد ہوا۔"

اتنی دیر میں مہاراجہ صاحب تازہ دم ہو چکے تھے۔ انہوں نے پھر اپنی تقریر شروع کر دی انہوں نے فرمایا۔

"اور سروجنی ——— اگرچہ ہم اسے سزا دے رہے ہیں لیکن یہ نہ سمجھنا کہ اسے کوئی تکلیف دی جائے گی۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا، اسے بہر حال وہی اعزاز حاصل ہوگا جو ایک مہارانی کو حاصل ہو سکتا ہے۔

دولت رام نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔

"یہ تو بالکل صحیح ہے، واقعی میری اور سروجنی کی اس سے بڑھ کر خوش بختی نہیں ہو سکتی کہ مہاراجہ کی نگاہِ انتخاب سے ہم سرفراز ہوں۔ لیکن بات یہ ہے کہ ———

رنجیت سنگھ:۔ کوئی بات بھی ہے؟ ——— اچھا کہو

دولت رام:۔ بات یہ ہے کہ سروجنی کی مہندر کے ساتھ منگنی ہو چکی ہے۔ بس اس کا خیال ہے، اور کوئی بات نہیں۔

رنجیت سنگھ:۔ (ترش ہو کر) کیسی واہیات بات کرتے ہو، منگنی کیا چیز ہوتی ہے۔؟ ——— منگنی کوئی شادی تو نہیں ہوتی، ہزار بار ٹوٹ سکتی ہے۔

! رجانتے ہوئے لیکن انجان بن کر) کس سے ہوئی منگنی ؟

دولت رام :- مہندر کمار سے ۔

رنجیت سنگھ :- مہندر کمار

دولت رام :- جی وہی ۔

رنجیت سنگھ :- ہم اسے جانتے ہیں ۔ وہی خوش پوشاک ، خوش قطع ، اور خوش وضع نوجوان ——————— ؟

دولت رام :- جی وہی ۔

رنجیت سنگھ :- نہیں ، وہ سروجنی کے لائق نہیں ہے ۔ اگر ہم نے سروجنی کو مہارانی بنانے کا فیصلہ نہ کیا ہوتا تو بھی ہم کسی طرح یہ انمل بے جوڑ رشتہ پسند نہیں کر سکتے تھے ——— کبھی نہیں ، ہرگز نہیں ، کسی قیمت پر نہیں ۔

دولت رام نے کہنے کی دل ہی دل میں کوشش تو بہت کی ، لیکن نہ کہہ سکا کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں ، ایک دوسرے سے پیمان وفا باندھ چکے ہیں وہ جانتا تھا کہ اگر یہ بات میرے لب تک آئی ، تو پھر مہندر کی جان ، مال ، عزت آبرو کسی چیز کی خیر نہیں ہے ۔ وہ یہ بھی جانتا تھا ، ہاتھی سے گنے نہیں چھینے جا سکتے ۔ شیر سے پنجہ نہیں لڑایا جا سکتا ۔

رنجیت سنگھ کی مخالفت نہیں کی جا سکتی ۔ اس کے فیصلہ اور مرضی کی راہ میں جو شخص بھی آڑے آئے گا ۔ اسے موت سے دوچار ہونا پڑے گا ۔ وہ مہندر کو چھوڑ سکتا تھا لیکن یہ نہیں گوارا کر سکتا تھا کہ مہندر کے لئے سروجنی کو موت کے حوالے کر دے اور خود بھی پھانسی پر لٹک جائے ۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ۔

" لیکن اس سلسلہ میں میری دو گزارشیں ہیں ، وہ اگر قبول کر لی جائیں تو میں خوشی سے اس رشتہ کو منظور کر لوں گا "

مہاراجہ سروجنی پر قبضہ کر چکے تھے، وہ جانتے تھے شکار اب ہاتھ سے نکل نہیں سکتا، لیکن اگر خوش گواری کے ساتھ اس کی گردن کاٹی جا سکے تو یہ اور زیادہ بہتر ہے۔ انہوں نے بڑی مستعدی اور آمادگی کے ساتھ فرمایا۔

"شوق سے کہو۔ دو نہیں دس، تمہاری ہر گزارش قبول کی جائے گی۔"

دولت رام:۔ پہلی بات تو میں یہ چاہتا ہوں کہ جب آپ سروجنی کو یہ اعزاز بخش رہے ہیں کہ وہ آپ کی مہارانی ہوگی، تو اتنا کرم اور کیجئے کہ یہ کام بطور سزا کے نہیں ہونا چاہیئے، آپ اس کی خطا بخش دیں۔

مہاراجہ کی یہ باتیں سن کر باچھیں کھل گئیں، ان کا غصہ کافور ہوگیا۔ وہ مسکرانے لگے انہوں نے فرمایا۔

"اور دوسری بات تم کیا کہہ رہے تھے؟"

دولت رام:۔ دوسری گزارش یہ تھی کہ سروجنی کا ڈولا ہمارے گھر سے نکلنا چاہیئے۔

رنجیت سنگھ:۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ ذرا صاف الفاظ میں کہو۔

دولت رام:۔ میں اس عزت افزائی کا متمنی ہوں کہ مہاراجہ ہمارے غریب خانہ پر دولہا بن کر تشریف لائیں، پھر شاہانہ تزک و احتشام، جاہ و جلال، اور دھوم دھام کے ساتھ ——— باقاعدہ شادی کر کے سروجنی کو لے جائیں۔ جس طرح وہ گرفتار ہو کر آئی ہے اس طرح اگر اسے مہارانی سے بھی بڑا کوئی اعزاز بخش دیا جائے تو بھی وہ محل میں ہمیشہ ذلیل نظروں سے دیکھی جائے گی۔

رنجیت سنگھ:۔ (مسکراتے ہوئے) اچھا تمہاری خاطر سے ہم یہ دونوں باتیں منظور کئے لیتے ہیں ——— اب تو تم خوش ہو؟

دولت رام:۔ جی ہاں، اب میں نے اپنی مراد پالی۔

رنجیت سنگھ:۔ تم سروجنی کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ ہم درباری نجومی سے مشورہ کرنے

کے بعد کوئی قریبی تاریخ مقرر کر کے تمہیں اطلاع دیں گے۔ لیکن تم جاتے ہی تیاریاں شروع کر دو۔

دولت رام نے سر جھکا کر آمادگی ظاہر کی اور وہ سروجنی کو ساتھ لے کر اپنی حویلی کی طرف روانہ ہوا۔ سروجنی اب تک خاموش تھی، اس پر اب تک سکتہ کی سی کیفیت طاری تھی۔ وہ اب بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے دولت رام کو دیکھ رہی تھی۔ ان نظروں میں آرزو تھی، التجا تھی، حسرت تھی، بیچارگی تھی۔ گویا وہ کہہ رہی تھی۔ ایک تم تھے جو سب کچھ کر سکتے تھے، مگر تم نے بھی کچھ نہ کیا، ایک تم تھے جس سے میری امیدیں اور آرزوئیں وابستہ تھیں۔ لیکن تم نے بھی میرا ساتھ نہ دیا۔ دولت، اقتدار اور حکومت کے سامنے سربسجود ہو گئے۔ صرف تم ہی تھے جو میرے دل کے حال سے واقف تھے۔ لیکن تم نے بھی مجھے بے سہارا چھوڑ دیا۔ اب میں اپنی قسمت پھوڑنے کہاں جاؤں؟ اب میں کس سے فریاد کروں؟ اب اس دنیا میں کون ہے جو میری داد کو پہنچے گا۔

دولت رام سروجنی کی اس کیفیت کو محسوس کر رہا تھا اور دل ہی دل میں کڑھ بھی رہا تھا اس کے اگر بس میں ہوتا تو وہ سب کچھ کرتا اور سروجنی کو اس ظالم کے پنجہ سے بچا لیتا۔ لیکن اب وہ جذبات کی رو میں بہنے کے بجائے حقیقت پسندی سے کام لے رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس شہر میں اور اس ملک میں اگر رہنا ہے تو رنجیت سنگھ سے سرتابی نہیں کی جا سکتی اس کی بات ماننی ہی پڑے گی۔ اب تک وہ امرت کور سے سخت برہم تھا کہ اس نے ایسی نالائقی کی حرکت کیوں کی؟ لیکن اب وہ اس کی خوش قسمتی پر رشک کر رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا۔ امرت کور خوش قسمت تھی کہ اس مصیبت سے بچ گئی اور سروجنی بد قسمت ہے کہ اس آفت ناگہانی میں پھنس گئی۔

دونوں بہن بھائی خاموش تھے۔ حالانکہ دونوں ایک دوسرے کے بارے ہی میں سوچ رہے تھے۔

حویلی میں داخل ہونے کے بعد دولت رام نے سروجنی کے شانہ پر محبت بھرے انداز میں ہاتھ رکھا اور کہا

"سروجنی! میں بالکل بے بس ہوں۔ اگر مہاراجہ کی بات نہ مانوں تو میری، تمہاری، ھندر کی خیر نہیں ہے۔ ہم تینوں کو نہایت ذلت کے ساتھ موت کے گھاٹ اترنا پڑے گا۔ پھر جب ہم ایک بات ماننے پر مجبور ہی ہیں، تو اس طرح کیوں نہ مانیں کہ ہمارا بھرم قائم رہے ہماری عزت پر حرف نہ آئے۔

سروجنی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

باب ۳۵

"آخر اور آپ کیا چاہتے ہیں ؟"

اور عین اس وقت جب یہاں بے گناہ سروجنی کی قسمت کا ایک دوسرے رنگ میں فیصلہ ہو رہا تھا، امرت کور، لاڈو اور حبیب خاں، اپنی منزل کی طرف رواں دواں چلے جا رہے تھے۔

موسم بہت خوشگوار تھا اور موسم کی اس خوش گواری نے اس مختصر سے قافلہ پر ایک عجیب سرخوشی کی کیفیت طاری کر دی تھی۔

تینوں مسافر گھوڑوں پر سوار تھے۔ بیچ میں حبیب خاں تھا، داہنی طرف امرت کور اور بائیں جانب لاڈو۔ چلتے چلتے لاڈو نے کہا

"ہم لوگ کہاں جا رہے ہیں ————؟"

حبیب خاں کے دل میں لاڈو کی باتوں سے جو نفرت پیدا ہو چکی تھی۔ وہ اب اس کی یہ وفاداری اور جاں نثاری دیکھ کر دور ہو چکی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا

"منزل مقصود کی طرف ————!"

لاڈو :۔ واہ۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ آخر ہم کس شہر میں پہنچیں گے ————؟

حبیب خاں :۔ "بس مجھے غیب کا علم نہیں۔ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا ہم یہاں سے دس قدم بھی آگے جا سکیں گے یا نہیں اور تم یہ پوچھ رہی ہو، ہم کس شہر میں پڑاؤ ڈالیں گے

لاڈو :۔ اب تو بہکی بہکی باتیں چھوڑ دو، یہ باتیں اس وقت جائز تھیں جب تک تم قید تھے پریشان تھے۔ اب آزاد ہو چکے ہو، اور دنیا کی سب سے بڑی نعمت تمہارے قبضہ

میں ہے۔

جبیب خاں :۔ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے تمہاری درانداز یوں اور مخالفتوں کے باوجود مجھے کامیاب کیا۔

لاڈو :۔ اچھا یہ بات ہے۔ بجائے ہمارے شکرگزار ہونے کے الٹے آپ گلہ شکوہ کر رہے ہیں؟ خوب۔

الٹی شکایتیں ہوئیں احسان تو گیا

کسی اور سے نہیں، سرکار سے پوچھ لو۔ دیکھو وہ میرے بارے میں کیا کہتی ہیں!

جبیب خاں :۔ وہ تو رحم، مروّت اور شرافت کا پیکر ہیں۔ شیطان بھی اگر اپنے خلاف ان سے کچھ کہلانا چاہے تو نہیں کہلا سکتا۔

امرت کور کو ہنسی آگئی۔ اس نے کہا

"آپ لوگ آخر میری باتیں کیوں کر رہے ہیں؟"

جبیب خاں :۔ آپ باتیں نہیں کرتیں تو پھر آپ کے بارے میں باتیں کر کے دل کو تسلی دے لیتے ہیں۔

امرت کور :۔ آپ نے اب تک کوئی بات کی بھی؟

جبیب خاں :۔ نہ جانے کتنی باتیں سوچ چکا ہوں۔ لیکن وہ زبان تک آ کے رہ جاتی ہیں

امرت کور :۔ یہ کیوں؟

جبیب خاں :۔ کہنے کی ہمت نہیں پاتا اپنے اندر

امرت کور :۔ آخر وجہ؟ کوئی میں شیر ہوں؟

جبیب خاں :۔ شیر سے میں نہیں ڈرتا۔ اس سے کلّہ بہ کلّہ لڑ سکتا ہوں لیکن آپ کے سامنے زبان یاری نہیں دیتی۔ کتنا بڑا احسان کیا ہے آپ نے مجھ پر، اس کا شکریہ تک نہیں ادا کر سکا۔ آپ کہتی ہوں گی یہ شخص اُجڈ ہے جاہل ہے، وحشی ہے، کندۂ ناتراش

ہے۔ اس میں اتنی انسانیت بھی نہیں کہ اپنے محسن کا شکریہ ادا کر سکے۔

امرت کور:۔ میں یہ کچھ نہیں کہتی۔ اوّل تو میں نے شکریہ کے قابل کوئی کام نہیں کیا، اور اگر کیا بھی تو آپ کے لئے نہیں، اپنے لئے۔

یہ کہتے کہتے امرت کور کی لویں سُرخ ہوگئیں۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا، اور اس نے شرما کر آنکھیں جھکالیں۔

حبیب خاں:۔ یہ نہ کہئے۔

امرت کور:۔ (شرماتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر) پھر کیا کہوں؟

حبیب خاں:۔ آپ نے مجھے نئی زندگی بخشی ہے ——————

لاڈو:۔ آ بابا تو بولنا ہی نہ جانتے تھے، یا کیسے بلبل کی طرح چہک رہے ہیں۔ عجیب چیز ہوتے ہیں یہ مردوے بھی ——————

امرت کور:۔ (مسکراکر) تو چپ نہیں رہے گی؟

حبیب خاں:۔ کہنے دیجئے جو کچھ یہ کہہ رہی ہے۔ بالکل سچ ہے، واقعی پہلے میں خاموش تھا۔ قفل سکوت لگا تھا۔ میرے منہ پر، اور اب میں آپ کے سامنے گفتگو کر رہا ہوں۔ واقعی یہ گستاخی ہے، بے ادبی ہے۔

امرت کور:۔ ایسی باتیں تو نہ کیا کیجئے۔

حبیب خاں:۔ میں نے کوئی ایسی بات تو نہیں کہی، جو آپ کے لئے ناگواری کا باعث ہو اور اگر ایسا کوئی لفظ منہ سے نکل گیا ہو تو معاف کر دیجئے۔

امرت کور:۔ میں نے یہ تو کہا کہ آپ کی ہر بات مان لی، اپنے آپ کو بھی آپ کے حوالہ کر دیا، گھر چھوڑ دیا، قوم چھوڑ دی، مذہب چھوڑ دیا۔ خاندان چھوڑ دیا، ملک چھوڑ دیا اور حد یہ ہے کہ بے انتہا محبت کرنے والے بھائی تک کو آپ کی خاطر چھوڑ دیا۔

حبیب خاں:۔ ہاں، مانتا ہوں۔ آپ کی یہی چیز ہے جس نے مجھے بندۂ بے دام بنا دیا

ہے۔ جب تک زندہ ہوں اس بار احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکوں گا۔ زندگی کی آخری سانس تک شکرگزاری اور ممنونیت کے ساتھ آپ کے اس کرم کو یاد رکھوں گا۔

امرت کور:۔ جی ہاں، لیکن آپ کی کیفیت یہ ہے کہ اب تک اجنبیت کا پردہ اور مغائرت کا حجاب بھی نہ ہٹا سکے۔

حبیب خاں حیرت سے امرت کور کی طرف دیکھنے لگا، وہ بولی۔

میں کچھ غلط تو نہیں کہتی، کیا آپ نہیں محسوس کرتے کہ جب لفظ "آپ" سے آپ مجھے مخاطب کرتے ہیں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں کسی غیر مرد سے گفتگو کر رہی ہوں۔ کیا اتنا کچھ کر چکنے کے بعد بھی میرے اور آپ کے درمیان مغائرت اور اجنبیت کا پردہ حائل رہے گا ——————؟ آخر اور آپ کیا چاہتے ہیں؟ بتایئے، اس سے بھی مجھے دریغ نہ ہوگا۔

یہ کہتے کہتے امرت کور کی آواز بھرا آئی اور اس کی آنکھیں پُرنم ہوگئیں۔

حبیب خاں یہ منظر نہ دیکھ سکا۔ اس نے گھوڑے کی لگام کھینچی۔ وہ رُک گیا۔ حبیب خاں نے کہا۔

دنیا میں مجھے کوئی اتنا عزیز نہیں جتنی آپ —————— جتنی تم!

امرت کور مسکرانے لگی۔ حبیب خاں نے جوش اور ناز کے عالم میں کہا۔

میں نہیں جانتا تھا۔ محبت کسے کہتے ہیں، میری زندگی اس لفظ سے، اس کے معنوں سے نا آشنا ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا مرد کی عورت کے ساتھ اور عورت کی مرد کے ساتھ وفاداری کس طرح کی ہوتی ہے۔ مجھے اس کا احساس بھی نہیں تھا کہ محبت کی سرگشتگی میں انسان کے دل پر کیا گزر جاتی ہے (مسکراتے ہوئے)

مگر اب سالک راہ محبت ہوں تو واقف ہوں ——————

لاڈو :۔ اب تو سب کچھ جان لیا ؟

حبیب خاں :۔ ہاں، جان لیا ——————— لوگوں کے لئے قید خانہ مصیبت کا گھر ہوتا ہے، تکلیف و اذیت کا سبب ہوتا ہے۔ دکھ اور رنج و محن کا پیامبر ہوتا ہے۔ لیکن میرے لئے یہ جیل خانہ جنت تھا۔ وہاں پہنچ کر میں نے وہ نعمت پائی جو کہیں نہیں مل سکتی تھی۔

امرت کور :۔ قید خانہ کا نام نہ لیجئے۔ مجھے اختلاج ہونے لگتا ہے، دل ڈوبنے لگتا ہے میرا۔

حبیب خاں :۔ شاید میری وہ تکلیفیں یاد آجاتی ہوں گی جن سے میں وہاں دوچار ہوا!

امرت کور :۔ ہاں یہی بات ہے۔ اب جب خیال آجاتا ہے اس زندگی کا تو بدن لرز جاتا ہے

حبیب خاں :۔ لیکن یقین کرو، میرے دل سے وہاں کی اتنی خوشگوار یادیں وابستہ ہیں جنہیں کسی طرح فراموش نہیں کر سکتا ———————!

لاڈو :۔ تو ابھی ہم بہت زیادہ دور تو نہیں آئے ہیں، چلو واپس چلیں۔ وہاں آرام سے ان خوشگوار یادوں سے جی بہلایا کرنا۔

امرت کور :۔ تو نہیں چپ رہے گی لاڈو ؟

حبیب خاں :۔ بے شک مجھے وہاں بڑی تکلیفوں اور اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ دن دن بھر دھوپ میں

امرت کور :۔ دھوپ ہی میں نہیں چلچلاتی ہوئی دھوپ میں۔

لاڈو :۔ ایسی دھوپ میں جب چیل انڈا چھوڑ دیتی ہے اور ہرن کالے پڑ جاتے ہیں ـــ

حبیب خاں :۔ ہاں چلچلاتی دھوپ میں دن دن بھر کھڑا رہنا، ایک سوکھی روٹی اور ایک گرم پانی کے آبخورہ پر گزارہ کرنا آسان نہیں ہے۔ لیکن جب آپ کی جھلک دیکھ لیتا تھا تو ہر تکلیف راحت بن جاتی تھی۔ وہ آپ کا ——————— پھر وہی

غلطی ہوگئی ـــــــــــــــــــ وہ تمہارا کبھی کبھی جیل خانہ میں آنا اور خاموش کھڑا ہو جانا کیا کہوں اس منظر سے دل پر کیا گزر جاتی تھی؟

امرت کور:۔ (مسکرا کر) لیکن سروجنی تو خوب باتیں کیا کرتی تھی؟

حبیب خاں:۔ ہاں، شرارت تو اس کی رگ رگ میں بسی ہوئی تھی۔

امرت کور:۔ میری بڑی پیاری سہیلی تھی، مجھے بہت یاد کر رہی ہوگی، نہ جانے بیچاری اب کس حالت میں ہوگی؟

لاڈو:۔ میں بتاؤں وہ کس حالت میں ہوگی؟

امرت کور:۔ تو کیا جانے، خواہ مخواہ بک بک کیا کرتی ہے؟

لاڈو:۔ ضرور مہاراجہ نے اس سے شادی کرلی ہوگی۔

امرت کور:۔ چل ہٹ۔

لاڈو:۔ میں نے کئی دفعہ کن انکھیوں سے مہاراجہ کو اسے تاکتے ہوئے دیکھا ہے، اور آپ کے آجانے کے بعد اس کے سوا اور ہے کون جس پر وہ توجہ کریں گے؟

امرت کور ہنسنے لگی، اس نے کہا

"تو بڑی بیہودہ ہے، خدا اس کے مندر کو سلامت رکھے، دونوں بہت محبت کرتے ہیں ایک دوسرے سے۔

حبیب خاں:۔ ہم دونوں سے بھی زیادہ؟

امرت کور شرما گئی، اس نے گردن جھکالی اور خاموش ہوگئی۔

باب ۳۶

حبیب خاں اور کرتار سنگھ کی ملاقات

یہ چھوٹا سا قافلہ یونہی دل کی باتیں کرتا، دل کی باتیں سنتا، محبت کے راگ گاتا اور محبت کے گیت سنتا، ساری دنیا سے بے فکر اپنے راستہ چلا جا رہا تھا۔ یکایک امرت کور نے کہا

"پیاس لگی ہے بڑی دیر سے"

حبیب خاں نے شکایت آمیز لہجہ میں کہا۔

"تو بتایا کیوں نہیں ——————؟

امرت کور:۔ راستہ میں کوئی کنواں بھی تو نظر نہیں آیا۔

حبیب خاں:۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔ میں تو کہیں نہ کہیں سے لاتا ڈھونڈ کر۔

امرت کور:۔ (مسکرا کر شوخ لہجہ میں) تو اب لے آئیے جا کر۔

حبیب خاں:۔ ابھی آیا (ادھر ادھر دیکھ کر) وہ سامنے کوئی کھنڈر سا نظر آ رہا ہے۔ چلو تم اور لاڈو وہاں بیٹھو، میں ابھی آیا، ذرا دیر میں"

امرت کور:۔ میں تو نہیں جاتی۔

حبیب خاں:۔ (مسکرا کر) کیوں ڈر لگتا ہے؟

امرت کور:۔ اور کیا نہیں لگتا ہے؟

حبیب خاں:۔ آؤ، میں ساتھ چلتا ہوں۔

پھر حبیب خاں ان دونوں کو لے کر اس کھنڈر میں آیا۔ نہ جانے کب کی اور کس کے عہد کی عمارت تھی، اب تو یکسر ویران پڑی تھی۔ اچھا خاصا صحن تھا۔ بیچ میں ایک بارہ دری تھی

اس کے ایک طرف کچھ کوٹھڑیاں تھیں - یہاں کا جائزہ لینے کے بعد حبیب خاں نے کہا -

"کوئی کنواں تو یہاں سے نہیں ، ویران اور سنسان جگہ ہے ، للذا یہاں کوئی آنے سے رہا تم بیٹھو میں ابھی آیا ۔"

امرت کور نے سہمے ہوئے انداز میں کہا ۔

"نہیں مجھے ڈر لگے گا ۔"

حبیب خاں مسکرایا ۔

"اچھا تو میں ایک ترکیب کرتا ہوں آؤ ۔"

وہ دونوں کو لے کر ایک کوٹھڑی میں پہنچا ۔اس نے کہا ۔

"آپ دونوں یہاں تشریف رکھیئے ، اندر سے کنڈی لگا لیجئے ۔ میں باہر سے لگا لیتا ہوں ، پھر جب میری آواز سن لیجئے گا ، تب کھولیئے گا ۔"

"یہ معقول تجویز تھی ۔ امرت کور مان گئی ۔ لاڈو نے کہا ۔

"لیکن مجھے بھوک بھی لگی ہے ۔"

حبیب خاں نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا

"اس کا بندوبست بھی کرتا آؤں گا ۔"

وہ باہر نکلا آس پاس کہیں کنواں نظر نہ آیا ، وہ آگے بڑھا چلا گیا ۔ کچھ دُور چلنے کے بعد اسے کچھ سوار نظر آئے ۔ بظاہر یہ سکھ ہی تھے ، حبیب خاں نے کوئی پروا نہیں کی کیونکہ وہ بھی سکھ لباس میں تھا اور خالص سکھ معلوم ہوتا تھا ۔ وہ ڈرتا ہوا ان کے اندر چلا گیا ۔ اس نے سوچا یہاں پانی بھر ا جائے گا ۔ اور شاید کچھ کھانے کا بندوبست بھی ہو جائے ۔ اس کیمپ میں پہنچ کر سب سے پہلے ا ، نگاہ جس شخص پر پڑی وہ کرتار سنگھ تھا ۔

کرتار سنگھ کو دیکھ کر حبیب خاں کا خون خشک ہو گیا ۔ اسے اپنی جان کی پروا نہیں تھی ۔ وہ یہ سوچنے لگا اگر اس نے پہچان لیا تو امرت کور اور لاڈو کا کیا حشر ہو گا ؟ یہ سوچ کر اس نے

واپس جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن کرتار سنگھ کی اس پر نظر پڑ گئی۔ وہ آج ہی اپنی مہم سے آیا تھا اور لاہور واپس جا رہا تھا یہاں دم لینے کے لئے کچھ دیر ٹھہر گیا تھا۔ موسم چونکہ خوشگوار تھا۔ اس نے سوچا آج یہیں خیمہ لگایا جائے۔ سپاہی تھک گئے ہیں ذرا سستا لیں گے اور کل صبح صبح ہم لاہور روانہ ہو جائیں گے۔ کرتار سنگھ نے ایک غیر آدمی کو اپنے کیمپ میں دیکھ کر پوچھا۔

"تو کون ہے؟"

حبیب خاں سٹ پٹا گیا۔ اس نے گھبراتے ہوئے لہجہ میں کہا۔

"میرا نام سندر سنگھ ہے۔"

کرتار سنگھ ہنسنے لگا۔

"ہاں تو سندر تو واقعی ہے۔ لیکن یہاں ہمارے خیمہ میں تو نے آنے کی جرآت کیسے کی؟"

حبیب خاں نے ہمت کر کے جواب دیا۔

"صاحب بات یہ ہے۔ میرا ایک بوڑھا باپ ہے، اندھی ماں ہے۔ ان دونوں کو میری شادی کی بہت فکر ہے۔ ایک گاؤں میں انہوں نے میری سگائی کر دی ہے، وہیں جا رہے تھے۔

کرتار سنگھ:۔ لیکن جاتے جاتے یہاں کیسے آ گئے تم؟"

حبیب خاں:۔ باپ کو پیاس لگی۔ ماں کو بھوک نے ستایا۔ میں نے ان دونوں کو ادھر دُور ایک درخت کے نیچے بٹھا دیا اور دانہ پانی کی تلاش میں چل پڑا۔

دانہ پانی کے لفظ سے کرتار سنگھ بہت محظوظ ہوا۔ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا

"تو ہے تو دیہاتی گنوار۔ لیکن باتیں بڑے مزے کی کرتا ہے۔"

حبیب خاں:۔ مہربانی ہے سرکار کی۔

کرتار سنگھ:۔ لیکن ہمارے خیمہ میں نہ پانی ہے نہ دانہ۔

حبیب خاں:۔ تو پھر صاحب کسی اور طرف نکل جاؤں گا۔ کہیں نہ کہیں تو ملے گا۔

کرتار سنگھ کو ترس آگیا اس نے اپنے ایک آدمی سے کہا۔

"پانی سے اس کی لٹیا بھر دے اور تھوڑی سی پوڑیاں اور حلوہ بھی دے دو اسے، بیچارہ کہاں مارا مارا پھرے گا۔"

آدمی نے اپنے آقا کا فرمان پورا کیا۔ حبیب خاں کی لٹیا پانی سے بھر دی اور اسے بہت سی پوڑیاں اور بہت سا حلوہ دے دیا۔ یہ سب چیزیں لے کر وہ پھر کرتار سنگھ کے پاس آیا۔

"سب چیزیں مل گئیں، اب میں جاتا ہوں، آپ کی مہربانیوں کا دل سے شکر گزار ہوں۔"

کرتار سنگھ نے جیب سے کچھ روپے نکالے اور حبیب خاں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لو یہ روپے اپنی سگائی کی تقریب میں صرف کرنا۔"

حبیب خاں نے وہ روپے لے لئے اور کہا

"صاحب! اپنا نام اور پتہ تو بتا دو۔"

کرتار سنگھ نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"نام اور پتہ پوچھ کر کیا کرے گا؟"

وہ بولا۔

"جب میری شادی ہوگی تو آپ کو بلاؤں گا۔"

کرتار سنگھ کو پھر ہنسی آگئی۔

"احمق کہیں کا۔ ہمیں نہیں جانتے، ہم کون ہیں؟"

حبیب خاں نے بالکل انجان بن کر کہا

"نہیں سرکار میں نہیں جانتا۔ لیکن صورت سے تو بڑے آدمی معلوم ہوتے ہو۔"

کرتار سنگھ نے اکڑ کر کہا

"ہم کرتار سنگھ ہیں، ہمارا نام سنا ہے تو نے کبھی؟"

وہ گویا ہوا۔

"جی سنا تو ہے"

کرتار سنگھ نے امتحان لیا۔

"کہاں رہتے ہیں ؟"

حبیب خاں :۔ یہ تو نہیں جانتا میں ——————— لیکن شہر میں رہتے ہوگے۔

کرتار سنگھ :۔ ہاں ——————— لاہور میں۔ جس کسی سے تو میرا نام پوچھے گا۔ وہ بتا دے گا میں کہاں رہتا ہوں۔

حبیب خاں :۔ تو صاحب میرے بیاہ میں آؤ گے ؟"

کرتار سنگھ :۔ (ہنستے ہوئے) ہاں ضرور آئیں گے ہم۔

حبیب خاں نے شکریہ ادا کیا اور اپنی راہ لی۔ اس کے جانے کے بعد کرتار سنگھ نے اپنے ساتھیوں سے کہا

"یہ گنوار اس قیدی سے بہت ملتا ہوا ہے جسے جاسوسی کے الزام میں مہاراجہ نے گرفتار کیا تھا۔ بس فرق صرف یہ ہے کہ وہ شہری تھا، یہ دیہاتی ہے۔ وہ مسلمان تھا یہ سکھ ہے"

سندر سنگھ یا حبیب خاں کے جانے کے بعد کرتار سنگھ پھر اپنی مصروفیتوں میں منہمک ہوگیا

حبیب خاں یہاں سے نکل کر سیدھا اس کھنڈر میں پہنچا جہاں امرت کور اور لاڈو ایک کوٹھڑی میں بند تھیں۔ پہلے تو اس نے ان لوگوں کو پوریاں کھلائیں، حلوہ نوش جاں کرایا۔ خوب جی بھر کے پانی پلایا اور جب یہ دونوں کھا پی کر سیر ہوگئیں۔ تو اس نے امرت کور سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"ایک خوش خبری سناؤں ———————؟

وہ اشتیاق کے ساتھ بولی

"ضرور سنائیے"

حبیب خاں نے کہا ۔

" یہاں سے صرف چھ میل کے فاصلہ پر سردار کرتار سنگھ اپنا پڑاؤ ڈالے پڑے ہیں "

یہ سن کر امرت کور اور لاڈو دونوں کا خون خشک ہو گیا ۔ دونوں کی گھگھی بندھ گئی دونوں نے کچھ کہنا اور پوچھنا چاہا لیکن زبان نے یاری نہ دی ۔ حبیب خاں نے کہا ۔

" میں جھوٹ نہیں کہتا "

امرت کور:۔ ممکن ہے غلط فہمی ہوئی ہو آپ کو۔

حبیب خاں:۔ (ہنستے ہوئے) غلط فہمی کی ایک رہی ۔ میں تو اس سے مل کر آ رہا ہوں۔

اور پھر اس نے وہ ساری گفتگو دوہرادی، جو اس کے اور کرتار سنگھ کے مابین ہوئی تھی

امرت کور پر کچھ دیر تو سناٹا چھایا رہا ۔ پھر اس نے پوچھا

" اب کیا ہوگا؟"

وہ بولا ۔

" ہوگا کیا اپنی سگائی کے لئے روپے لے کر آیا ہوں ۔ یہ بڑا اچھا شگون ہے " اور یہ کہہ کر اس نے ایک شاندار قہقہہ لگایا ———— لیکن تنہا امرت کور اور لاڈو پر اب تک دہشت چھائی ہوئی تھی ۔

باب ۳۶

وہ مہارانی کس جرم میں بنائی گئی؟

کرتار سنگھ خوش خوش دوسرے روز لاہور پہنچا۔ سب سے پہلے اپنی حویلی میں داخل ہوا۔ وہ چند روز کو کہہ کر گیا تھا، لیکن کئی ماہ بعد واپس آیا۔ اسے امرت کور سے بڑی محبت تھی وہ اس کا بھائی بھی تھا، دوست بھی، اور رفیق بھی۔ اس بار پہلی مرتبہ وہ اتنے دنوں تک مسلسل بہن سے جدا رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا میں جب گھر میں داخل ہوں گا۔ تو امرت کور روٹھی ہوئی ملے گی۔ میں اس سے باتیں کروں گا۔ وہ منہ پھلالے گی اور سیدھی طرح میری باتوں کا جواب نہیں دے گی۔ میں اسے چھیڑوں گا۔ وہ اور زیادہ روٹھ جائے گی۔ وہ شکایت کرے گی۔ اتنے دن کہاں رہے؟ آئے کیوں نہیں؟ خط کیوں نہیں لکھا؟ خیریت کی اطلاع کیوں نہیں دی؟ ایک سانس میں اتنے سارے سوالات کرڈالے گی اور مجھے سب کی جواب دہی کرنا پڑے گی۔ میرے کسی جواب سے اگر وہ مطمئن نہ ہوئی تو کوئی اور عذر تلاش کرنا پڑے گا!

اور ہاں، وہ مجاہدین کا جاسوس، حبیب خاں —————— ممکن ہے مر چکا ہو۔ اتنی سختیاں جو اس پر کی جا رہی ہیں، ایک انسان مشکل ہی سے سہ سکتا ہے۔ میں چلتے وقت امرت کور سے کہہ آیا تھا کہ اسے مرنے نہ دے۔ اس کی زندگی ابھی ہمارے لئے مفید مطلب ہے۔ یقیناً اس نے اچھی طرح اس کی رکھوالی کی ہوگی۔ پھر بھی اگر وہ مر گیا ہو تو مجبوری ہے۔ لیکن اگر وہ زندہ ہے تو اب اسے مرنا پڑے گا۔ اگر اب بھی اس نے میرے سوالات کا تشفی بخش جواب نہ دیا۔ مفید مطلب معلومات نہ بتائے تو مجھے اپنے ہاتھ سے اس کی جان لینی

پڑے گی۔ دشمن کو، اور وہ بھی ایسے خطرناک دشمن کو زیادہ مہلت نہیں دی جا سکتی۔

یہی سب باتیں سوچتا ہوا وہ اپنی حویلی میں داخل ہوا۔ گھر پر ملازموں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ لیکن اس طرح کہ ان کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ ان کے چہروں پر افسردگی اور اداسی چھائی ہوئی تھی۔ ان کی آنکھوں سے غم اور فکر کا اظہار ہو رہا تھا۔

آخر یہ کیا بات ہے؟ یہ ان لوگوں کو میں کس حال میں دیکھ رہا ہوں؟

خیریت تو ہے؟

اور امرت کور کہاں ہے؟ وہ تو میری خبر آمد سنتے ہی دوڑی دوڑی آتی تھی؟ کیا اتنی خفا ہے کہ مجھ سے ملنا بھی نہیں چاہتی؟

کوئی ہرج نہیں، اگر وہ خفا ہے تو میں اسے منالوں گا۔

اس کے مزاج میں اب تک بچپن ہے، میں جانتا ہوں بچوں کو کس طرح بہلایا جاتا ہے

کرتار سنگھ نے اپنے کمرے میں جانے کا ارادہ ترک کر دیا، وہ سیدھا امرت کور کے کمرے کی طرف بڑھا۔

لیکن یہ کیا؟

یہ کمرہ بند کیوں ہے ——————؟

اس میں قفل کیوں لگا ہے؟

اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

لیکن دفعتہً بات اس کی سمجھ میں آگئی۔

ضرور امرت کور سروجنی کے ہاں گئی ہے۔ وہیں روٹھ کر بیٹھی ہے جا کر۔ وہ جانتی تھی اسے نہ دیکھ کر میں سیدھا تیر کی طرح اس کے کمرے میں پہنچوں گا۔

کوئی مضائقہ نہیں۔ سروجنی کا گھر بھی اپنا گھر ہے میں وہاں بھی جا سکتا ہوں۔ اس کے دل کی دھڑکن رک گئی۔

اس کی گھبراہٹ اور تشویش رفع ہوگئی۔

وہ مسکرانے لگا ——————— اور مسکراتا ہوا اپنے کمرہ میں پہنچا۔ یہاں تمام چیزیں سلیقہ سے رکھی ہوئی تھیں۔ دل ہی دل میں امرت کور کے حسن انتظام کی داد دی۔ جلدی جلدی نہایا۔ دھویا، کپڑے بدلے۔ خیال آیا۔ سب سے پہلی فرصت میں مہاراجہ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہیئے۔ اور ان سے سفر کی ساری روداد بیان کر دینا چاہیے۔

لیکن پھر خیال آیا امرت کور سے ملے بغیر مہاراجہ کی خدمت میں حاضر ہونا درست نہیں، میرا جسم وہاں ہوگا، روح یہاں ہوگی۔ زبان وہاں ہوگی خیال یہاں ہوگا۔

اتنے میں گھر کا قدیم اور بوڑھا ملازم ہمت سنگھ ناشتہ لے کر حاضر ہوا۔ اس وقت بھوک بھی زیادہ لگی تھی وہ ناشتہ کرنے بیٹھ گیا۔ پھر اس نے ہمت سنگھ سے کہا۔

"کیا امرت کور ناشتہ کر چکی؟"

ہمت سنگھ کو جواب دینے کی ہمت نہ پڑی۔

ایک لمحہ کرتار سنگھ نے انتظار کیا پھر حکم دیا۔

"جاؤ امرت کور کو بلا لاؤ۔"

اب ہمت سنگھ کی زبان کھلی۔

"سرکار! وہ یہاں ہیں کہاں؟"

کرتار سنگھ نے ہنستے ہوئے کہا

"میں جانتا ہوں وہ یہاں نہیں ہے۔ سروجنی کے ہاں چھپی بیٹھی ہے۔ دونوں کو بلا لاؤ۔"

ہمت سنگھ:۔ جی ———————

کرتار سنگھ:۔ جی وی کچھ نہیں۔ اگر امرت کور آنے سے انکار کرے تو سروجنی سے کہنا کرتار سنگھ نے اسے بھی بلایا ہے۔ دونوں کو انعام ملے گا منہ مانگا۔

یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا اور ہمت سنگھ بیچارگی کی تصویر بنا چپ چاپ کھڑا رہا۔ کرتار سنگھ نے ہمت سنگھ کو گھورا اور ذرا تلخی کے ساتھ کہا۔

جانتے کیوں نہیں۔ یہاں کھڑے کھڑے کیا کر رہے ہو؟

ہمت سنگھ:۔ کہاں جاؤں میرے سرکار ——————؟

کرتار سنگھ:۔ سروجنی کے پاس۔ امرت کور نہیں آتی نہ آئے سروجنی ہی کو لے آؤ۔

ہمت سنگھ:۔ لیکن سروجنی دیوی اب یہاں کہاں ہیں!

کرتار سنگھ:۔ (حیرت سے) سروجنی دیوی اب یہاں کہاں ہیں؟ کیا مطلب ہے۔ تمہارا؟ وہ کہاں گئی؟

ہمت سنگھ:۔ مہاراجہ کے محل میں۔

کرتار سنگھ:۔ کیا بک رہے ہو تم!

ہمت سنگھ:۔ سرکار! میں جھوٹ نہیں کہتا، سروجنی دیوی اب مہارانی ہیں۔

کرتار سنگھ:۔ (فرط حیرت سے بے قابو ہو کر) کیا کہا سروجنی دیوی اب مہارانی ہیں؟

ہمت سنگھ:۔ جی سرکار —— کل ہی تو ان کا ڈولا گیا ہے بڑی دھوم دھام سے

کرتار سنگھ:۔ مگر یہ ہوا کیا؟

ہمت سنگھ:۔ دنیا میں سب کچھ ہوتا ہے میرے سرکار!

کرتار سنگھ:۔ بیچارہ مہندر اب کیا کرے گا ——————؟ وہ میرے ساتھ مہم پر گیا تھا۔ کتنا خوش تھا اپنے حال اور مستقبل سے۔ میں اسے وہیں چھوڑ آیا ہوں وہ چند روز بعد آئے گا اور جب اس حادثہ کی اطلاع اسے ہو گی۔ تو پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے غریب پر۔

ہمت سنگھ:۔ جی اور کیا؟

کرتار سنگھ:۔ لیکن مجھے سروجنی سے یہ امید نہ تھی۔ کتنی محبت کرتی تھی وہ اس

ہے ——— کیا یہ سب فریب تھا ؟

ہمت سنگھ:۔ لیکن سرکار! سروجنی دیوی کی کوئی خطا نہیں۔ان کی تو روتے روتے آنکھیں سوج گئی ہیں۔

کرتار سنگھ:۔ (اور زیادہ پریشان ہوکر) کیا کہہ رہے ہو تم ؟

ہمت سنگھ:۔ جی سرکار! میں جھوٹ نہیں کہتا۔ بوڑھا ہمت سنگھ جھوٹ نہیں بولتا۔

کرتار سنگھ:۔ تو کیا یہ شادی سروجنی کی مرضی کے خلاف ہوئی ہے ؟

ہمت سنگھ:۔ جی سرکار! بالکل خلاف مرضی مجھے تو شبہ ہے کہ وہ لڑکی اتنے بڑے غم کو جھیل بھی سکے گی یا نہیں ؟

کرتار سنگھ:۔ (کچھ سوچتے ہوئے) یہ بہت بڑا ہوا ——— کاش! میں دو دن پہلے یہاں آ جاتا تو یہ نہ ہونے پاتا۔ مہاراجہ کو میرا مشورہ قبول کرنا پڑتا ———!

ہمت سنگھ:۔ اگر آپ دو دن پہلے آجاتے تو قیدی بھی نہ بھاگ سکتا۔

کرتار سنگھ:۔ کس قیدی کو کہہ رہے ہو تم ؟

ہمت سنگھ:۔ حبیب خاں کو، وہی مسلمانوں کا جاسوس۔

کرتار سنگھ:۔ (حواس باختہ ہوکر) وہ بھاگ گیا ؟

ہمت سنگھ:۔ جی ——— وہ بھاگ گیا اور غضب یہ کیا کہ تنہا نہیں بھاگا۔

کرتار سنگھ:۔ (کڑک کر) کیا کسی کو اغوا کرکے لے گیا ہے اپنے ساتھ ———؟

ہمت سنگھ:۔ جی! اسی دن سے امرت کور بھی لاپتہ ہے۔سب یہی کہتے ہیں وہ قیدی کے ساتھ چلی گئی وہ قیدی سے محبت کرتی تھی۔

کرتار سنگھ:۔ (برہم ہوکر) ہمت سنگھ ———؟

ہمت سنگھ:۔ جی سرکار ——— ہمت سنگھ جھوٹ نہیں بولتا۔اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا ———!

کرتار سنگھ:۔ تم جھوٹے ہو۔ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔

ہمت سنگھ:۔ کاش میں جھوٹا ہوتا ——————!

کرتار سنگھ کی حالت اس وقت قابلِ دید تھی۔ غصہ سے وہ بے حال ہو رہا تھا۔ اب تک وہ امرت کور کی محبت میں بے حال ہو رہا تھا۔ لیکن اب اگر امرت کور اس کے سامنے آ جاتی تو زندہ نہیں بچ سکتی تھی اس نے ہمت سنگھ سے دریافت کیا،

یہ سب کچھ کیسے ہوگیا ——————؟"

اور پھر ہمت سنگھ کو جو کچھ معلوم تھا، اس نے سب اگل دیا یہ بھی بتا دیا، سرجینی کس جرم میں ماری گئی ہے۔

باب ۳۸

زلیخا

امرت کور کا نام اب زلیخا تھا ——— اب وہ ایک غیر مسلم خاندان کی دوشیزہ نہیں، ایک مسلم گھرانے کی فرد اور ایک مسلمان نوجوان حبیب خاں کی بیوی تھی بظاہر یہ تبدیلی بڑی آن ہونی تھی۔ اس لئے کہ وہ حبیب خاں سے محبت کرنے کے باوجود مسلمان کی کوئی جگہ اپنے دل میں نہ رکھتی تھی۔ وہ اسلام کے نام سے بھڑکتی اور مسلمانوں کے نام سے چونکتی تھی۔ لیکن حبیب خاں کے گھر میں پہنچ کر اور اسی کے ساتھ رہ کر اس نے مسلمانوں کا جو کردار دیکھا اس سے وہ بہت متاثر ہوئی۔ اس کی بھڑک نکل گئی۔ پہلے وہ مانوس ہوئی اور پھر خود ہی تحریک کر کے مسلمان ہوگئی، حبیب خاں نے اس سے اشارۃً بھی اسلام قبول کر لینے کی درخواست نہیں کی تھی۔ لیکن جب وہ خود اسلام قبول کر لینے کی درخواست نہیں کی تھی۔ لیکن جب وہ خود اسلام قبول کر لینے کے لئے مچلی، تو اس کا دل وفور مسرّت سے بے قابو ہوگیا اور وہ اس فیصلہ کا خیر مقدم کرنے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔

جن لوگوں کو وہ لٹیرا، وحشی، درندہ صفت اور بد اطوار سمجھتی تھی، انہیں اس نے دیکھا کہ انسانیت اور شرافت کے بلند ترین معیار کے حامل ہیں۔ ان کا کردار بلند، ان کی سیرت روشن ان کا طرزِ زندگی، اخلاق، حسنِ معاشرت اور پاکیزگی کا مظہر اتم ——— اس نے کوشش کی کہ مسلمان نہ ہو۔ لیکن زیادہ دیر تک اپنے اس عزم پر قائم نہ رہ سکی۔ وہ مسلمان ہونے پر مجبور ہوگئی۔

اس نے پٹھانوں کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ یہ لٹیرے ہوتے ہیں۔ کشت و خون، لوٹ مار، رہزنی اور قزاقی ان کا پیشہ ہے۔ انسانی خون کی اہمیت اور قدر و قیمت

ان کی نظر میں پانی سے زیادہ نہیں۔ یہ وعدے کرتے ہیں اور توڑ دیتے ہیں۔ عہد کرتے ہیں اور اس کی پروا نہیں کرتے پیمان وفا باندھتے ہیں اور اسے مکڑی کے جالے سے زیادہ کمزور سمجھتے ہیں۔ انسانی اقدار کی ان کی نظر میں کوئی وقعت نہیں یہ اور اس طرح کی بہت سی باتیں اس نے سن رکھی تھیں۔

لیکن یہاں آکر اس نے دیکھا اور محسوس کیا۔

خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

آج سے سال چھ مہینہ پہلے اگر زلیخا نے سرحد کی زمین پر قدم رکھا ہوتا اور مسلمانوں کے کسی گھر میں کچھ دن گزارنا پڑے ہوتے تو شاید وہ اپنی سنی ہوئی باتوں کی تصدیق کرتی، اور مسلمان کے بارے میں اس نے جو رائے قائم کر رکھی تھی اس پر قائم رہتی۔ لیکن اب سرحد بدل چکا تھا۔ پٹھانوں کے مزاج، عادات، اخلاق اور سرشت میں بنیادی تبدیلیاں ہو چکی تھیں اب اس صوبہ کے بڑے حصہ پر اسلام کی حکومت تھی۔ قبائلی عصبیت دم توڑ چکی تھی۔ غیر اسلامی رسم و رواج بند ہو چکے تھے۔ اب ہر شخص کی زندگی اسلام کا ایک دلآویز نمونہ تھی۔ اب یہ لوگ پابندی سے نماز پڑھتے رہتے۔ روزہ رکھتے تھے، زکواۃ دیتے تھے۔ یہاں بیواؤں کی شادی کسی صورت میں بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن جب سے شرع کا رواج ہوا تھا یہ آن ختم ہو چکی تھی۔ یہاں بڑی بڑی عمر تک لڑکیوں کو گھر میں بٹھائے رکھتے تھے۔ اور اس حرکت کا مقصد مختلف مصالح کا حصول تھا۔ لیکن اب ایسا نہیں ہوتا تھا۔ یہاں ماں کو، بہن کو، لڑکی کو، بیوی کو کوئی حصہ املاک و جائداد سے نہیں ملتا تھا۔ لیکن اسلامی حکومت شرع کے مطابق ان کا حصہ دلاتی تھی۔ یہاں کے لوگ دوسروں کے حقوق پامال کرنے میں جری تھے۔ لیکن اب یہ تائب ہو چکے تھے۔ اور کسی پر دراز دستی نہیں کرتے تھے یہاں کے لوگ عہد و پیمان کا اسی وقت تک لحاظ کرتے تھے، جب تک ان کے مفاد اور مصالح سے ٹکر نہ ہو۔ اگر ٹکر ہو تو یہ مفاد و مصالح

کو ہر چیز پر ترجیح دیتے تھے۔ لیکن اب ان کی زندگی صدق و صفا کی زندگی تھی۔ ڈھونڈے سے بھی اس طرح کی کوئی مثال نہیں مل سکتی تھی۔ یہ لوگ انتقام کے خوگر تھے۔ باپ کا انتقام بیٹا لیتا تھا اور یہ چکر کئی کئی نسلوں اور پشتوں تک جاری رہتا تھا۔ لیکن جب سے انہوں نے شرع کی حکومت قبول کی تھی، یہ عادت بھی ختم ہوگئی تھی۔ اب کسی کا بوجھ کسی دوسرے پر نہیں ڈالا جا سکتا تھا۔

جب سے حضرت سیّد احمدؒ اور مولانا اسمٰعیلؒ اپنے فداکاروں اور جاں نثاروں کے ساتھ اس سرزمین پر قدم رنجہ ہوئے تھے۔ حالات یکسر بدل گئے تھے۔ پرانے کینے دوستی سے بدل گئے تھے۔ پرانی دشمنی خلوص میں تبدیل ہوگئی تھی۔ جو لوگ باہمی کشت و خون اور لوٹ مار میں مصروف رہتے تھے۔ اب ان کے دل میں جہاد کا جذبہ اور سر میں شہادت کا سودا سمایا ہوا تھا۔ پہلے ان کی قوتیں خانہ جنگی میں، قبائلی جنگوں میں پیکار، باہمی میں، ناحق کے جھگڑوں میں صرف ہوتی تھی۔ اب یہ خدائے واحد کے لئے، اسلام کی سربلندی کے لئے، مسلمانوں کے مجد و وقار کے لئے کفن سر سے باندھ کر میدان میں اترے تھے۔ دنیا ان کی نظروں میں ہیچ تھی۔ انہوں نے ایک بہت بڑا سودا کر لیا تھا۔ دنیا بیچ دی تھی اور آخرت کو لے لیا تھا۔ اب یہ کسی پر ظلم نہیں کرتے تھے۔ کسی کا حق نہیں مارتے تھے۔ کسی پر زیادتی نہیں کرتے تھے۔ کسی سے ناحق انتقام نہیں لیتے تھے۔ اب ان کی زندگی یکسر للہیت اور خدا پرستی کی زندگی تھی۔ یہ مجاہدانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ پہلے کبھی اگر انہوں نے کسی کا حق مارا تو اب اسے تلاش کر کے یہ حق واپس کرتے تھے۔ پہلے کبھی اگر کسی پر زیادتی کی تھی تو آپ اسے ڈھونڈتے تھے۔ اور اس سے معافی مانگ کر اپنا بوجھ اتارتے تھے۔ پہلے کبھی اگر انہوں نے کوئی ناروا ناجائز یا بُری بات کی تھی تو اب اسے یاد کر کے روتے تھے۔ سجدے کرتے تھے۔ گڑگڑاتے تھے اور اپنے خدا سے عفو و رحم کی التجا کرتے تھے۔

حضرت سیّد احمدؒ کے تشریف فرما ہوتے ہی یہاں کے لوگوں کا مزاج بدل گیا تھا۔ یہاں

کی رت بدل گئی تھی، موسم بدل گیا تھا، لوگوں کے مزاج اور طبیعت میں عظیم الشان انقلاب رونما ہوگیا تھا، ایسا انقلاب جس کا اس سے پہلے تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

یہ وہی تھے جن کا سینہ رحم سے، جن کا دل رقت سے، جن کا مزاج انسانیت سے جن کی طبیعت مروت سے، جن کی عادت احسان و سلوک سے بہرہ رکھتی تھی۔ لیکن حضرت سید احمد اور مولانا اسمٰعیل کی وعظ و تلقین نے ان کی کایا پلٹ دی تھی۔ یہ کچھ سے کچھ ہوگئے تھے۔ گھر میں ان سے اچھا باپ اور بھائی اور بیٹا کوئی نہ تھا۔ پڑوس میں ان سے اچھا رفیق اور ہمدم کوئی نہ تھا۔ دوستوں میں ان سے اچھا دوست کوئی نہ تھا ساتھیوں میں ان سے اچھا جاں نثار اور فداکار کوئی نہ تھا، دشمنوں کیلئے ان سے بڑھ کر روادار اور رحم دل کوئی نہ تھا مخالفوں کیلئے ان سے بڑھ کر صابر و شاکر کوئی نہ تھا مسجد میں ان سے بڑھ کر عبادت گزار، متقی اور پرہیزگار کوئی نہ تھا، معاملات میں ان سے بڑھ کر صاف کھرا اور بے لاگ کوئی نہ تھا تو بات کے پکے تھے ان سے بڑھ کر جری اور بیباک کوئی نہ تھا، باطل کی سرکوبی کیلئے ان سے بڑھ کر مستعد اور کارگزار کوئی نہ تھا میدان جنگ میں ان سے بڑھ کر شجاع و دلیر کوئی نہ تھا۔ اسلام کی حرمت پر سر کٹانے میں ان سے آگے بڑھ جانے والا اور ان سے بازی لے جانے والا کوئی نہ تھا ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو تلوار ہے مومن

ان کا حال! بالکل اس کا مصداق تھا —————— یہ اپنوں میں رحیم و کریم تھے اور دشمن اسلام اور دشمن حق و صداقت کے لئے شمشیر آبدار

یہ تھی وہ فضا اور یہ تھا وہ ماحول جس میں زلیخا نے زندگی کے چند دن بسر کئے اور پھر اسلام قبول کرنے پر مجبور ہوگئی۔ اس نے سنا کچھ تھا اور دیکھا کچھ، جو کچھ دیکھا اس سے اتنی متاثر ہوئی کہ اسلام کا کلمہ خود بخود اس کی زبان پر جاری ہوگیا۔

زلیخا کا اسلام زبانی اسلام نہیں تھا، سچا اسلام تھا۔ جب تک وہ مسلمان نہیں ہوئی تھی اسلام سے بیگانہ اور مسلمانوں سے متنفر تھی۔ لیکن اسلام قبول کرنے کے بعد وہ پکی اور سچی

مسلمان بن گئی۔ اب تک اس کے تاثرات صرف مشاہدات پر مبنی تھے۔ اب اثر قبول کرنے اور اسلام کا حلقہ اپنے گلے میں ڈالنے کے بعد اس نے اسلام کی اس حقیقت کو سمجھنے کی کوشش شروع کی اور بہت جلد اس میدان میں بھی وہ آگے بڑھ گئی۔ اس نے اسلام کو، اس کی تعلیم کو اس کے پیام کو، اس کی حقیقت کو سمجھ لیا۔ اس نے نماز کا پڑھنا سیکھا اور پابندی سے نماز پڑھنے لگی۔ اب تک اسے نغمۂ موسیقی سے دلچسپی تھی۔ اب اس نے قرآت کے ساتھ قرآن کی تلاوت بھی سیکھ لی۔ بہت جلد وہ صحیح معنوں میں حبیب خاں کی رفیقۂ حیات بن گئی۔

حبیب خاں زلیخا کی اس تبدیلی کو دیکھتا تھا اور فخر و مسرت سے پھولا نہ سماتا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر حیرت کرتا تھا کہ خاندانی مسلمان ہونے کے باوجود اسلام کے معاملات مسائل سے اسے اتنا شغف نہیں ہے، جتنا زلیخا کو، اسلامی زندگی اس کے ذہن و دماغ میں اس درجہ رچ اور بس گئی تھی کہ اگر ذرا بھی وہ حبیب خاں میں سستی یا غفلت دیکھتی تھی تو سختی سے ٹوک دیتی تھی اور حبیب خاں مسکرا کر سر تسلیم خم کر دیتا تھا۔

باب ۳۹

فقیر کا سفیر بادشاہ کے دربار میں

کرتار سنگھ کو آئے ہوئے کئی دن ہو چکے تھے، لیکن اب تک وہ رنجیت سنگھ کے دربار میں نہیں گیا تھا۔ امرت کور کی گمشدگی نے اس کے اوسان خطا کر دیئے تھے، یہ ایسا صدمہ جانکاہ تھا جس نے واقعی اس کے اعصاب اور ہوش و حواس پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ مہاراجہ خود ایک مرتبہ ذرا دیر کے لئے تشریف لائے تھے اور اسے تسکین و تسلّی دے کر چلے گئے تھے، وہ مہم جنگ کو سزا دینے میں اتنے مصروف و منہمک تھے کہ انہیں کرتار سنگھ کی طرف زیادہ توجہ کرنے کی فرصت بھی نہیں تھی۔

کرتار سنگھ حسب معمول اپنی حویلی میں بیٹھا ہوا ماضی اور مستقبل کی باتیں سوچ رہا تھا کہ دولت رام آیا، دولت رام نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"میں تمہارے پاس ایک ضروری کام کے لئے آیا ہوں"

کرتار سنگھ نے منہ سے کچھ نہیں کہا، سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا وہ بولا۔

"مہاراجہ نے تمہیں یاد فرمایا ہے"

کرتار سنگھ، چلو، چلتا ہوں۔ لیکن کیوں یاد فرمایا ہے؟ کوئی خاص بات تو نہیں؟

دولت رام: خاص ہی بات تو ہے، آج مہاراجہ صاحب کے دربار میں خلیفہؓ صاحب کا سفیر آیا ہے۔ اس سے گفتگو ہوگی ———————— چلو وقت ہوگیا۔ ایسا نہ ہو دیر ہو جائے۔

کرتار سنگھ جلدی سے تیار ہو کر دولت رام کے ساتھ رنجیت سنگھ کے دربار میں پہنچا۔

دربارِ خاص میں اس وقت وزراء اور امراء صف بستہ موجود تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ تختِ حکومت پر جلوہ فرما تھے، اور خلیفہ صاحب کا سفیران کے سامنے بے خوفی اور بے باکی کی تصویر بنا کھڑا تھا۔

رنجیت سنگھ نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کو خلیفہ صاحب نے ہماری خدمت میں بھیجا ہے؟"

سفیر: جی ہاں، میں حضرت امیر المومنین کے حکم سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔

رنجیت سنگھ:۔ فرمایئے! خلیفہ صاحب کا پیام کیا ہے؟

سفیر:۔ امیر المومنین نے فرمایا ہے، ہم حتی الامکان جنگ نہیں کرنا چاہتے، جنگ کسی فریق کے لئے بھی خوشگوار نہیں ہوتی۔

رنجیت سنگھ:۔ بے شک ——————— خلیفہ صاحب نے یہ بڑے کام کی بات کی ہے، ہم بھی جنگ کرنا پسند نہیں کرتے۔ اگر کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ جنگ مل سکے تو ہمیں بڑی خوشی ہوگی!

سفیر:۔ امیر المومنین نے اسی بات کے لئے مجھے یہاں بھیجا ہے۔

رنجیت سنگھ:۔ (اشتیاق کے ساتھ) ہم بڑے شوق سے ان کا پیام صلح سننے کے منتظر ہیں

سفیر:۔ امیر المومنین نے فرمایا ہے کہ بہتر یہ ہے کہ آپ اسلام قبول کر لیجئے۔ اسلام قبول کر لینے کی صورت میں ہم بھائی بھائی ہیں، لیکن ہم آپ کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے، تو پھر جزیہ دینے پر اور ذمّی بننے پر تیار ہو جایئے، اس صورت میں آپ کے جان و مال کی ہم ویسی ہی حفاظت کریں گے جس طرح اپنے جان و مال کی کرتے ہیں، اور اگر یہ صورت بھی منظور نہیں کر سکتے تو پھر جنگ کے لئے تیار ہو جایئے۔

رنجیت سنگھ بڑے تحمّل لیکن نہایت برہمی کے عالم میں یہ باتیں سنتا رہا، پھر اس

لے سکھ دربار کی تحریروں میں حضرت سیّد صاحب کو خلیفہ صاحب ہی لکھا جاتا اور کہا جاتا تھا

نے بادل کی طرح گرجتے ہوئے کہا۔

"ہم خلیفہ صاحب کی عزت کرتے ہیں لیکن انہیں شاید نہیں معلوم کہ یہ پیام بھیج کر انہوں نے ہماری سخت توہین کی ہے۔"

سفیر:۔ اگر میرے منہ سے کوئی ایسی بات نکل گئی ہو جو آپ کے لئے تکلیف دہ ہو میں اس کی معافی چاہتا ہوں، لیکن بات وہی ہے جو میں نے عرض کی۔

رنجیت سنگھ:۔ ہمیں جنگ منظور ہے ——————— !

سفیر:۔ بہت بہتر، میں آپ کا یہ پیام امیرالمومنین کے سمع مبارک تک پہنچا دوں گا۔

رنجیت سنگھ:۔ یہ تو بتایئے خلیفہ صاحب کے پاس فوج کتنی بڑی ہے ——————؟ ساز و سامانِ جنگ کتنا ہے؟ دولت و ثروت کا کیا عالم ہے؟

سفیر:۔ امیرالمومنین کے پاس ایک مختصر سا لشکر ہے، لیکن یہ وہ لوگ ہیں جو موت کو کھیل سمجھتے ہیں۔ جو خدا کی راہ میں قربان ہونے کا عہد کر چکے ہیں، خدا کی قسم، آپ کو شراب سے رقص و سرود سے، نغمہ و موسیقی سے، خوب صورت اور طرح دار نازنینوں سے اتنی شیفتگی نہیں ہے، جتنی ان سر پھرے اور من چلے مجاہدوں کو موت سے ہے، اور جو لوگ مرنے کا تہیہ کرلیں، وہ کبھی نہیں ہارتے، وہ کبھی نہیں مرتے۔

رنجیت سنگھ نے کوئی جواب نہ دیا، سفیر کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا۔

سفیر نے سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"آپ نے پوچھا ہے ہمارے پاس ساز و سامانِ جنگ کی کیا کیفیت ہے۔ ممکن ہے یہ صرف سوال ہو، ممکن ہے، یہ طنز ہو، لیکن میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں، ہمارے پاس آلات و اسلحہ نہ ہونے کے برابر ہیں، لیکن ہم ساز و سامانِ جنگ پر بھروسہ نہیں کرتے، خدا پر کرتے ہیں، فتح و شکست، زندگی اور موت، کامیابی اور ناکامی خدا کے ہاتھ میں ہے وہ ایسے لشکروں کو ذلت بخش شکست سے دو چار کرتا ہے، جن کے پاس ساز و سامانِ جنگ کی کثرت ہوتی

ہے اور ایسے لوگوں کو فتح و کامرانی عطا کرتا ہے، جن کے پاس کچھ نہیں ہوتا، پس یہ سوال کر کے اپنی برتری اور ہماری کمتری ثابت کرنے کی کوشش نہ کیجئے۔ ہو سکتا ہے جنگ کے میدان میں ہم نہتے لوگ آپ کے مسلح سپاہیوں سے ان کے ہتھیار چھین لیں اور جس تلوار سے آپ ہماری گردنیں کاٹنا چاہتے ہیں، وہی تلوار ہمارے ہاتھوں آپ کے سر پر چمکنے لگے۔

رنجیت سنگھ کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ وہ غصہ اور برہمی کے عالم میں بار بار پہلو بدل رہا تھا، لیکن خاموش تھا، اس کے لب گفتگو اور سوال و جواب سے ناآشنا تھے۔

اور سفیر صاحب بدستور فرمائے جا رہے تھے، انھوں نے کہا!

آپ نے یہ بھی پوچھا ہے کہ ہماری جیبوں میں سونے اور چاندی کے سکے کتنے ہیں؟ کوئی شبہ نہیں دنیا میں دولت ہمیشہ سے بہت بڑا اور فیصلہ کن عنصر رہی ہے، اور آج بھی ہے اس دولت سے زمین خریدی جا سکتی ہے، ضمیر خریدے جا سکتے ہیں، ایمان کا سودا کیا جا سکتا ہے انسان مول لئے جا سکتے ہیں، میں جانتا ہوں، آپ کے پاس دولت کی کمی نہیں، کیا نہیں ہے آپ کے پاس، لیکن یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں، جہاں کچھ لوگ دولت دیکھ کر بکنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، وہاں کچھ لوگ ایسے انمول بھی ہوتے ہیں، جو کسی قیمت پر نہیں خریدے جا سکتے، جہاں دولت کے بارے میں یہ صحیح اور درست ہے کہ

اے زر خدا تو خدا نہ، ولیکن بخدا

ستار عیوب و قاضی الحاجاتی

وہاں یہ بھی ایک حقیقت ہے اور اس کی تردید نہیں کی جا سکتی کہ ایسے لوگ بھی اس دنیا میں موجود ہیں جو دولت کے انبار دیکھ کر بھی گرفتار نہیں ہوتے اور پکار اٹھتے ہیں ——!

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں

جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

دولت کی فراوانی اور سیم و زر کی ارزانی آپ کو مبارک، ہم غریب ہیں، فاقہ مست ہیں، کنگال ہیں، کئی وقت گزر جاتے ہیں کہ نان جویں بھی میسر نہیں آتی۔ صرف پانی پی کر اور پتے چبا کر گزارہ کر لیتے ہیں۔ لیکن الحمد للہ کہ نہ ہم خریدے جا سکتے ہیں، نہ کسی کو خریدنا ہمارا مقصود ہے۔"

رنجیت سنگھ کا اضطراب پہلے کے مقابلہ میں کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ لیکن وہ اب بھی خاموش تھا

سفیر نے دریافت کیا۔

"کیا کچھ اور بھی آپ پوچھنا چاہتے ہیں؟"

"نہیں" ——————— رنجیت سنگھ نے کہا، اور کھڑا ہو گیا، جس کا یہ مطلب تھا۔

"دربار برخاست"

باب ۴۰

میں نے اپنا کام کرلیا

دربار برخاست کرنے کے بعد رنجیت سنگھ نے کرتار سنگھ کو اپنے قصرِ خاص میں شرفِ باریابی عطا فرمایا، اس وقت صرف یہی دونوں آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

رنجیت سنگھ نے ایک آہ سرد بھر کر کہا۔

"کرتار سنگھ! تم نے خلیفہ صاحب کے سفیر کی باتیں سن لیں؟"

کرتار سنگھ نے بڑے ادب کے ساتھ جواب دیا۔

"سن لیں مہاراج ——————!"

رنجیت سنگھ:۔ اس گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ خلیفہ صاحب کے اور ان کے ساتھیوں کے حوصلے کتنے بلند ہیں؟ ان کے دم خم کی کیا کیفیت ہے؟"

کرتار سنگھ:۔ اس کا اندازہ میں نے اس دن لگالیا تھا جس دن حبیب خاں ہمارے ہاں جاسوس بن کر آیا تھا۔

رنجیت سنگھ:۔ پنجاب پر تو ہمارا قبضہ اور تسلط مکمل ہے، یہاں کسی میں اتنا دم خم نہیں کہ ہمارے مقابلے میں آسکے۔

کرتار سنگھ:۔ بجا ارشاد فرمایا مہاراج نے!

رنجیت سنگھ:۔ لیکن سرحد کی طرف سے میں مطمئن نہیں ہوں، ایک تو وہاں کے لوگ طبعاً زیادہ مذہبی طبیعت کے ہوتے ہیں، مذہب کے نام پر بڑی آسانی اور سرعت سے وہ بھڑک سکتے ہیں، پھر آزاد قبائل ہیں یہ بھی مذہب کے معاملہ میں ان کا ساتھ

دینے کو تیار ہو جائیں گے۔ اس کے بعد افغانستان سے وہ بھی بڑی آسانی سے میدانِ جنگ میں اتر سکتا ہے اور ہمیں تو معلوم ہوا ہے کہ خلیفہ صاحب کی فوج میں بھی کابل اور قندھار کے بہت سے مجاہد شریک ہیں۔

کرتار سنگھ:- مہاراجہ کا خیال بالکل درست ہے، جن خطرات کی طرف انہوں نے اشارہ فرمایا ہے ان کے واقعی اور حقیقی ہونے میں ذرا بھی شک و شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

رنجیت سنگھ:- اگر یہ خطرہ وقوع میں آگیا تو کیا ہوگا؟ پھر تو معاملات ہمارے قبضہ سے نکل جائیں گے۔ اور سرحد کیا ہمیں پنجاب سے بھی بھاگنا پڑے گا۔ اگرچہ وہاں بدھ سنگھ جیسا سفاک اور خون آشام سردار موجود ہے جس کے نام سے اہل سرحد کانپتے ہیں اور ہری سنگھ جیسا بہادر اور ظالم سردار بھی وہاں موجود ہے۔ جو مکانوں کو ڈھا دیتا ہے۔ کھیتوں کو آگ لگا دیتا ہے۔ لوگوں کو قتل کر دیتا ہے۔ اور ذرا پروا نہیں کرتا کہ ان مقتولین میں بچہ کون ہے عورت کون؟ جوان کون؟ اور بوڑھا کون؟ اور ہمیں جہاں تک معلوم ہے اہل سرحد اس کے نام سے دونوں کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں لیکن پھر بھی اگر وہ متحد ہو جائیں جہاد کرنے کے لئے میدان میں اتر آئیں تو کیا ہوگا؟

کرتار سنگھ:- بہت بڑا ہوگا،

رنجیت سنگھ:- پھر اس کی تدبیر! اس کا علاج؟

کرتار سنگھ:- اگر آپ کے بیان کردہ خطرات وقوع میں آ جائیں تو بے شک حالات قابو سے باہر ہو جائیں گے اور ہم کچھ نہ کر سکیں گے، سوا اس کے کہ یا قتل ہو جائیں، یا اطاعت قبول کر لیں۔

رنجیت سنگھ:- نخوت کے ساتھ، ہم قتل ہو سکتے ہیں لیکن اطاعت قبول نہیں کر سکتے۔

کرتار سنگھ:- بے شک!

رنجیت سنگھ:- لیکن کیا ایسی کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی کہ یہ خطرہ ٹل جائے؟

کرتار سنگھ:۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ خطرہ ٹل گیا ——————!

رنجیت سنگھ:۔ (متحیر ہو کر) کیا کہہ رہے ہو کرتار سنگھ ؟

کرتار سنگھ:۔ میں غلط نہیں کہتا ——————میں اتنے دن تک آخر کیا کرتا رہا ؟ کیا میں اس لئے نہیں گیا تھا کہ اس خطرۂ عظیم کو واقع نہ ہونے دوں !

رنجیت سنگھ:۔ ہاں اسی لئے گئے تھے ——————تو کیا کیا تم نے ؟

کرتار سنگھ:۔ پشاور کے سردار یار محمد کو اور اس کے ساتھیوں کو میں نے اپنا آلۂ کار بنالیا ہے، وہ ہمارا ساتھ دیں گے، ہماری مدد کریں گے، خلیفہ صاحب کو وقت آنے پر یوسف بے کارواں بنا دیں گے۔

رنجیت سنگھ:۔ (کچھ سوچتے ہوئے) سچ کہتے ہو ؟

کرتار سنگھ:۔ میں غلط نہیں کہتا مہاراج! میں اسی لئے گیا تھا اور مجھے فخر ہے کہ میں کامیاب واپس آیا۔

رنجیت سنگھ:۔ تم نے بہت بڑا کام کیا، آفرین ہے تم پر،

کرتار سنگھ:۔ یہ میرا فرض تھا میں اپنے آقا کا نمک خوار ہوں، حق نمک ادا کرنا میرا فرض ہے

رنجیت سنگھ:۔ کیا تمہیں یار محمد پر اعتبار ہے ؟

کرتار سنگھ:۔ اتنا ہی جتنا اپنے آپ پر ہے۔

رنجیت سنگھ:۔ لیکن تم نے کس طرح اسے ہموار کیا ؟

کرتار سنگھ:۔ رشک و رقابت کا جذبہ پیدا کر کے، قبائلی اور مقامی عصبیت کو ابھار کر احساسِ کمتری نمایاں کر کے اور انعام واکرام کا لالچ دے کر۔

رنجیت سنگھ:۔ ٹھیک —————— انعام واکرام کے سلسلہ میں تم نے جو وعدہ بھی یار محمد سے کیا ہے وہ ہم پورا کریں گے، بلکہ اس سے زیادہ دیں گے۔ جتنے کی تم نے امید دلائی ہے ہم اسے جاگیر دیں گے۔ املاک دیں گے۔ نقد روپیہ دیں

گے، جو مانگے گا پائے گا۔

کرتار سنگھ:۔ بندہ نوازی ہے مہاراج کی!

رنجیت سنگھ:۔ لیکن ایک بات تو بتاؤ۔

کرتار سنگھ:۔ ارشاد ——————،

رنجیت سنگھ:۔ کیا یہ وہی یار محمد نہیں، جس کے پاس دنیا کی بہترین گھوڑی "لیلیٰ" ہے۔

کرتار سنگھ:۔ جی ہاں، یہ وہی یار محمد ہے —————— میں نے لیلیٰ کا نظارہ کیا ہے، اور میں کہہ سکتا ہوں کہ واقعی وہ لیلیٰ ہے۔

رنجیت سنگھ:۔ ہم اس کی تعریف سن چکے ہیں —————————— لیکن کرتار سنگھ! ایک کام تمہیں کرنا ہوگا ہماری خاطر!

کرتار سنگھ:۔ غلام اپنے آقا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے آسمان کے تارے توڑ کر لا سکتا ہے۔

رنجیت سنگھ:۔ ہمیں یقین ہے،

کرتار سنگھ:۔ ایک جذبہ کے عالم میں اپنی گردن کٹا سکتا ہے۔

رنجیت سنگھ:۔ ہمیں تمہاری اس بات کا بھی یقین ہے، بلاشبہ تم ہماری خوشنودی کے لئے سب کچھ کر سکتے ہو!

کرتار سنگھ:۔ تو ارشاد ہو غلام کو کیا حکم دیا جاتا ہے؟

رنجیت سنگھ:۔ لیلیٰ —————— لیلیٰ کو ہمارے اصطبل کی زینت بننا چاہیئے۔ تم نے تو کوہ نور ہیرا حاصل کر لیا، لیکن لیلیٰ حاصل نہ کر سکے، یہ ہماری ہمت بلند کے لئے باعثِ ننگ ہے، کیا تم چاہتے ہو کہ ہم خود اپنے آپ سے شرمندہ ہوں؟

کرتار سنگھ:۔ نہیں میرے آقا ہرگز ہرگز نہیں۔

رنجیت سنگھ:۔ تو پھر ہمیں یقین دلاؤ۔ لیلیٰ ہماری ہے،

کرتار سنگھ :۔ بے شک وہ آپ کی ہے صرف آپ کی ۔

رنجیت سنگھ :۔ تو کب تک وہ ہمارے ہاں آجائے گی ؟ (مسکراکر) لیلیٰ کا فراق ہم نہیں برداشت کر سکتے ۔ ـــــــــــــــــ وہ اگر لیلیٰ ہے تو ہم اس کے مجنوں ہیں ۔

کرتار سنگھ :۔ غلام اپنے آقا کو یقین دلاتا ہے کہ لیلیٰ بہت جلد آجائے گی ۔

رنجیت سنگھ :۔ لیکن کب تک ؟ کیا ابھی ہم نے نہیں کہا تھا کہ لیلیٰ کا فراق ہمارے لئے ناقابلِ برداشت ہے ؟ ـــــــــــــــــ لیلیٰ کی قیمت بھی ہم منہ مانگی دینگے

کرتار سنگھ :۔ وہ قیمت نہیں لے گا ، وہ بھی اس لیلیٰ کا مجنوں ہے ، بہت چاہتا ہے اسے ، وہ بھی کسی قیمت پر لیلیٰ کی جدائی گوارا نہیں کر سکتا !

رنجیت سنگھ :۔ پھر کیا ہوگا ؟

کرتار سنگھ :۔ تھوڑا سا توقت کیجئے ، پھر وہ یہاں ہوگی ـــــــــــــــــ یہ وقت ایسا ہے کہ ہم یار محمد پر تشدد نہیں کر سکتے ، سختی نہیں کر سکتے ، ہمیں اس کی دلجوئی کرنی ہے ، خاطر کرنی ہے ، دل رکھنا ہے ، اس لئے فی الحال ہم کوئی ایسی بات نہیں کر سکتے جس سے اسے غلط فہمی ہو ، جس سے وہ ہمارے بارے میں مشکوک ہو جائے اس طرح بنا ہوا کام بگڑ جائے گا اور وہ ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا ـــــــ اس طرح دشمن کے ہاتھ مضبوط ہوں گے ، اور ہماری جیتی ہوئی بازی ہر جائے گی ۔

رنجیت سنگھ :۔ کہتے تو سچ ہو لیکن ـــــــــــــــــ

کرتار سنگھ :۔ اسے مجھ پر چھوڑ دیجئے میں وعدہ کرتا ہوں کہ بہت جلد کسی نہ کسی ترکیب سے یار محمد کو اس پر آمادہ کر لوں گا کہ وہ خود لیلیٰ کو لے کر یہاں آئے ۔ اور آپ کی خدمت میں اپنی طرف سے ایک ناچیز تحفہ کے طور پر پیش کر جائے ۔ رنجیت سنگھ کرتار سنگھ کی ان عاقلانہ باتوں پر مسکرانے لگا ۔

باب ۱۴

ڈنتورا

کرتار سنگھ کو رخصت کرنے کے بعد رنجیت سنگھ نے ڈنتورا کو بلایا، یہ ایک فرانسیسی سپاہی تھا اور یورپ کی کئی جنگوں میں شریک ہو چکا تھا، کم از کم خود اس کا یہ دعویٰ تھا کہ یورپ کی کئی لڑائیوں میں شریک ہو کر سرخ رو ہو چکا ہے، رنجیت سنگھ کی فوج میں یہ ایک معمولی افسر کی حیثیت سے شریک ہوا، لیکن بہت جلد اپنی ذہانت، فراست کارگزاری اور وفاداری کے باعث رنجیت سنگھ کی ناک کا بال بن گیا، اگر سکھ افسروں اور سرداروں کے باغی ہو جانے کا اندیشہ نہ ہوتا، رنجیت سنگھ کی افواج کا سپہ سالار اعلےٰ یہی ہوتا۔ لیکن عملاً یہ منصب اسی کو حاصل تھا، تمام اہم مورچوں پر اور جنگوں میں رنجیت سنگھ اسی کو بھیجتا تھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ وہ اس اعتماد اور قدر افزائی کا مستحق بھی تھا، اس نے سکھ فوج کی جدید یورپین طرز پر تنظیم کی، نئی وردیاں بنوائیں، جنگ کے نئے طریقے سکھائے، نئے ہتھیاروں کا استعمال کرنا بتایا اور فوج میں ایک نئی روح پھونک دی۔ رنجیت سنگھ کی کامیابیوں میں ڈنتورا کی مہارتِ جنگ اور اس کے تربیت یافتہ سپاہیوں کی نئی جدت اور قابلیت کو بھی بڑا دخل تھا۔ سکھ سرداروں اور دوسرے رجواڑوں سے جتنی جنگیں اسے لڑنا پڑیں، ان کی کامیابی میں ڈنتورا کی صلاحیت اور اجتہادِ فنی کو بہت بڑا دخل تھا۔

یہ ڈنتورا اپنے عادات و خصائل کے اعتبار سے دوسرا رنجیت سنگھ تھا۔ ظلم و شقاوت اس کی سرشت تھی، شراب سے اسے عشق تھا، عیش و عشرت کی زندگی یہ میدانِ جنگ میں بھی نہیں چھوڑتا تھا، خوب دولت صرف کرتا تھا، تنخواہ بھی کافی ملتی تھی، مالِ غنیمت میں حصہ لگاتا تھا، دوسرے وسائل بھی بروئے کار لاتا تھا۔

اپنے آقا کا حکم پاتے ہی وہ حاضر ہوگیا، رنجیت سنگھ نے اس سے کہا۔
تمہیں معلوم ہوگا۔ ہم اس وقت ایک خطرناک جنگ لڑنے پر مجبور ہوگئے ہیں۔

ذتورا:۔ شائد آپ کا اشارہ خلیفہ صاحب اوران کے مجاہدین کی طرف ہے؟

رنجیت سنگھ:۔ ہاں تم ٹھیک سمجھے!

ذتورا:۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مہاراجہ کو اس جنگ کے بارے میں تشویش واضطراب کیوں ہے؟

رنجیت سنگھ:۔ دشمن کو حقیر نہیں سمجھنا چاہئے۔

ذتورا:۔ ٹھیک ہے، ہم کسی دشمن کو حقیر نہیں سمجھتے لیکن اس کی سرکوبی کے لئے ہمیشہ تیار ہی رہتے ہیں۔ اگر خلیفہ صاحب اوران کے ساتھی لڑنا چاہتے ہیں، تو ہم ان کی یہ حسرت پوری کر دیں گے۔

رنجیت سنگھ:۔ ہماری دعا ہے کہ ایسا ہی ہو۔

ذتورا:۔ ضرور ایسا ہی ہوگا کیا مہاراج کو اس جاں نثار پر اعتماد نہیں رہا؟ یا اپنے وفادار سپاہیوں کی شجاعت، دلیری اور بہادری پر شک ہوگیا ہے؟

رنجیت سنگھ:۔ نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ ہمیں تم پر آنا ہی اعتماد ہے جتنا تھا۔ اور اس اعتماد میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔

ذتورا:۔ عزت افزائی ہے آقائے ولی نعمت کی۔

رنجیت سنگھ:۔ اور ہمیں اپنے وفاداراور دلیر وشجاع سپاہیوں پر بھی پورا بھروسہ ہے ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ان کی وفاداری اور جاں نثاری مشکوک ہو سکتی ہے

لہ ذتورا کے بارے میں یہ ساری تفصیلات COURT & CAMP OF RANJIT SINGH میں درج ہیں۔

دنتورا:۔ بے شک، وہ اسی قدرافزائی اورحسنِ سلوک کے مستحق ہیں۔

رنجیت سنگھ:۔ پھر بھی ہم جانتے ہیں کہ اس جنگ کو معمولی جنگ نہ سمجھا جائے۔

دنتورا:۔ ایسا ہی ہوگا میرے آقا ——————— لیکن میں یہ سوال کرنے کی جرآت کرتا ہوں، کیا خلیفہ صاحب کے پاس بہت بڑی فوج ہے؟ روپیہ کی ریل پیل ہے؟ جو انہیں اتنی غیر معمولی اہمیت دی جا رہی ہے؟

رنجیت سنگھ:۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے؟

دنتورا: جی ارشاد!

رنجیت سنگھ:۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی خلیفہ صاحب کا سفیر ہمارے پاس سے واپس گیا ہے۔

دنتورا:۔ اچھا تو خلیفہ صاحب کی یہ ہمت کہ ان کا سفیر بھی ہمارے دربار میں آنے لگا۔

رنجیت سنگھ:۔ ہاں ——————— ہم نے اس سے گفتگو کی، اور اس کی ایک بات سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔

دنتورا:۔ کیا کہا اس نے؟

رنجیت سنگھ:۔ اس نے کہا ہم موت کو کھیل سمجھتے ہیں، ہم راہِ خدا میں اپنی زندگی قربان کر دینے کا عہد کر چکے ہیں، ہمارے دشمنوں کو شراب اور عیاشی سے اتنی دلچسپی نہیں ہے جتنی ہمیں موت سے ہے

دنتورا:۔ وہ اگر موت کے اتنے ہی آرزومند ہیں تو آپ نے انہیں اطمینان کیوں نہیں دلا دیا کہ ان کی یہ آرزو ضرور پوری کی جائے گی۔

رنجیت سنگھ:۔ جو لوگ اتنے من چلے ہوں کہ موت کو کھیل سمجھتے ہوں ان سے ضرور ہوشیار رہنا چاہیئے وہ لاکھ نتھے ہوں، بے روز ہوں، مفلس اور قلاش ہوں، ساز و سامان جنگ سے اور لشکرگری سے محروم ہوں، لیکن وہ خطرناک ضرور ہوتے ہیں ——— کیا

نہیں ہوتے
؟

دنتورا: (کچھ سوچتے ہوئے) ضرور ہوتے ہیں ۔

رنجیت سنگھ: تو بس اس حقیقت پر ہم تمہیں متوجہ کرنا چاہتے تھے
اور دوسری بات یہ کرنا چاہتے تھے کہ سرحد کا مورچہ تمہیں سنبھالنا پڑے گا کیا تم
اس کے لئے تیار ہو ؟

دنتورا: سر آنکھوں پر میرے آقا !

باب ۴۲

آنے والا طوفان

کرتار سنگھ کی حویلی، دولت رام کے خانۂ بے تکلف اور رنجیت سنگھ کے قصرِ زرنگار میں سکوت چھایا ہوا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے کوئی خاص بات یہاں ہوئی ہی نہیں، امرت کور ایک قصہ ماضی بن چکی تھی، سروجنی قصرِ شاہی کی مکین تھی، اس کے دل میں طوفان مچل رہا تھا، اس کا سینہ محشرستان جذبات بنا ہوا تھا، اس کا دماغ تخیلات و تصورات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا، لیکن اس کے لب سلے ہوئے تھے، اس کی آنکھیں بے نم تھیں، اس کی آواز اور الفاظ میں نہ خوشی کی حرارت تھی، نہ غم کا گداز بالکل خاموش جس سے اس کی کسی کیفیت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ اس کا کوئی ردِ عمل نہیں معلوم کیا جا سکتا تھا، رہا دولت رام، وہ اپنے حالات میں مگن تھا، سروجنی کو مہارانی کے منصب پر پہنچا کر وہ اتنا خوش اور مسرور تھا جیسے اس نے کوئی بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔

لیکن یہ خاموشی، یہ سکون، یہ سکوت، کسی طوفان کا پیش خیمہ تو نہیں تھا؟ ——۔ سمندر میں جب طوفان آنے والا ہوتا ہے تو وہ ساکن ہو جاتا ہے، لہریں تھم جاتی ہیں۔ موجیں رک جاتی ہیں۔

اور ایک روز دفعتہً یہ سکون ہلچل سے بدل گیا۔

مہندر کرتار سنگھ کے ساتھ گیا تھا، لیکن اس کے ساتھ آیا نہیں تھا، سروجنی اس کی عدم موجودگی میں مہارانی بنی تھی، جب وہ اپنے فرائض انجام دے کر لاہور واپس آیا

تو اس نے یہ خوشخبری سنی کہ ، اس کی محبوبۂ دل آرام ، رقیب کے کاشانہ کی زینت بن چکی ہے یہ سن کر اسے چکر آگیا ، ایک سناٹے کی سی کیفیت طاری ہوگئی اس پر اسے یقین نہیں آیا کہ جو کچھ سن رہا ہے وہ امر واقعہ ہے ، وہ کیسے باور کر سکتا تھا کہ محبوبہ جس نے اس سے زندگی بھر کا پیمانِ وفا باندھا تھا ۔ اتنی بے وفا ثابت ہوگی کہ دوسرے کی بیوی بن جائیگی

وہ دولت رام کے پاس پہنچا ، دولت رام اسے دیکھ کر سہم گیا ، مہندر کو اس حالت میں اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا ، اس کی آنکھیں جس مہندر سے آشنا تھیں ، وہ ایک خوش اندام ، خوش مزاج ، ہنس مکھ ، پرلطف ، مرنجاں مرنج ، ہنسنے ہنسانے والا نوجوان تھا ، جس کے پاس بیٹھ کر جس کی باتیں سن کر ایک لطف آتا تھا ، وقت گزرنا نہیں معلوم ہوتا تھا ۔ لیکن اس وقت جو مہندر سامنے تھا یہ تو کوئی خونی معلوم ہوتا تھا ۔ اس کی آنکھیں باہر نکلی پڑ رہی تھیں اور ان کا رنگ بھی کتنا سرخ تھا جیسے انگارہ ۔ اس کے ہونٹوں پر تبسم کا کہیں نشان بھی نہ تھا ۔ اس کے چہرے پر خشونت اور برہمی ، نفرت اور حقارت ، غصہ اور انتقام کے آثار نمایاں تھے ۔ اس کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں ۔ ماتھے پر شکنیں نمودار تھیں ، منہ سے جھاگ نکل رہے تھے ۔

اس مہندر کو دیکھ کر بہادر اور دلیر ہونے کے باوجود دولت رام کانپ گیا ، جیسے اس نے مہندر کا کوئی بہت بڑا جرم کیا ہو ، اور اب اس جرم کی سزا بھگتنے کا وقت آگیا ہو ۔

دولت رام نے بڑی نرمی اور ملائمت کے ساتھ مہندر سے کہا ۔

"اوہو ! تم ہو مہندر ۔ ارے میاں کب آئے ؟ ہمیں پتہ بھی نہ چلا !"

مہندر نے اس اخلاق و تپاک سے ذرا بھی متاثر ہوئے بغیر ترش روئی اور تلخی کے ساتھ کہا ۔

"مجھے آئے ہوئے تین دن ہو چکے ہیں !"

دولت رام :۔ رہے تکلفی کے لہجہ میں ، آپ کو تشریف لائے ہوئے تین دن ہو چکے

میں اور غریب خانہ پر آج قدم رنجہ فرمایا ہے ــــــــــ بے مروت کہیں کے ــــــــــ آؤ بیٹھو۔

مہندر: (بیٹھتے ہوئے) لیجئے بیٹھ گیا۔

دولت رام: (مسکرا کر) تو اب باتیں کرو، تم تو بہت پرانے اور بڑے باتونی ہو۔

مہندر: جی ہاں باتیں کروں گا، لیکن جگ بیتی کہوں یا آپ بیتی ؟

دولت رام: (ذرا جھینپتے ہوئے) جو چاہو ــــــــــ ہمیں تو تمہاری باتوں میں لطف آتا ہے۔

مہندر: کہیے آپ کا مزاج کیسا ہے ؟

دولت رام: ٹھیک ہے، کرپا ہے بھگوان کی !

مہندر: سروجنی کیسی ہے ؟

دولت رام: (گھبرا کر) سروجنی ؟ ــــــــــ اچھی ہے۔

مہندر: کہاں ہے وہ ؟

دولت رام: کیا تم اس سے ملنا چاہتے ہو ؟

مہندر: جی ہاں ارادہ تو یہی ہے۔

دولت رام: (پریشان ہو کر) کیا تم نے اس کے بارے میں کچھ نہیں سنا ؟ بالکل نہیں جانتے کچھ ؟

مہندر: میں سنی سنائی باتوں پر اعتماد نہیں کیا کرتا۔

دولت رام: وہ یہاں نہیں ہے، وہ قصر شاہی میں ہے، مہاراجہ صاحب نے مہارانی بنا لیا ہے۔

مہندر: لیکن اس کی منگنی تو مجھ سے ہو چکی تھی، بیاہ کا وعدہ تو آپ نے میرے ساتھ کیا تھا، خود اس نے بھی ایک سے زائد بار پیمان وفا میرے ساتھ باندھا تھا،

یہ مہاراجہ صاحب بیچ میں کہاں سے ٹپک پڑے ؟

دولت رام :۔ (چکرا کر) یہ سب ٹھیک ہے لیکن مہاراجہ کے حکم سے سرتابی کون کر سکتا ہے میرے بھائی !

مہندر : شریف آدمی اپنی وضع پر، اپنے وعدے پر، اپنے قول پر قائم رہتے ہیں وہ کبھی بھی اپنی بات سے نہیں پھرتے، خواہ ان کی گردن کیوں نہ کاٹ لی جائے ——————— کیا میں غلط کہتا ہوں ؟

دولت رام :۔ تم سچ کہتے ہو ،

مہندر :۔ پھر ایسا کیوں ہوا ؟

دولت رام :۔ اس لئے کہ میں مہاراجہ کی مزاحمت نہیں کر سکتا تھا ۔

مہندر :۔ تو اتنی جلدی کی کیا ضرورت تھی ؟ میرا انتظار کر لیا ہوتا، میں مر تو نہیں گیا تھا ؟

دولت رام :۔ میں نے کوشش کی تھی کہ ایسا نہ ہو، لیکن حالات نے بے بس کر دیا

مہندر :۔ صاف صاف بات کیجئے ۔ وہ کون سے حالات تھے جنہوں نے آپ کو بے بس کر دیا تھا۔ اور آپ کچھ نہ کر سکے ؟ کیا مہاراجہ صاحب نے آپ کے قتل کا حکم دے دیا تھا ؟

دولت رام :۔ اگر وہ صرف میرے قتل کا حکم صادر کرتے تو شاید میں خوشی خوشی جان دے دینا گوارا کر لیتا ——————— !

مہندر :۔ مقتولین کی فہرست میں اور کس کس کا نام تھا ——————— ؟

دولت رام :۔ اگر میں مہاراجہ کا کہنا نہ مانتا تو جانتے ہو کیا ہوتا ؟

مہندر :۔ وہی تو پوچھ رہا ہوں، لیکن آپ شائد بتانا نہیں چاہتے !

دولت رام :۔ تمہیں نہ بتاؤں گا تو پھر کسے بتاؤں گا ———————؛ بات یہ ہے کہ مہاراجہ بڑے ضدی آدمی ہیں، وہ جب کوئی فیصلہ کر لیتے ہیں، تو اس پرچٹان کی طرح جم جاتے ہیں، پھر وہ کسی کی نہیں سنتے، کسی کی نہیں مانتے ۔

مہندر:۔ مہاراجہ کی تعریف نہ کیجئے، میں انہیں اتنا جانتا ہوں، جتنا آپ جانتے ہیں/کام کی بات کیجئے۔

دولت رام:۔ وہ اڑ گئے تھے اپنے فیصلہ پر، اگر میں سرتابی کرتا، تو نہ سروجنی کی خیر تھی نہ تمہاری۔

مہندر: آپ نے اپنی جان بچانے کے لئے میری جان بھی لی اور سروجنی کی بھی

دولت رام:۔ کیا کہنا چاہتے ہو تم؟

مہندر:۔ کیا آپ سمجھتے ہیں، آپ نے مہاراجہ کے سامنے سر تسلیم خم کرکے ہم دونوں کی جان بچالی؟

دولت رام:۔ یقیناً ——— تم لاکھ انکار کرو، لیکن واقعہ یہی ہے۔

مہندر:۔ جی نہیں یہ بات نہیں ہے، آپ نے ہم دونوں کو مارا، ہم دونوں کی جان لی اور یہ اچھا نہیں کیا ———!

دولت رام:۔ (متحیر ہوکر) کیا کہہ رہے ہو میرے عزیز؟

مہندر:۔ میں یہ عرض کر رہا ہوں آپ ہم دونوں میں سے کسی کی زندگی بھی نہیں بچا سکتے ہیں، میں بھی مروں گا اور سروجنی بھی۔

دولت رام:۔ حواس باختہ ہوکر (کیا مطلب ہے تمہارا؟ ——— کیا خودکشی کروگے

مہندر:۔ خودکشی بزدل کرتے ہیں۔

دولت رام:۔ پھر ——— کیا ارادہ ہے؟

مہندر:۔ قتل ——— میں اس شخص کی جان لوں گا جس نے میری محبوبہ کے ارمانوں کا خون کیا ہے۔

دولت رام:۔ (بے انتہا پریشان ہوکر) مہندر ———؟

مہندر: جی ہاں یہ میرا اٹل فیصلہ ہے۔

دولت رام :۔ تم شیر سے پنجہ نہیں لڑا سکتے۔

مہندر :۔ لڑاؤں گا۔

دولت رام :۔ تم موت کے فرشتہ سے نہیں لڑ سکتے۔

مہندر :۔ لڑوں گا۔

دولت رام :۔ (عاجزی کے ساتھ) رحم کرو مجھ پر نہیں تو اپنے اوپر، سروجنی پر۔

مہندر :۔ یہ رحم ہی ہے ——————— میں رنجیت سنگھ کے پاس خوش نہیں رہ سکتا ایسی زندگی سے موت اچھی، میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، تو پھر موت سے کیوں ڈردوں، رنجیت سنگھ کو کوئی حق نہیں ہے کہ وہ دونوں کا سکھ چھین لے، پھر وہ زندہ کیوں رہے؟ بلا سے اس راستہ میں میری جان جائے اور سروجنی بھی موت کے گھاٹ اُتر جائے۔

باب ۴۳

جوشِ جنوں

مہندر کا جوشِ جنوں بڑھنے لگا ——— جو باتیں اس نے دولت رام سے کہی تھیں، اب وہ انہیں علانیہ دوستوں کے مجمع اور غیروں کی موجودگی میں کہنے لگا، شدہ شدہ یہ باتیں رنجیت سنگھ کے کانوں تک بھی پہنچیں اور سروجنی کو بھی معلوم ہوگئیں، دولت رام اور کرتار سنگھ نے بڑی لیپ پوت کی لیکن۔

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

رنجیت سنگھ کا غصہ بڑھتا ہی چلا گیا، آخر اس نے کوتوال شہر کو حکم دیا کہ ۲۴ گھنٹے کے اندر مہندر کو لاہور سے جلا وطن کر دیا جائے۔

سروجنی اب تک خاموش تھی، اس نے اس بات چیت میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ لیکن مہندر کے جوشِ جنوں اور مہاراجہ کے مجنونانہ حکم نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ بھی اپنا پارٹ ادا کرے اس نے مہاراجہ سے اجازت چاہی کہ ایک دن کے لئے وہ دولت رام کے ہاں جانا چاہتی ہے دولت رام بہرحال اس کا بھائی تھا، مہاراجہ نے اجازت دے دی اور وہ قصرِ شاہی سے اپنے گھر میں آگئی۔

یہاں آکر اس نے دولت رام سے کوئی گفتگو نہیں کی، البتہ اپنی ایک وفادار خادمہ لاجونتی کے ذریعہ مہندر کو پیام بھیجا کہ وہ اس سے ملنا چاہتی ہے اور حویلی کے پائیں باغ میں جہاں مہارانی بننے سے پہلے وہ اکثر اس سے ملا کرتی تھی، آج پھر ملے گی۔

مہندر کو یہ پیام پہنچا اور اس نے مسکرا کر یہ دعوت قبول کر لی۔

جب رات کا سناٹا چھاگیا اور عام طور پر سوتا پڑگیا، تو مہندر دبے پاؤں پائیں باغ میں پہنچا، یہ باغ اس کی آرزوؤں کا چمن اور حسرتوں کا گلستان تھا۔ یہاں وہ اکثر سروجنی سے ملاکرتا تھا۔ اور گھنٹوں دونوں گھل مل کر باتیں کیاکرتے تھے آج بھی وہی باغ تھا۔ لیکن سرخوشی اور نشاط کی کیفیت کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ لاجونتی نے چور دروازہ پر اس کا استقبال کیا اور بارہ دری کے اس گوشہ میں لے جاکر بٹھادیا جہاں وہ اکثر بیٹھاکرتا تھا۔ تھوڑی دیر میں آہستہ آہستہ قدم رکھتی ہوئی سروجنی بھی آگئی وہ محل سے حویلی میں جب آئی تھی تو وہی زرق برق لباس زیب تن تھا جو مہارانیوں کے شایانِ شان ہواکرتا ہے۔ لیکن اس وقت جب وہ حویلی سے پائیں باغ میں آئی، تو اس کا لباس بدلا ہوا تھا، وہ بالکل سادہ لباس میں ملبوس تھی اسی لباس میں جو وہ عام طور پر گھر میں پہنا کرتی تھی۔

مہندر اسے دیکھ کر کھڑا ہوگیا، اس نے کہا

"آیئے مہارانی صاحبہ! تشریف لایئے، آپ کی بڑی نوازش کہ آپ نے اس خاکسار کو یاد فرمایا۔ ——————

یہ تیکھے الفاظ سن کر سروجنی کی تیوری چڑھ گئی، ماتھے پر بل آگیا اس نے کہا۔

"اگر تم مجھ سے لڑنے آئے ہو تو ویسا کہو، لڑنا میں بھی جانتی ہوں۔"

مہندر:۔ آیا تو اسی لئے ہوں، لیکن پہلے کچھ باتیں ہولیں تو بہتر ہے۔

سروجنی:۔ میں بھی یہی چاہتی ہوں ۔

مہندر:۔ تو بتایئے مجھے کیوں یاد کیا ہے آپ نے؟ —————— کیا اس لئے کہ میرے زخم دل پر نمک پاشی کریں؟

سروجنی:۔ مہندر ہوش میں آؤ۔ عقل کے ناخن لو، اس طرح کی باتیں کر کے تم مجھے رلا سکتے ہو لیکن کیا مجھے رلا کر تمہیں سکھ مل جائے گا؟ اگر میں جان لوں کہ میرا رونا تمہارے سکھ کا باعث ہے تو میں ابھی آنسوؤں کی جھڑی لگا دوں گی۔ اور ان آنسوؤں کا رنگ سفید نہیں

لال ہوگا ان میں میرے لخت دل کی جھلک ہوگی۔

مہندر:۔ اچھا یہ بات ہے؟ ——— تو اس سے میں یہ سمجھوں کہ اب بھی تمہارے دل میں میری جگہ ہے؟

سروجنی:۔ اگر تم یہ نہ سمجھو تو بے وقوف ہو۔

مہندر:۔ (ہنستے ہوئے طنز کے ساتھ) سچ کہتی ہو! میں واقعی بے وقوف نہ ہوتا تو تم سے محبت کیوں کرتا؟

سروجنی:۔ محبت کبھی یک طرفہ نہیں ہوتی، تالی ہمیشہ دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔

مہندر:۔ سچ کہتی ہو سروجنی ——— محبت یک طرفہ نہیں ہوتی، تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ میں نے تم سے محبت کی، تم نے میری محبت کا جواب محبت سے دیا، پھر مہاراجہ نے تم سے محبت کی اور تم ان کی محبت بھی نہ ٹھکرا سکیں ——— کیوں یہی بات ہے نا؟

سروجنی:۔ غلط ———.

مہندر:۔ تو پھر سچ کیا ہے، یہ بھی بتا دو۔

سروجنی:۔ میں نے مہاراجہ کے محل میں جانا اس لئے منظور کیا کہ میں اپنی آنکھوں سے تمہاری موت نہیں دیکھ سکتی تھی۔

مہندر:۔ (تلخی کے ساتھ) بیکار باتیں نہ کرو سروجنی! ——— تم مہاراجہ کی بیوی اس لئے بن گئیں کہ میری موت نہیں دیکھ سکتی تھیں، لیکن میری حسرتوں کا خون دیکھ سکتی تھیں، میری آرزوؤں کی موت دیکھ سکتی تھیں، امیدوں کو دم توڑتے ہوئے دیکھ سکتی تھیں، میں مر جاتا، مجھے پرواہ بھی نہ ہوئی، تم نے تو میری روح کو کچلا، میری حسرتوں کو پامال کیا، میری آرزوؤں کو قتل کر دیا، تم اندازہ نہیں کر سکتیں میرے سینہ میں کیسی آگ لگی ہوئی ہے، میرے دل پر کیا گذر رہی ہے! میں جب یہ

تصور کرتا ہوں کہ تم میری نہیں رنجیت سنگھ کی ہو،

سروجنی: غلط ——— میں صرف تمہاری ہوں ——— تمہاری تھی، تمہاری رہوں گی۔

مہندر:۔ لیکن یہ بات کس طرح مان لوں؟ تم میری ہو لیکن بیوی رنجیت سنگھ کی ہو، تم میری ہی رہوگی، لیکن میرے غریب خانہ کے بجائے تمہارا مسکن قصر شاہی ہوگا؟ سروجنی! کیا تم واقعی مجھے بے وقوف سمجھتی ہو؟

سروجنی:۔ میں نے تمہاری محبت سے مجبور ہو کر یہ سب کچھ کیا۔ اگر مجھے یہ یقین ہوتا کہ تم پر آنچ نہیں آئے گی تو ہرگز مہاراجہ کی خواہش کے آگے سر نہ جھکاتی۔

مہندر:۔ پھر وہی باتیں جن سے مجھے غصہ آتا ہے۔

سروجنی:۔ (مسکراتے ہوئے) یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، غصہ تو ہمیشہ سے تمہاری ناک پر رکھا رہتا ہے، ایک میں مستثنیٰ تھی جس پر تم نے کبھی غصہ نہیں کیا تھا، آج سب دنوں کی کسر نکال دی تم نے میرے اوپر خفا ہو کر۔

مہندر:۔ ان میٹھی میٹھی باتوں سے میرے دل کا زخم اچھا نہیں ہو سکتا،

سروجنی:۔ وہ پھر کس طرح اچھا ہوگا؟

مہندر:۔ اب کبھی نہیں اچھا ہو سکتا،

سروجنی:۔ کیوں آخر؟

مہندر:۔ تم نے رانی بننا کیوں منظور کیا؟ ——— تم مجھے مر جانے دیتیں لیکن ایسا نہ کرتیں، تم نے مجھے زندہ رکھنے کے لئے ایسا کیا لیکن اس وقت تو میں صرف ایک مرتبہ مرتا، اور اب دن بھر میں نہ جانے کتنی مرتبہ موت کا مزہ چکھتا رہتا ہوں، کچھ اس کا بھی احساس ہے تمہیں؟

سروجنی:۔ بتاؤ، میری جگہ تم ہوتے تو کیا کرتے؟

مہندر:- یہ مہمل سوال ہے۔

سروجنی:- مہمل سہی، لیکن جواب دو۔

مہندر:- میں زہر کھالیتا، خودکشی کرلیتا، لیکن وہ نہ کرتا جو تم نے کیا ہے۔

سروجنی:- یہ تو بہت آسان بات ہے۔ اب بھی ہوسکتی ہے۔

مہندر:- یعنی میں زہر کھالوں؟ خودکشی کرلوں؟

سروجنی:- نہیں تم نہیں، میں، تمہارے دشمن ایسا کریں۔ تمہیں زندہ رکھنے کے لئے میں نے اپنے دل کو قتل کیا، اپنی آرزوؤں اور حسرتوں کو چتا میں جلایا، اپنی خوشی مٹائی۔ اپنے خوش آئند خوابوں کی دنیا میں آگ لگادی، اس شخص کی رفیق زندگی بن گئی جس سے مجھے نفرت ہے، اگر تم سے محبت نہ کرتی ہوتی تو بھی میرا اس کا کوئی جوڑ نہیں تھا، میں کسی طرح بھی اس کے پاس خوش نہیں رہ سکتی تھی، لیکن میری اتنی بڑی قربانی کے بعد بھی تم خوش نہ رہ سکے، تو پھر میرے لئے مر جانے سے بڑھ کر آسان کوئی چیز نہیں، میں مر جاؤں گی دیکھ لینا کتنی خوشی سے جان دیتی ہوں۔

مہندر:- تم اتنا گہرا طنز کرسکتی ہو اس کا مجھے وہم وگمان بھی نہیں تھا۔

سروجنی:- یہ طنز نہیں، دل کی آواز ہے مہندر!

مہندر:- ہاں —————— لیکن ایک بے وقوف انسان کو اور زیادہ بیوقوف بنانے کے لئے لیکن تم اپنی جان مت دو، تم میرے لئے اتنی بڑی قربانی کرسکتی ہو، تو میں بھی تمہارے لئے ایک معمولی سی قربانی کرسکتا ہوں۔

سروجنی:- یعنی ——————؟

مہندر:- میں تمہارے راستہ سے ہٹ جاؤں گا، تم اس زندگی کو خوشی اور مسرت کے ساتھ بسر کرو —————— اچھا سروجنی! بہت دیر ہوگئی ہے، تم بھی بے کل ہو رہی ہو، جاؤ آرام کرو، میں بھی جاتا ہوں۔

قبل اس کے کہ سروجنی کوئی جواب دے، مہندر چلا گیا، نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

باب ۴۴

"انہیں کچھ نہ کہو"

مہندر کے چلے جانے کے بعد، بڑی دیر تک سروجنی گم صم اپنی جگہ بیٹھی رہی آخر جب کافی دیر گزر گئی تو لاجونتی نے کہا۔

"بیٹی اب تک یہاں بیٹھی رہو گی، آؤ چلو، سو رہو، بہت رات آگئی ہے ابھی ابھی گھڑیال نے تین بجائے ہیں۔

سروجنی نے کوئی جواب نہیں دیا، اٹھ کھڑی ہوئی، کمرہ میں پہنچ کر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔

لاجونتی پائنتیوں بیٹھ کر اس کے پاؤں دبانے لگی۔

تھوڑی دیر کے بعد سروجنی نے کہا۔

"وہ چلے گئے؟"

لاجونتی بولی،

"ہاں بیٹی، وہ چلا گیا ـــــــ وہ تو جیسے پریت اور انسانیت سے رشتہ توڑ کر یہاں آیا تھا۔

سروجنی:۔ نہیں، نہیں کچھ نہ کہو،

لاجونتی:۔ کیسے نہ کہوں؟ اپنا دل پتھر کا کیسے بنا لوں؟

سروجنی:۔ ان کی کوئی خطا نہیں ہے۔

لاجونتی:۔ پھر کیا تمہاری خطا ہے ـــــــ؟

سروجنی:۔ ہاں شروع سے آخر تک میری ہی خطا ہے، میں نے غلطی کی۔

مہندر:- یہ مہمل سوال ہے۔

سروجنی:- مہمل سہی، لیکن جواب دو۔

مہندر:- میں زہر کھالیتا، خودکشی کرلیتا، لیکن وہ نہ کرتا جو تم نے کیا ہے۔

سروجنی:- یہ تو بہت آسان بات ہے، اب بھی ہو سکتی ہے۔

مہندر:- یعنی میں زہر کھالوں؟ خودکشی کرلوں؟

سروجنی:- نہیں تم نہیں، میں، تمہارے دشمن ایسا کریں۔ تمہیں زندہ رکھنے کے لئے میں نے اپنے دل کو قتل کیا، اپنی آرزوؤں اور حسرتوں کو چتا میں جلایا، اپنی خوشی مٹائی۔ اپنے خوش آئند خوابوں کی دنیا میں آگ لگادی، اس شخص کی رفیق زندگی بن گئی جس سے مجھے نفرت ہے، اگر تم سے محبت نہ کرتی ہوتی تو بھی میرا اس کا کوئی جوڑ نہیں تھا، میں کسی طرح بھی اس کے پاس خوش نہیں رہ سکتی تھی، لیکن میری اتنی بڑی قربانی کے بعد بھی تم خوش نہ رہ سکے، تو پھر میرے لئے مر جانے سے بڑھ کر آسان کوئی چیز نہیں، میں مر جاؤں گی دیکھ لینا کتنی خوشی سے جان دیتی ہوں۔

مہندر:- تم اتنا گہرا طنز کرسکتی ہو اس کا مجھے وہم و گمان بھی نہیں تھا۔

سروجنی:- یہ طنز نہیں، دل کی آواز ہے مہندر!

مہندر:- ہاں —————— لیکن ایک بے وقوف انسان کو اور زیادہ بیوقوف بنانے کے لئے لیکن تم اپنی جان مت دو، تم میرے لئے اتنی بڑی قربانی کرسکتی ہو، تو میں بھی تمہارے لئے ایک معمولی سی قربانی کرسکتا ہوں۔

سروجنی:- یعنی ——————؟

مہندر:- میں تمہارے راستے سے ہٹ جاؤں گا، تم اس زندگی کو خوشی اور مسرت کے ساتھ بسر کرد —————— اچھا سروجنی! بہت دیر ہوگئی ہے، تم بھی بے کل ہو رہی ہو جاؤ آرام کرو، میں بھی جاتا ہوں۔

قبل اس کے کہ سروجنی کوئی جواب دے، مہندر چلا گیا، نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

باب ۴۴

"انہیں کچھ نہ کہو"

سندر کے چلے جانے کے بعد، بڑی دیر تک سروجنی گم صم اپنی جگہ بیٹھی رہی آخر جب کافی دیر گزر گئی تو لاجونتی نے کہا۔

"بیٹی! کب تک یہاں بیٹھی رہو گی، آؤ چلو، سو رہو، بہت رات آگئی ہے ابھی ابھی گھڑیال نے تین بجائے ہیں۔"

سروجنی نے کوئی جواب نہیں دیا، اٹھ کھڑی ہوئی، کمرہ میں پہنچ کر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔

لاجونتی پائنتیوں بیٹھ کر اس کے پاؤں دبانے لگی۔

تھوڑی دیر کے بعد سروجنی نے کہا۔

"وہ چلے گئے؟"

لاجونتی بولی،

"ہاں بیٹی، وہ چلا گیا ——— وہ تو جیسے پریت اور انسانیت سے رشتہ توڑ کر یہاں آیا تھا۔"

سروجنی:- نہیں، انہیں کچھ نہ کہو،

لاجونتی:- کیسے نہ کہوں؟ اپنا دل پتھر کا کیسے بنا لوں؟

سروجنی:- ان کی کوئی خطا نہیں ہے۔

لاجونتی:- پھر کیا تمہاری خطا ہے ———؟

سروجنی:- ہاں شروع سے آخر تک میری ہی خطا ہے، میں نے غلطی کی۔

لاجونتی:۔ اچھائی ——— مگر اب ——— ؟ اب کیا ہو سکتا ہے ؟ کیا آدمی کی غلطی معاف نہیں کی جا سکتی ؟ کیا اسے بھلایا نہیں جا سکتا ——— ؟ کیا غلطی آدمی ہی سے نہیں ہوتی !

سروجنی:۔ ہوتی ہے، لیکن کیا اتنی بڑی غلطی بھی معاف کی جا سکتی ہے ؟

لاجونتی:۔ اس سے بڑی بھی معاف کی جا سکتی ہے ——— اگر محبت ہو اور سچی محبت ہو۔

سروجنی:۔ نہیں وہ مجھ سے سچی محبت کرتے ہیں !

لاجونتی:۔ وہ نہیں جانتا محبت کسے کہتے ہیں ۔

سروجنی:۔ تم نہیں جانتیں محبت کرنے والے کیسے ہوتے ہیں ؟

لاجونتی:۔ جانتی ہوں میں نے محبت کرنے والی ایک ہستی دیکھی تھی وہ ہے سروجنی !

سروجنی:۔ (کچھ سوچتے ہوئے) لاجونتی تم ایک کام کر سکتی ہو میرا ——— ؟

لاجونتی:۔ سر آنکھوں پر کروں گی میری بچی ! ——— بتا کیا کام تو لینا چاہتی ہے مجھ سے ——— ؟

سروجنی:۔ ذرا ان کے پاس چلی جاؤ ۔

لاجونتی:۔ کس کے پاس ؟ مہندر کے پاس ؟

سروجنی:۔ ہاں انہی کے پاس ۔

لاجونتی:۔ اب وہاں جا کر کیا کروں گی ——— ؟

سروجنی:۔ انہیں سمجھاؤ۔

لاجونتی:۔ کیسی باتیں کرتی ہو بیٹی ؟ کہیں پڑے جن بھی کسی کے سمجھانے میں آئے ہیں ، وہ ایک نہیں سنے گا ،

سروجنی:۔ نہیں میرے بارے میں نہیں ۔

لاجونتی:۔ پھر کس کے بارے میں ——————— ؟

سروجنی:۔ خود انہی کے بارے میں مجھے وہم آرہا ہے۔

لاجونتی:۔ کیسا وہم ؟

سروجنی:۔ کہیں وہ کچھ کر نہ لیں ——————— !

لاجونتی:۔ وہ کیا کرے گا ؟ کیا سمجھ رہی ہو تم ؟

سروجنی:۔ خودکشی ——————— کہیں وہ اپنا خون نہ کرلیں۔

لاجونتی:۔ بیٹی ! کیسی باتیں کرتی ہو ؟ ——————— وہ کچھ نہیں کرے گا۔

سروجنی:۔ کیسے معلوم ؟ تم کیا جانو وہ کچھ نہیں کریں گے ؟

لاجونتی:۔ یہ چونڈا میں نے دھوپ میں سفید نہیں کیا ہے، دنیا دیکھی ہے، دنیا والے دیکھے ہیں، اڑتی چڑیا پہچان لیتی ہوں، آدمی کو دیکھ کر بتا دیتی ہوں یہ کیسا ہے ! وہ کچھ نہیں کرے گا، اطمینان رکھو !

سروجنی:۔ لیکن میرا دل جو دھڑک رہا ہے !

لاجونتی:۔ تم ہمیشہ کی وہمی ہو۔ سو رہو، صبح تمہیں خود معلوم ہو جائے گا۔ میں سچ کہہ رہی تھی۔

سروجنی:۔ مجھے نیند نہیں آتی۔ میرا دل گھبرا رہا ہے، طرح طرح کے خیالات آرہے ہیں۔

لاجونتی:۔ ان خیالات کی طرف سے طبیعت ہٹالو، میری بچی ! جتنا سوچو گی اسی طرح کے خیالات آتے رہیں گے ———————

سروجنی:۔ لیکن تم ان کے پاس چلی کیوں نہیں جاتیں ——————— ؟

لاجونتی:۔ چلی جاؤں گی بیٹی ! ذرا صبح تو ہو لینے دو !

سروجنی:۔ صبح ——————— صبح تک نہ جانے کیا ہو جائے گا ———————

لاجونتی:۔ کچھ نہیں ہوگا ! بس اب صبح ہوا ہی چاہتی ہے۔

سروجنی:۔ تمہارا خیال ہے، وہ زندہ ملیں گے تمہیں ؟

لاجونتی :۔ ہاں بیٹی، وہ ضرور زندہ ملے گا، مرد کی ذات عجیب ہوتی ہے۔ تم ابھی بچّہ ہو، ذرا بھی نہیں پہچانتیں اس ذات شریف کو۔

سروجنی :۔ اچھا اگر وہ زندہ مل جائیں تو ایک کام کرنا ——————

لاجونتی :۔ جو کہوگی کروں گی، بتاؤ تو!

سروجنی :۔ کوشش کرنا انہیں زیادہ صدمہ نہ ہو۔

لاجونتی :۔ صدمہ؟ ——————کاہے کا صدمہ!

سروجنی :۔ رسٹ پٹاکر، میرا مطلب یہ ہے کہ اب اپنا خون کرنے پر آمادہ نہ ہو جائیں

لاجونتی اچھا اچھا ——————لیکن تم سوتو رہو!

باب ۴۵

سروجنی نے جان دے دی!

بڑی مشکل سے سروجنی سوئی —— جب وہ سوگئی تو لاجونتی بھی اپنے بستر پر آکر دراز ہوگئی، آج کی باتوں نے اسے بھی بہت مکدر اور پریشان کر دیا۔ بار بار کروٹیں بدلتی تھی، لیکن نیند ایسی روٹھی ہوئی تھی کہ کہیں اس کا پتہ ہی نہیں تھا ——!

بالکل صبح ہوتے ہوتے اس کی آنکھ لگ گئی، ابھی ایک نیند بھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ گھر میں کچھ ہلچل سی محسوس ہوئی، پھر اس کے کانوں میں دولت رام کے گونجنے اور چیخنے کی آوازیں آئیں، اس کی آنکھ کھل گئی، وہ گھبراکر بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی، لیکن شور بڑھتا ہی گیا، وہ چپکے سے اٹھی، پہلے سروجنی کے پاس جاکر کھڑی ہوگئی، دیکھا، وہ آرام کی نیند سو رہی ہے —— اس کی طرف سے مطمئن ہوکر وہ باہر صحن میں آئی۔ اس نے دیکھا کہ دولت رام کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں اس نے پوچھا۔

"کیا بات ہے بیٹے! اتنے سویرے تم کیوں اٹھ بیٹھے؟ آج سروجنی بھی بڑی دیر سے سوئی۔

دولت رام نے کرب کے عالم میں لاجونتی کی طرف دیکھا اور کہا،

"مہندر نے خودکشی کرلی۔ مجھے بڑا صدمہ ہے ——!

یہ سن کر لاجونتی کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی، اس کے کانوں میں سروجنی کے الفاظ گونجنے لگے —— وہ سوچنے لگی میرا تجربہ غلط ثابت ہوا۔ میری یقین دہانی جھوٹی نکلی، اب سروجنی تک یہ خبر میں کس طرح پہنچاؤں گی؟ وہ سنے گی تو کیا گزرے گی اس پر؟

ہائے وہ جان ہار، واقعی اس دنیا سے ناکام ونامراد اٹھ گیا، اب کیا ہوگا دولت رام نے کہا۔

مہاراجہ نے حکم دیا تھا کہ اسے جلاوطن کر دیا جائے۔ وہ بڑا ضدی اور خود سر تھا، اس نے فیصلہ کر لیا کہ اس شہر سے مر کر جائے گا۔ زندہ نہیں —————— یقیناً سروجنی کو بڑا صدمہ ہوگا،

لاجونتی نے بڑی مشکل سے "ہاں" کہا کہ ایک دوسری خادمہ ہانپتی کانپتی دوڑتی ہوئی آئی اور اس نے کہا۔

"مہارانی" —————— اور پھر وہ کچھ نہ کہہ سکی

دولت رام سروجنی کے کمرہ کی طرف لپکا۔ لاجونتی بھی اس کے پیچھے بھاگی، دونوں جاکر سروجنی کے سرہانے کھڑے ہو گئے۔

وہ بھی مر چکی تھی!

باب ۴۶

کرامت

اللہ والوں کی نگاہ میں سحر اور باتوں میں جادو ہوتا ہے، وہ رضائے الٰہی کے لئے اپنے آپ کو فنا کر دیتے ہیں، ان کا اوڑھنا، بچھونا، ان کا کھانا پینا، ان کا اٹھنا بیٹھنا، ان کا آنا جانا ملنا جلنا، دیکھنا بھالنا سب کچھ صرف خدا کے لئے ہوتا ہے، وہ اپنے لئے کچھ نہیں چاہتے خدا کے بندوں کے لئے سب کچھ چاہتے ہیں، وہ فاقہ کرتے ہیں اور خوش رہتے ہیں سر چھپانے کو جھونپڑی نہ ہو تو کسی درخت کے سایہ میں، کسی رہگزر پر، کسی مسجد یا خانقاہ میں رات بسر کر لیتے ہیں، تن ڈھانکنے کو کپڑا نہ ہو تو پھٹے پرانے کپڑے پہن لیتے ہیں، جیب خالی ہو تو پروا نہیں عاجزی اور مسکینی ان کی سرشت ہوتی ہے۔ وہ کسی سے لڑتے نہیں، جھگڑتے نہیں، لیکن اگر کوئی مذہب کی توہین کرے تو وہ شمشیر آبدار بن جاتے ہیں، خدا کے دین کو ذلیل کرنا چاہے تو وہ طوفان کی صورت میں اٹھتے ہیں اور ان کے قہر و جلال کے سامنے، اورنگ شاہی مسند سلطانی اور تاج شہریاری بید لرزاں کی طرح کانپنے لگتے ہیں، پھر ان کی نگاہ تلوار بن جاتی ہے، ان کی آواز میں دبدبہ اور طنطنہ پیدا ہو جاتا ہے، اور یہی اللہ والے لوگ جب اپنوں میں بیٹھتے ہیں خدا کے ماننے والے لوگوں کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں تو نرمی میں حریر پرنیاں بن جاتے ہیں، ان کی باتوں میں، ان کی سیرت میں، ان کے کردار میں، ان کی زندگی میں کچھ اس بلا کی جاذبیت پیدا ہو جاتی ہے کہ جو دیکھ لیتا ہے وہ ان کا والا و شیدا بن جاتا ہے۔ جو ان کے پاس ذرا دیر کے لئے بھی آ جاتا ہے، وہ انہی کا ہو رہتا ہے، ان کا یہ عالم ہوتا ہے کہ سیاہ کار آتے ہیں اور فرشتہ سیرت بن جاتے ہیں، گنہگار آتے ہیں اور زاہد مرتاض بن جاتے ہیں معصیت پیشہ

آتے ہیں اور ولی بن جاتے ہیں جنہیں اس پر فخر تھا کہ ظالم ہیں، ستمگر ہیں، سفاک ہیں اور درندہ خو ہیں، وہ ان کے قدموں میں بیٹھ کر خدا ترس بن جاتے ہیں خدا کا نام سنتے ہیں تو رونے لگتے ہیں، خدا کا کلام پڑھتے ہیں تو بدن پر رعشہ طاری ہو جاتا ہے۔ خدا کے آخری رسولؐ کی باتیں سنتے ہیں تو چاہتے ہیں کہ اپنی زندگی کا نیا سانچہ اسی قالب کو بنالیں، اپنے ماضی پر شرماتے لگتے ہیں اور حال کی سعی اصلاح میں منہمک ہو جاتے ہیں۔

پنجاب اور سرحد کے یہی علاقے تھے جہاں اسلام سرنگوں ہو رہا تھا۔ مسلمان ذلیل ہو رہے تھے، اسلام کا نام لینے والے حقیر سمجھے جاتے تھے، شعائرِ اسلامی کی علانیہ توہین ہوتی تھی، مگر کوئی کچھ نہ کر سکتا تھا۔ کافروں کی حکومت تھی، اور مسلمان غلامی کی زندگی کثرتِ تعداد کے باوجود بسر کر رہے تھے۔ اور یہ مسلمان تھے بھی نام کے، ان کا وہ کون سا چلن تھا جسے دیکھ کر لوگ سمجھتے کہ ہاں یہ اسلام کے ترجمان ہیں، ان کی وہ کون سی روش تھی جس میں اسلام اپنی پوری رعنائی و زیبائی کے ساتھ نظر آ رہا ہو، مسلمان ہونے کے باوجود یہ خود اسلام کی شب و روز توہین کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے شریعت اسلامیہ پر عمل ترک کر دیا تھا، رسم و رواج کے بندے بن گئے تھے، ان کی نگاہ میں قرآن کے احکام کو وہ وقعت نہیں تھی، جو خاندانی رسم و رواج کی تھی، اسلام جن چیزوں کے مٹانے کے لئے آیا تھا، انہیں یہ پھر زندہ کر رہے تھے اور خوش تھے کہ بہت بڑا کارنامہ انجام دے رہے ہیں، ان حالات کا نتیجہ غلامی اور ذلت کی زندگی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا؟

لیکن اس سرحد اور پنجاب کے جن چند اور چھوٹے علاقوں میں مجاہدین کی حکومت قائم ہو گئی تھی، جہاں اسلام کا پرچم لہرانے لگا تھا، وہاں کی کایا کتنی مختصر مدت میں پلٹ گئی تھی؟

حضرت سید احمد اور مولانا اسمٰعیل شہید اور ان دونوں بزرگوں کے دم قدم سے خزاں دیدہ چمن میں پھر سے فصل بہار آ گئی تھی، جہاں لوگ اسلام کی تعلیمات کو بھول چکے تھے وہاں

اب پھر اسلام کا سکہ چل رہا تھا۔ خاندان، رسم ورواج اور غیر اسلامی تصورات کی حکومت ختم ہوگئی تھی۔

ان بزرگوں نے بہت ہی مختصر سی مدت میں فضا بدل دی تھی / حالات بدل دیئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہاں کے سارے باشندے بدل گئے ہیں کل تک یہاں جو لوگ تھے وہ کہیں اور روپوش ہوگئے ہیں اور اب جو لوگ آئے ہیں یہ بالکل نئے ہیں، وضع قطع میں بھی، رنگ روپ میں بھی، صورت اور سیرت میں بھی، رفتار و گفتار، معاشرت، عادات اور طرز حیات میں زبردست انقلاب آگیا تھا ——— ایسا انقلاب جس کا منہ چشم فلک نے بھی کم ہی دیکھا ہوگا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا، آسمان سے فرشتوں کا کوئی گروہ اتر آیا ہے، اور انسانی صورت اختیار کر کے اس نے یہاں کی بود و باش اختیار کر لی ہے۔ اب مسجدیں آباد تھیں، قال اللہ اور قال الرسول کے ترانے گونجنے لگے تھے۔ زندگی کے ہر شعبہ پر اسلام کا رنگ چھا گیا تھا وہی عورتیں جنہیں انسانی حقوق سے بے بہرہ قرار دیا جاتا تھا۔ اب اپنے حقوق حاصل کر کے نئی اور خوشگوار زندگی بسر کر رہی تھیں، اب کوئی جوان لڑکی غربت اور جہیز کے باعث نامعلوم مدت تک ناکتخدا زندگی اختیار کئے رہنے کی پابند نہیں بنائی جاسکتی تھی۔ اب کوئی بڑے سے بڑا خان کسی مزارع پر، کاشت کار پر، غریب اور نادار پر ظلم نہیں کرسکتا تھا، نہ بیگار لے سکتا تھا۔ نہ اس کا حق دبا سکتا تھا، اب کسی کا حق نہیں مارا جاسکتا تھا، کسی پر ظلم نہیں کیا جاسکتا تھا۔

پہلے مجرم اگر دولت مند، اور صاحب اثر و رسوخ ہوتا تھا، تو ہر تعزیر سے بچ جاتا۔ اب کوئی مجرم نہیں بچ سکتا تھا، خواہ وہ فقیر بے نوا ہو، یا خان والا شان مسجد میں سب کو حاضر ہونا پڑتا تھا اور سب ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے تھے۔ خواہ کسی کے کپڑے اُجلے ہوں یا میلے،

پشت ہا پشت سے جو کینے چلے آرہے تھے، جو عداوتیں جاری تھیں، جو دشمنیاں کارفرما تھیں اور جن کے باعث آئے دن انتقام کا چکر چلتا رہتا تھا۔ تلواریں میان سے نکلتی رہتی تھیں

کشت وخون ہوتا رہتا تھا، ہلاکت، اور تباہی وبربادی کی آندھیاں چلتی رہتی تھیں اب وہ سلسلہ ختم ہوگیا تھا، اب عداوت کی جگہ محبت نے لے لی تھی، اب دشمنی اپنی موت مرچکی تھی اور اخوت اسلامی کا دور دورہ شروع ہوگیا تھا۔ پچھلی تلخ یادیں فراموش ہوچکی تھیں، اور اعتماد باہمی کی بادبہار چلنے لگی تھی۔

لوگ اس فضا میں کتنے خوش تھے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے انہیں نئی زندگی مل گئی ہو ———— !

کل تک جو لوگ غلامی اور کفر کی محکومی پر مجبور تھے، اب اسلامی زندگی نے ان میں ایک نیا ولولہ، ایک نیا حوصلہ، ایک نیا جوش پیدا کر دیا تھا۔

کل تک یہ سکھوں سے، ہندؤوں سے، انگریزوں سے خائف تھے، لیکن اب یہ موت تک سے نڈر تھے!

یہ زندگی، اسلام کو اختیار کرلینے سے پیدا ہوئی تھی، اور یہ ایسی زندگی تھی جس پر ہر شخص شاداں اور مسرور نظر آتا تھا۔

حبیب خاں جب سے اپنے وطن واپس آیا تھا، اس کا جذبۂ عمل اور زیادہ تیز ہوگیا تھا آج یہاں ہے، کل وہاں، ابھی اس گاؤں میں ہے، ابھی اس دیہات میں، کبھی یہاں تبلیغ کر رہا ہے کبھی وہاں، وہ جہاں جاتا تھا، اسلام کا پیامبر بن کر جاتا تھا۔ اس کی بات سنی جاتی تھی، اس کی دعوت قبول کی جاتی تھی۔ اس کے پیام پر عمل کیا جاتا تھا۔ حالات ایسے پیدا ہوگئے تھے کہ اب سکھوں کی ظالم اور مستبد حکومت کے پاؤں اکھڑنے لگے تھے۔

باب ۴۷

دو مجاھد

آج حبیب خاں بہت خوش تھا، بات بات پر مسکراتا تھا، بات کوئی کرتا باچھیں اس کی کھل جاتی تھیں، وفورِ مسرت سے بند قبا ٹوٹے جا رہے تھے۔

یوں تو مجاہدین کے کیمپ میں ہر شخص ایک دوسرے کا بھائی اور دوست جاں نثار اور فداکار تھا۔ لیکن محمد اکرم اور حبیب خاں کی دوستی بہت زیادہ بڑھ گئی تھی، یہ محمد اکرم ایک مہاجر تھا لکھنؤ کے قریب ایک قصبہ گرام کا رہنے والا، مجاہدین کے قافلہ میں یہ بھی کفن سر سے لپیٹ کر اس نئے مقام پر وارد ہو گیا تھا، ماں باپ، بھائی بہن، بیوی بچے سب وطن میں رہ گئے تھے یہ اکیلا اور تن تنہا اپنی جان دینے، اسلام پر قربان ہونے آیا تھا اور بہت خوش تھا، اسے فرزند و زن کسی کی فکر نہیں تھی، اگر تھی تو صرف یہ کہ سکھوں کی شکست ہو اور مسلمان غالب آئیں کئی معرکوں میں اس نے دلاوری اور دلیری کے جوہر دکھائے تھے۔ سکھوں کے لشکر پر جب شب و خون مارا گیا، یہ جیالا اور نڈر نوجوان سب کے آگے اور سب سے پہلے دشمن کے حصار میں داخل ہوا، اور زخموں سے چور اور لہو لہان ہونے کے باوجود اس وقت تک اس کی تلوار چلتی رہی، جب تک سالارِ لشکر نے واپسی کا حکم صادر نہ کر دیا۔

کل بھی محمد اکرم نے ایک شب خون میں شرکت کی تھی دشمن کے کئی دیو پیکر سپاہیوں کی شہ رگ کاٹی تھی، خود بھی کچھ زخمی ہوا تھا اور بامراد و شادکام اپنے لشکر میں واپس آ گیا تھا۔ دشمن نے شروع میں تو خوب مقابلہ کیا، لیکن زیادہ دیر تک نہ ٹک سکا۔ جب اپنے آدمیوں کی کٹی ہوئی گردنوں کا انبار دیکھا، تو بہت سا ساز و سامان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔

حبیب خاں اور محمد اکرم میں اس شب خون کے بارے میں باتیں ہو رہی تھیں،
حبیب خاں نے کہا۔

"بھائی اکرم! تمہاری بہادری اور دلیری کا تو میں رات قائل ہو گیا"
اکرم نے مسکراتے ہوئے حبیب خاں کی طرف دیکھا اور کہا

"بجا ارشاد ہوا، آپ اپنی تعریف سننا چاہتے ہیں، تو میں نے کب اس سچائی کے اظہار میں بخل سے کام لیا ہے؟ مانتا ہوں، دلیر ہو، بہادر ہو، شجاع ہو، بلکہ میں تو آج سے تمہیں غازی حبیب خاں کہا کروں گا، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ تم نے کل کے شب خون میں سات سپاہی دشمن کے ہلاک کئے کیا ایسا شخص بھی غازی نہیں کہلایا جا سکتا ——؟

حبیب خاں:۔ مسکرا کر جی نہیں، ایسے آدمی کے مقابلہ میں اس شخص کو ترجیح ہے جو کئی مرتبہ دشمن کے درجنوں سپاہیوں کے سر کاٹ چکا ہو۔ مجھے تو کل ہی شب خون میں پہلی بار شرکت کا موقع حاصل ہوا۔

محمد اکرم:۔ اس سے کیا ہوتا ہے، ایک ہی مرتبہ میں تم سب سے بازی لے گئے

حبیب خاں:۔ اچھا ان باتوں کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ، کب تک ہندوستان واپس جا رہے ہو؟

محمد اکرم:۔ نہیں —— میں نہیں جاؤں گا۔

حبیب خاں:۔ ضد اور ناسمجھی سے کام نہ لو۔ تمہیں واپس جانا چاہئے، جب امیر المومنین اور حضرت مولانا نے اجازت دے دی تو اب تمہیں تامل کیوں ہے؟

محمد اکرم:۔ امیر المومنین اور حضرت مولانا کی اجازت سے فائدہ اٹھانے یا نہ اٹھانے کا مجھے اختیار ہے، اور میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ اس اجازت سے فائدہ نہیں اٹھاؤں گا۔

حبیب خاں:۔ وہی ضد —— تین برس کا اکلوتا بچہ مر چکا، بیوی بیمار ہے بلکہ اس کی حالت بھی نازک ہے، یہ موقع گھر پر رہنے کا ہے، خدا حالات ٹھیک کر دے تو پھر چلے آنا۔

محمد اکرم:۔ سچ کہتے ہو میرے بھائی! لیکن سوچو تو، نہ میں مسیحا ہوں کہ جا کر مرے ہوئے بچہ کو زندہ کر لوں، نہ وہ دستِ شفا ہے کہ بیوی کی نبض ہاتھ میں لوں اور وہ چنگی ہو جائے، دیکھ بھال اور خدمت کے لئے میرے بھائی اور بہنیں موجود ہیں، تیمارداری کے فرائض وہ مجھ سے بہتر انجام دیں گی، البتہ میں وہاں جا کر کیا کر لوں گا، سوا اس کے کہ شرفِ جہاد سے محروم رہ جاؤں، نہیں بھائی میں نہیں جاؤں گا، کسی کی زندگی اور موت میرے ہاتھ میں نہیں ہے

حبیب خاں:۔ تمہارے جانے سے مریضہ کو سکون ملے گا۔

محمد اکرم:۔ میں نے جب رختِ سفر باندھا تھا تو اس خدا کی بندی نے مہر معاف کر دیا تھا۔ میری غلطیاں بھی معاف کر دی تھیں، اور مجھ سے عہد لیا تھا کہ یا راہِ خدا میں شہید ہو جانا ورنہ غازی بن کر واپس آنا۔

حبیب خاں:۔ شہادت پھر کسی موقع پر حاصل کر لینا، غازی تو بن چکے۔

محمد اکرم:۔ جی نہیں، مجھے غازی بننے کا اتنا شوق نہیں ہے، جتنا شہید ہونے کا۔

حبیب خاں:۔ تمہیں کوئی نہیں سمجھا سکتا۔

محمد اکرم:۔ اتنی دیر میں سمجھنے کے بجائے یہ بات پہلے ہی سمجھ لی ہوتی تو خواہ مخواہ وقت کیوں ضائع ہوتا؟

حبیب خاں نے دور ایک پہاڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا،

"دیکھتے ہو وہ کیا ہے؟"

محمد اکرم نے نظر اٹھائی اور جواب دیا،

"ہاں کچھ سر نظر آتے ہیں۔ شائد کٹنے کے لئے بے تاب ہیں، آؤ چلو چلیں" یہ کہہ کر اکرم کھڑا ہو گیا، تلوار حمائل کی، ساز و سامان درست کیا حبیب خاں نے بھی اس کا ساتھ دیا لیکن کہا،

"یقیناً دشمن کے کچھ سپاہی ہماری ٹوہ لینے آئے ہیں۔ ممکن ہے کافی تعداد میں ہوں، لہٰذا بہتر یہ ہے کہ کچھ سپاہیوں کو ہم بھی اپنے ساتھ لیتے چلیں۔"

اکرم نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"بات تو معقول ہے، لیکن اگر ہم تیاری کر کے گئے تو دشمن کو پتہ چل جائے گا، اور وہ بھاگ جائے گا۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ جھاڑیوں اور درختوں کی آڑ لیتے ہوئے چلیں، اور پہلے یہ دیکھ آئیں کہ معاملہ کیا ہے، اگر دس بیس ہوئے تو ہم دونوں ان کی مہمان نوازی کے لئے کافی ہیں زیادہ ہوئے تو پھر لشکر میں اطلاع کر کے باقاعدہ حملہ کر دیں گے۔"

بات حبیب خاں کی سمجھ میں آگئی، اس نے کہا۔

"ٹھیک کہتے ہو۔"

اب یہ دونوں خاموشی کے ساتھ اپنے خیمہ سے باہر نکلے اور سامنے کی بلند و بالا پہاڑی کی طرف درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ لیتے احتیاط اور آہستگی کے ساتھ چپکے چپکے قدم دھرتے روانہ ہو گئے۔

باب ۴۸

ایک مورچہ

صورت حال یہ تھی کہ مجاہدین کا لشکر پہاڑی کے سامنے خیمہ زن تھا، لشکر کیا تھا چند سو سپاہی تھے، جن کے پاس کوئی ڈھنگ کی چیز نہیں تھی لیکن دل عزیمت واستقامت سے معمور تھے، ایک جذبہ تھا جو انہیں میدانِ جنگ میں گھسیٹ لایا تھا اور یہ جذبہ تھا کہ خدا کے راستہ میں قربان ہو جانے کا، مٹ جانے کا ______ دوسری طرف پہاڑی کے اس طرف سکھوں کا ایک لشکرِ گراں مقیم تھا، اس کے پاس ساز وسامان کی کمی نہ تھی، سپاہ بے حساب، ساز وسامان انتخاب، جنگی تیاریاں لاجواب ______!

لیکن اس کثرتِ تعداد اور ساز وسامان کی فراوانی کے باوجود ان کے حوصلے پست تھے، مجاہدین کے مختصر سے دستوں نے دو مرتبہ اس لشکرِ گراں پر شب خون مارا تھا، اور اس کے حوصلے پراں کر دیئے تھے، یہ لوگ اب مجاہدین کے نام سے کانپتے تھے، ہر شب خون میں ان کے بہت سے جیالے اور تنومند سپاہی کھیت رہے، بہت سا سامان لوٹا گیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آس پاس کے علاقوں پر انہوں نے جو دہشت اپنی درندگی اور سفاکی کے باعث قائم کر رکھی تھی وہ ختم ہوگئی، جو لوگ یہ یقین کئے بیٹھے تھے کہ سکھوں کو شکست نہیں دی جا سکتی، وہ ناقابلِ تسخیر ہیں، انہوں نے اپنی آنکھوں سے انہیں نوک دم بھاگتے، راہ فرار اختیار کرتے مولی گاجر کی طرح کٹتے اور شکست کھاتے دیکھ لیا تھا اور اب وہ باور کرنے لگے تھے کہ سکھوں کی بڑی سے بڑی تعداد کو مٹھی بھر سرفروش شکست دے سکتے اور راہ فرار اختیار کرنے پہ مجبور کر سکتے ہیں۔

شکست کھانے کے بعد سکھوں کا لشکر پہاڑی کے دوسری سمت خیمہ زن ہو گیا

اس لشکر کے سردار کلونت سنگھ نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کو خط لکھ کر کمک منگائی تھی اور طے یہ کیا تھا کہ جب تک کمک نہ آ جائے، اس وقت تک مسلمانوں سے لڑائی نہیں چھیڑے گا، لیکن کمک کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بھی نہیں بیٹھا جا سکتا تھا، وقتاً فوقتاً مسلمانوں کی سرگرمیوں کا جائزہ لینے کے لئے وہ اپنے سپاہیوں کو پہاڑی کے اس پار بھیجا کرتا تھا، یہ کبھی بھیس بدل کر کبھی رات کو رات کی تاریکی میں، کبھی سوداگر کے روپ میں ٹوہ لگانے کی کوشش کیا کرتے تھے، لیکن اب تک لشکر کے حدود میں آنے کی ہمت نہیں پڑی تھی، اس لئے کہ جماعت مجاہدین کے کلابہ کے افسر اور سپاہی جو لشکر سے آگے اور پیچھے گشت کیا کرتے تھے، وہ ان کی خبر لے لیا کرتے تھے۔

آج اکرم اور حبیب نے پہاڑی کی چوٹی پر اجن سروں کو دیکھا تھا۔ وہ درحقیقت سکھ لشکر کے گوئندے تھے اور اسی مقصد سے نیچے اترنے کی کوشش کر رہے تھے کہ جماعت مجاہدین کے حالات کا جائزہ لیں، اور اپنے سردار پر اپنی کارگزاری کا سکہ بٹھا دیں۔

حبیب اور اکرم تیزی سے درختوں اور جھاڑیوں میں آڑ لیتے ہوئے آگے بڑھے کہ دشمن کے ان گوئندوں کو راستے ہی میں جا لیں، راستہ میں حبیب خاں نے کہا۔

"یہ کم بخت بھی عجیب لوگ ہیں، بار بار مار کھاتے ہیں، پٹتے ہیں، بھاگتے ہیں شکست یاب ہوتے ہیں، لیکن کسی نہ کسی صورت میں سامنے آتے ہی رہتے ہیں، یقیناً یہ دشمن کے آدمی ہیں، جو ہماری ٹوہ لینے کو آئے ہیں"

محمد اکرم:- تمہارا خیال صحیح معلوم ہوتا ہے —————— بہر حال اگر یہ دشمن کے آدمی ہوئے تو ان کی تواضع اور مہمانداری میں ہم کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔

حبیب خاں:- ارادہ تو میرا بھی یہی ہے، میں ان کی مہمانداری اور تواضع کا کافی مزہ چکھ چکا ہوں۔ موقع ملے تو بدلہ اتار دوں"

محمد اکرم:- ہاں تم کافی عرصہ تک ان کی قید میں رہے ہو۔

حبیب خاں :- ہاں بھئی بہت کافی عرصہ تک !

محمد اکرم :- بڑی سختیاں کی ہوں گی تمہاری جانِ ناتواں پر ؟

حبیب خاں :- تم ان کی درندگی اور سفاکی کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتے۔ زیادہ سے زیادہ مبالغہ کے ساتھ ان کی بربریت کا تصور قائم کرو۔ لیکن جو واقعات میں بتاؤں گا، انہیں سن کر تم محسوس کروگے کہ تم نے جو کچھ سوچا تھا، وہ بہت کم تھا۔

محمد اکرم :- تمہارا اتنا تو نہیں، لیکن کسی حد تک ان کی ننگِ انسانیت سفاکیوں کا اندازہ مجھے بھی ہے۔

حبیب خاں :- بس تو پھر یہ اچھا موقع ہے آج انہیں چھٹی کا دودھ یاد دلادیں گے ہم لوگ۔

محمد اکرم :- کیا تمہارا مطلب یہ ہے کہ ہم بھی ان پر ظلم کریں ——————
نہیں میرے دوست یہ نہیں ہو سکتا ——————

حبیب خاں :- تو کیا انہیں گلے سے لگاؤ گے ؟ معانقہ کرو گے ان سے ؟

محمد اکرم :- نہیں، یہ بھی نہیں کروں گا۔ امیر المومنین کا حکم ہے کہ دشمن کے ساتھ بھی زیادتی نہ کی جائے۔ اور میں اس حکم کی تعمیل کروں گا۔

حبیب خاں :- تو پھر آگے کیوں بڑھتے ہو واپس چلو۔

محمد اکرم :- یہ کیوں ؟ —————— واپس چلنے کا کیا سوال ہے ؟

حبیب خاں :- جب دشمن کے ساتھ حسن سلوک کا برتاؤ کرنا ہے۔ تو پھر بیکار کے ارادے سے آگے بڑھنا بیکار ہے۔

محمد اکرم :- (مسکراتے ہوئے) بگڑ گئے، خفا ہوگئے۔ آخر پٹھان ہونا !

حبیب خاں :- ہاں میں پٹھان ہوں، اور پٹھان ہمیشہ صاف اور کھری بات کہتا ہے وہ کسی طرح کی لگی لپٹی نہیں رکھتا۔

حبیب خاں :۔ اور ہم ان کا استقبال کرنے کو دل وجان سے تیار ہیں، آنے دو
محمد اکرم :۔ لیکن ہم استقبال یہیں کریں گے، کھلے میدان میں نہیں ۔
حبیب خاں :۔ یہ کیوں ؟ اس میں کیا مصلحت ہے ؟
محمد اکرم :۔ ممکن ہے ان کی تعداد بہت زیادہ ہو، اس صورت میں وہ آسانی سے ہم پر غالب آجائیں گے ۔ ہم دو ہی تو آدمی ہیں، اور اگر وہ یہاں آئیں تو اس چٹان کی آڑ لے کر ہم کم از کم آٹھ دس آدمیوں کا اچھی طرح سے مقابلہ کر لیں گے ۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ کچھ قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی، ایسا معلوم ہوا جیسے کچھ لوگ باتیں کرتے ہوئے اس طرف آرہے ہیں، اکرم اور حبیب خاں کیل کانٹے سے لیس ہو کر بیٹھ گئے ۔ یکایک دس پندرہ آدمیوں نے آکر چٹان کو گھیر لیا، اور ایک شخص نے پکار کر کہا ۔

"ہم تمہیں دیکھ چکے ہیں، تم چھپ نہیں سکتے، بچ نہیں سکتے ۔ زندگی عزیز ہے تو سامنے آجاؤ، ورنہ بڑی طرح مارے جاؤ گے ——————— !"

حبیب خاں اور اکرم باہر نکل آئے، سکھ سردار نے کہا ۔

"تم کون لوگ ہو ؟"

محمد اکرم :۔ کیا تم ہمیں نہیں پہچانتے ؟'
سکھ سردار :۔ نام بتاؤ ۔
محمد اکرم :۔ شمشیر خاں ۔
سکھ سردار :۔ (حبیب خاں کی طرف اشارہ کر کے) اور تمہارا نام ؟
حبیب خاں :۔ بندوق خاں ۔
سکھ سردار :۔ (غصہ میں) اچھا آپ لوگ مذاق فرما رہے ہیں ۔ تم دو ہو، ہم دس ہیں ۔ اور ہم سے چند قدم کے فاصلے پر دو سو مسلح سپاہی کمر بستہ کھڑے ہیں ۔ تم ہماری

بندوقوں سے اس طرح بھون دیے جاؤ گے جس طرح چنا بھاڑ میں بھونا جاتا ہے۔

محمد اکرم:۔ تمہاری بہادری کا حال ہمیں معلوم ہے۔

حبیب خاں:۔ کل کا شب خون یاد کرو، جب پاؤں سر پر رکھ کر بھاگ رہے تھے کئی بھگوڑوں کو اگر ترس کھاکر ہیں راستہ نہ دے دیتا تو وہ وہیں دم توڑ دیتے دہشت سے۔

محمد اکرم:۔ کچھ ایسا یاد پڑتا ہے (سکھ سردار کی طرف اشارہ کرکے) جیسے یہ بزرگ بھی انہی میں تھے

حبیب خاں:۔ (ہنستے ہوئے) یہ ورنہ ان جیسے تو بہت تھے۔

سکھ سردار:۔ (بگڑ کر) تم یہاں کیوں آئے تھے؟

محمد اکرم:۔ جس لئے تم آئے ہو۔

سکھ سردار:۔ یعنی ہمارے لشکر کے حالات کا سراغ لگانے؟

حبیب خاں:۔ ہم کسی لئے بھی آئے تھے تمہیں کیوں بتائیں؟

سکھ سردار:۔ اچھا تو اب ہتھیار ڈال دو، خیریت اسی میں ہے۔

محمد اکرم:۔ کوئی سپاہی جیتے جی یہ ننگ گوارا نہیں کر سکتا۔

سکھ سردار:۔ تو کیا تم لڑو گے؟

محمد اکرم:۔ اگر ہتھیار لینا چاہتے ہو تو ضرور لڑیں گے۔

حبیب خاں:۔ اور زندگی کی آخری رمق تک لڑیں گے۔

سکھ سردار:۔ تو یہ کیوں نہیں کہتے خودکشی کے ارادے سے پہاڑ پر چڑھے تھے تم لوگ۔!

محمد اکرم:۔ خودکشی مرد نہیں کرتے۔

سکھ سردار:۔ تو تم اسے بہادری سمجھتے ہو؟

محمد اکرم:۔ خون کے آخری قطرہ تک دشمن سے لڑتا رہنا، بے شک بہادری ہے۔

سکھ سردار:۔ میں تمہیں آخری موقع دیتا ہوں ہتھیار ڈال دو ——————!

سکھ سردار کے باقی نو ساتھی تلواریں سونتے حکم کے منتظر اس کے پیچھے کھڑے تھے

کہ یکایک انھوں نے دیکھا۔ان کے سردار کی گردن لڑھکتی ہوئی ان کی طرف آ رہی -

اکرم نے اتنی تیزی سے اپنی تلوار اس کی گردن پر ماری تھی کہ یہ سب پلک جھپکتے میں ہوگیا اور قبل اس کے وہ سنبھل سکیں، دو تلواریں بجلی کی تیزی سے پھر چمکیں اور دو گردنیں خاک و خون میں ستم طرنے لگیں۔اتنے میں بقیہ سکھ سپاہی سنبھل چکے تھے۔وہ تلوار گھماتے ہوئے آگے بڑھے لیکن صاف معلوم ہو رہا تھا۔حد درجہ دہشت زدہ ہو چکے ہیں، لڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔لیکن حوصلہ دم توڑ چکا ہے۔اکرم اور حبیب بھی ان میں گتھ گئے اور شپا شپ تلواریں چلنے لگیں۔ایک سکھ سپاہی اور گرا، اور اس کے گرتے ہی بقیہ چھ سپاہی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

اس جنگ میں حبیب خاں کے تو صرف خراش آئی ، لیکن اکرم کی کنپٹی پر گہرا زخم آگیا وہ تیورا کر گرا اور بیہوش ہوگیا -

باب ۵۰

ایک شبہ ایک شکایت

اکرم اور حبیب اپنے کیمپ میں واپس آگئے ، اکرم اب تک بے ہوش تھا اور حبیب خاں اس کی تیمار داری میں لگا ہوا تھا ، تھوڑی دیر میں دوسرے رفقاء جہاد کو بھی اطلاع ہو گئی وہ بھی احوال پرسی کے لئے آگئے ، سکھوں کی یورش کا حال سن کر بعض منچلے اپنے کچھ ساتھیوں کو لے کر پھر پہاڑ پر چڑھے ، مگر اب وہاں کسی سکھ کا پتہ نشان نہیں تھا ۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا یہ صرف دس ہی آدمی تھے ، جو ٹوہ لینے کے لئے آئے تھے لیکن ناکام واپس گئے ۔

سکھوں کے حوصلے اگرچہ ایک فاتح قوم کی حیثیت سے بہت بڑھے ہوئے تھے لیکن ان سرپھرے مجاہدوں نے انہیں سراسیمہ کر دیا تھا ، انکے بڑے بڑے لشکر زیادہ سے زیادہ سازوسامان کے ساتھ آئے تھے لیکن پیش قدمی کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے کھلے میدان میں لڑنے کی تو ہمت ہی نہیں پڑتی تھی ۔ چھاپہ مار جنگ پر اکتفا کرتے تھے اور اس میں بھی زیادہ تر شکست ہی ان کے حصہ میں آتی تھی ۔

پشاور اور اطراف سرحد میں اس وقت اللہ کا بول بالا تھا ، ہر اس مقام پہ جہاں مجاہدین قابض تھے ، شرعی حکومت قائم تھی ، اللہ کا بول بالا تھا ، رسم و رواج خاندان اور انسان کے بنائے ہوئے قانون پاؤں تلے روندے جا چکے تھے ، اسلامی زندگی نے مجاہدین کے صدقہ میں ایک عجیب نکھار پیدا کر دیا تھا ، ہر شخص اس قدرتی رنگ میں رنگا ہوا نظر آتا تھا مرد ہو یا عورت ، جوان ہو یا بوڑھا ، دولتمند ہو یا غریب ایسا معلوم ہوتا تھا ۔ عہد صحابہؓ پھر سے واپس آگیا ہے ۔ وہی للہیت وہی خود فراموشی ، وہی خدا ترسی وہی دین ومذہب کے لئے سب کچھ حتیٰ کہ جان تک قربان کر دینے کا ولولہ ، وہی کافروں اور مشرکوں کی سرکوبی کی

حسرت، وہی اسلامی معاشرہ میں اخوت، محبت، اور اعتماد باہمی کا مظاہرہ۔

اس صورت حال نے دولت مندوں سے زیادہ غریبوں اور مفلوک الحال لوگوں میں زندگی کی ایک نئی رمق پیدا کر دی تھی، اور انہی کی اکثریت تھی، یہ وہ لوگ تھے جو نسلوں اور پشتوں سے کچلے جا رہے تھے پامال کئے جا رہے تھے، پامال کئے جا رہے تھے یہ مسلمان تھے، ایک خدا کو مانتے تھے۔ رباباً ثنا واحد آقا کی رسالت پر ایمان رکھتے تھے۔ نماز پڑھتے تھے، لیکن مسلمان ہی تھے جو انہیں غلام سمجھتے تھے، ان کے حقوق چھینتے تھے اور زندگی کی راہیں ان پر بند کر دیتے تھے۔ نہ ان کے ساتھ عدل ہوتا تھا، نہ انہیں مساوات کی زندگی بسر کرنے کا حق حاصل تھا۔

لیکن جب سے مجاہدین نے اس سرزمین پر قدم رکھا تھا، سماں بدل گیا تھا، رت پلٹ گئی تھی، حالات میں انقلاب آ گیا تھا، اب کوئی ظلم کا شاکی نہ تھا، اور اگر تھا تو اس کی تلافی میں ایک لمحہ کی دیر بھی نہیں لگ سکتی تھی، اب کوئی عدم مساوات کا شکوہ سنج نہیں تھا اور اگر تھا تو امیر جماعت فوراً اس اونچ نیچ کے امتیاز کو ختم کر دیتا تھا۔

محمد اکرم کی تیمارداری اور علاج کا سلسلہ جاری تھا، وہ اگرچہ کافی زخمی ہو گیا تھا۔ لیکن اس کا زخم مہلک نہ تھا۔ لشکر میں جراح بھی موجود تھے، ان کی بروقت توجہ سے اس کی حالت سدھرنے لگی اور چند ہی روز میں وہ بھلا چنگا ہو گیا۔

ایک روز اکرم کے خیمے میں چند دوست بیٹھے ہوئے تھے، حبیب خاں بھی موجود تھا آپس میں باتیں ہو رہی تھیں، آج خلاف معمول، اکرم ذرا ملول و افسردہ نظر آ رہا تھا۔ حبیب خاں نے محبت بھرے لہجہ میں کہا۔

"آج تم کچھ افسردہ اور پریشان نظر آتے ہو، کوئی خاص بات ہے؟"

محمد اکرم نے مسکراتے ہوئے لیکن مضمحل لہجہ میں کہا۔

"نہیں کوئی خاص بات تو نہیں لیکن ایک خاص بات ضرور ہے۔"

حبیب خاں نے پوچھا،

تو پھر کہتے کیوں نہیں ؟

ایک اور ساتھی شہباز خاں نے کہا۔

معلوم ہوتا ہے یہ اکرم میاں ہمیں غیر سمجھتے ہیں، اپنا نہیں سمجھتے۔

دلاور خاں بولا۔

جو بات ہے وہ کہتے کیوں نہیں ؟ بتاؤ کیا بات ہے ؟

محمد اکرم:۔ بات یہ ہے کہ میں ڈر رہا ہوں، کہیں ہماری یہ تحریک ناکام نہ ہو جائے۔

حبیب خاں:۔ آپ احمق ہیں اچھے خاصے ——————— یہ تحریک ناکام ہو سکتی ہے ؟ یہ انسان کی نہیں خدا کی تحریک ہے، ہم جاہ و منزلت، دولت و ثروت اور اقتدار و حکومت کے لئے میدان میں نہیں آئے ہیں، اس لئے آئے ہیں کہ خدا کی راہ میں مرمٹیں، کیا تم ہمارے فنا ہو جانے اور مرمٹنے کو تحریک کا ناکام ہونا سمجھتے ہو ؟ اگر بات یہ ہے تو بڑے کوتاہ نظر، اور کم فہم ہو۔

شہباز خاں:۔ ہمارے مرمٹنے اور فنا ہو جانے کے بعد بھی یہ تحریک زندہ رہے گی۔ اس وقت تک زندہ رہے گی، جب تک اسلام قائم ہے اور مسلمان زندہ ہیں۔

دلاور خاں:۔ نہ جانے اکرم کے دل میں یہ خیال کیوں آگیا ؟

محمد اکرم:۔ میں کچھ ایسا محسوس کر رہا ہوں، اور خدا کرے میرا خیال غلط ہو کہ اب ہم میں کچھ بد دلی پیدا ہو رہی ہے، مقامی اور علاقائی تعصب بڑھتا جا رہا ہے، ایک خاص جماعت ہے جو گو ہمارے ساتھ ہے، لیکن ہمارے خیالات ہمارے عمل اور ہمارے معتقدات سے اختلاف رکھتی ہے۔

شہباز خاں:۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے ! ایسا نہیں ہو سکتا۔

محمد اکرم:۔ میں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں اور تم اپنے حسن ظن کی بنا پر اس کی تردید کرتے ہو۔

دلاور خاں:۔ غور کرتا ہوں تو اکرم کی بات میں صداقت نظر آتی ہے، خوانین کا ایک طبقہ واقعی

امیرالمومنین سے برگشتہ ہوتا جارہا ہے۔

محمد اکرم:۔ ہم اس کی پرواہ نہیں کرتے کون ہمارا ساتھ دیتا ہے کون نہیں دیتا، جو ساتھ دے گا، وہ ہمارا نہیں خدا کا ساتھ دے گا، جو الگ رہے گا وہ ہم سے نہیں خدا سے الگ رہے گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ علیٰحدگی جماعت میں تفریق کا باعث نہ بن جائے؟

شہباز خاں:۔ شاید تمہارا اشارہ خاوے خاں، پائندہ خاں، اور یار محمد کی حرکتوں کی طرف ہے؟

محمد اکرم:۔ ہاں تم صحیح سمجھے۔

شہباز خاں:۔ یہ لوگ کبھی بھی خلوص کے ساتھ شریک نہیں ہوئے تھے۔

محمد اکرم:۔ یہ بھی سچ ہے۔

شہباز خاں:۔ ان میں کسی نے مصلحتِ وقت کو پیشِ نظر رکھ کر ساتھ دیا تھا۔ کوئی کسی حریف کو نیچا دکھانے کے لئے ہمارے جھنڈے تلے آگیا تھا، کسی کا مقصد جاہ و منصب تھا۔

محمد اکرم:۔ لیکن یہ ایک متعدی مرض ہوتا جارہا ہے، میرے دوست!

شہباز خاں:۔ اطمینان رکھو ایسا نہیں ہو سکتا۔

محمد اکرم:۔ صرف تمہارے کہنے سے مان لوں؟

شہباز خاں ہنسنے لگا۔

باب ۵۱

عہد

گفتگو کا سلسلہ جاری تھا، یہ گفتگو کبھی نرم ہو جاتی، کبھی گرم، لیکن ماحول بہرحال دوستانہ تھا جیسے چند دوست شکوہ و شکایت اور ذکر و حکایت کا دفتر لے کر بیٹھ جائیں۔

شہباز خاں نے حبیب خاں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"تمہاری کیا رائے ہے حبیب خاں؟"

حبیب خاں نے پہلو بدلتے ہوئے جواب دیا۔

جتنا جتنا اکرم کی باتوں پر غور کرتا ہوں، دل انہیں قبول کرتا جاتا ہے۔

دلاور خاں:۔ ہم میں سے ہر ایک کو چاہیئے کہ اپنا دل ٹٹولے خود اپنا محاسبہ کرے اور بتائے کہ وہ خود اس زہر سے کہاں تک متاثر ہے؟

شہباز:۔ تمہارا خیال ہے ہم لوگ بھی اس مرض میں مبتلا ہیں؟ یہ ظلم!

دلاور خاں:۔ حالات جب یہ ہوں کہ ساتھی دغا دینے لگیں، دوست دشمن بن جائیں، وفادار غداری پر اتر آئیں تو پھر کس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے؟

حبیب خاں:۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ خادے خاں، پائندہ خاں اور یار محمد خاں وغیرہ کی حرکتیں خود غرضی اور جاہ طلبی پر مبنی ہیں، لیکن اب اکرم نے توجہ دلائی تو ایسا محسوس ہوتا ہے اور یہ لوگ اپنے ساتھ بہت سے ساتھ بہت سے ساتھی رکھتے ہیں، اور یہ ساتھی اگر سب نہیں تو ان کا ایک بڑا حصہ ہم میں موجود ہے اور ہماری دوستی کا دم بھر رہا ہے۔

شہباز خاں:۔ (ہنستے ہوئے) تم لوگ بڑے جذباتی ہو۔

دلاور خاں:۔ یعنی ہم جو کچھ سوچ سمجھ رہے ہیں غلط ہے ؟

شہباز خاں:۔ اور کیا ــــــــــــ بالکل غلط !

حبیب خاں:۔ وہ کیوں کر جناب ؟

شہباز خاں:۔ یہاں تک تو میں مانتا ہوں کہ خوانین میں سے جو لوگ ہمارے ساتھ شریک ہوں یا شریک ہیں، ان میں مخلص کم ہیں، غرض مند اور جاہ طلب زیادہ ہیں۔

دلاور خاں:۔ پھر رہ کیا گیا ؟

شہباز خاں:۔ لیکن یہ ساری آبادی جو امیر المومنین کا دم بھر رہی ہے۔ جس نے امیر المومنین کے دستِ مبارک پر بیعت کی ہے، خوانین ہی پر تو مشتمل نہیں ہے۔

حبیب خاں:۔ ہاں تو ــــــــــــ ؟

شہباز خاں:۔ اور یہی آبادی ہے جو دل سے ہمارا ساتھ دے گی، اور خوانین کے بہکاوے میں نہیں آئے گی۔

دلاور خاں:۔ آخر اس حسنِ ظن کی بنیاد کیا ہے ؟

شہباز خاں:۔ اس لئے کہ خود اس کے مفاد کا تقاضا یہی ہے۔

محمد اکرم:۔ بات ذرا صفائی کے ساتھ کرو، کیا کہنا چاہتے ہو ؟

شہباز خاں:۔ یہ عوام وہ ہیں جو خوانین کے ظلم وستم کے ہر روز شکار بنتے رہتے تھے، جن پر آئے دن زیادتیاں ہوتی رہتی تھیں، ان کی نہ عزت محفوظ تھی نہ جان، نہ مال، نہ ناموس،

حبیب خاں:۔ یہاں تک تو بالکل ٹھیک ہے مگر ــــــــــــ

شہباز خاں:۔ اگر مگر کچھ نہیں ــــــــــــ امیر المومنین کا دور دورہ قائم ہونے کے بعد ان کی کایا پلٹ گئی، کیا یہ غلط ہے ؟

دلاور خاں:۔ بالکل ٹھیک۔

شہباز خاں:۔ امیر المومنین کے ظلِ عاطفت میں آنے کے بعد ان کے چھنے ہوئے حقوق واپس

مل گئے ـــــــــــ کیا یہ سچ نہیں ہے ؟

حبیب خاں :۔ بالکل سچ ۔

شہباز خاں :۔ جماعت مجاہدین کے دوست ، ساتھی اور رفیق بن جانے کے بعد انہیں وہ مرتبہ حاصل ہوگیا ، جو اسلامی سوسائٹی میں ایک مسلمان کو حاصل ہو سکتا ہے ـــــــــــ کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے ؟

محمد اکرم :۔ کوئی انکار نہیں کر سکتا اس کے امر واقعہ ہونے سے ۔

شہباز خاں :۔ اگر یہ سب کچھ سچ ہے اور امر واقعہ ہے تو پھر آپ حضرات کی قیاس آرائیاں بے بنیاد ہیں ۔

دلاور خاں :۔ وہی تو دریافت طلب ہے کیوں کر ؟

شہباز خاں :۔ کوئی شخص اپنے ہاتھوں اپنی گردن نہیں کاٹ سکتا ، یا کاٹ سکتا ہے ؟

محمد اکرم :۔ ایسی حرکت کوئی پاگل ہی کر سکتا ہے ۔

شہباز خاں :۔ تو پھر جب یہاں کے عوام پاگل ہو جائیں گے ، تب غدار خوانین کا ساتھ دیں گے

دلاور خاں :۔ (ہنستے ہوئے) سبحان اللہ کیا بات کہی ہے جناب نے ۔

شہباز خاں :۔ بات مذاق میں نہ ٹالو ۔ واقعہ پر واقعہ کی حیثیت سے غور کرو ۔

دلاور خاں :۔ وہی تو کر رہا ہوں ۔

شہباز خاں :۔ دیکھو نا اگر یہ عوام ہم سے ، نہیں ، غلطی ہوئی ، امیر المومنین سے برگشتہ ہوئے تو عاقبت سے پہلے اپنا آپ بگاڑ لیں گے ۔

حبیب خاں :۔ یعنی امیر المومنین انہیں قتل کر دیں گے ؟ ـــــــــــ اگر تم یہ سمجھتے ہو تو امیر المومنین کو غلط سمجھتے ہو ۔

شہباز خاں :۔ میں ایسی بات سوچ بھی نہیں سکتا ، میرا مطلب یہ ہے کہ اس طرح یہ عوام پھر خوانین کے پنجہ میں گرفتار ہو جائیں گے ، جو کچھ انہوں نے پایا اور حاصل کیا ہے اس

سے محروم ہوجائیں گے۔ جس درجہ اور منزلت پرپشت ہا پشت کی غلامی کے بعد یہ فائز ہوئے ہیں وہ چھن جائے گا کیا اس پر کوئی آدمی بھی تیار ہوسکتا ہے، ؟

حبیب خاں:۔ نہیں ——————

دلاور خاں:۔ کوئی نہیں تیار ہوسکتا۔

محمد اکرم:۔ لیکن عوام کالانعام مشہور ہیں، انہیں بہکایا جاسکتا ہے، ورغلایا جاسکتا ہے سبز باغ دکھائے جاسکتے ہیں، انہیں اسیرِ فریب کرکے کام نکالا جاسکتا ہے اور پھر انہیں ٹھکرایا جاسکتا ہے، کیا ہمیشہ سے یہی ہوتا نہیں آیا ہے ؟

شہباز خاں:۔ ہاں ٹھیک کہتے ہو لیکن اس قدر زیادہ بدگمان ہونے کی ضرورت نہیں، انشاء اللہ ایسا کبھی نہیں ہوگا یقین رکھو۔

حبیب خاں:۔ ہوش کے ساتھ اچھا ان باتوں کو چھوڑو، آؤ ہم آپس میں عہد کریں کہ خواہ ادھر کی دنیا ادھر ہوجائے۔ ہم کسی قیمت پر اپنے جادۂ صواب سے منحرف نہیں ہوں گے، خواہ ہمیں کوئی سبز باغ دکھائے، یا دھمکی دے جب تک زندہ ہیں تحریکِ جہاد میں حصہ لیتے رہیں گے۔ ہم میں نہ کوئی ملکی ہے نہ غیر ملکی، نہ سرحدی نہ قندھاری، نہ ہندوستانی نہ کابلی، ہم صرف مسلمان ہیں۔ مسلمان ہی جیئں گے، مسلمان ہی مریں گے، خاندان اور دوستی، رشتہ داری، مروّت دھمکی، لالچ، کوئی چیز بھی ہمیں اس راہ اور فیصلہ سے نہیں ہٹا سکے گی۔ ہم چند آدمی بھی اگر یہ عہد کرلیں اور اس پر صداقت اور استقامت کے ساتھ قائم رہیں تو بھی بہت ہے۔ ممکن ہے ہم کامیاب نہ ہوں، ممکن ہے اکرم کا خیال صحیح ہو اور یہ زہر ہمارے عوام میں بھی سرایت کرجائے۔ ممکن ہے ہمارا کوئی ساتھی نہ رہے اور ہم مقصد میں ناکام ہوکر اس دنیا سے گزر جائیں، اگر ایسا ہوا تو بھی ہم ایک مثال قائم کرجائیں گے۔ اور یہ مثال نقشِ قدم کا کام دے گی، جس پر ہمارے بعد آنے والے لوگ رہبری کریں گے۔

شہباز خاں، دلاور خاں اور محمد اکرم نے بھی جوش و خروش کے ساتھ اس عہد پر لبیک کہا اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر خدا کو گواہ کر کے وہی الفاظ دہرا دیئے۔ جو ابھی حبیب خاں نے کہے تھے۔ اور پھر بڑے جوش اور جذبہ کے ساتھ انہوں نے آپس میں مصافحہ کیا۔ ان کے چہرے پھول کی طرح کھلے ہوئے تھے اور ایسا لگتا تھا جیسے کوئی بہت بڑا بوجھ تھا جو اب اتر گیا۔

باب ۵۲

پس منظر

اور جو بات پہلے مشکوک اور مشتبہ تھی، وہ اب حقیقت اور واقعہ کی صورت میں نظر آ رہی تھی، کہ تارسنگھ کا پھیلایا ہوا مرض ——————— عصبیت ——————— اب عام ہوتا جا رہا تھا۔ مجاہدین کا وہ طبقہ، جو مہاجر تھا، جو ہندوستان سے آیا تھا، اب ملکی لوگوں کی نظر میں کھٹکنے لگا یا تحریک مجاہدین اب ایک اسلامی، دینی، مذہبی، قومی اور ملی تحریک نہیں رہ گئی تھی، بلکہ اب وہ ایک غیر ملکی تحریک کی نظر سے دیکھی جا رہی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ "باہر" کے کچھ لوگ آئیں اور دین و مذہب کے نام پر حکومت اور اقتدار کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لیں ان لوگوں کو سکھوں اور غیر مسلموں کی غلامی منظور تھی، یہ انہیں فخر و انبساط کے ساتھ رسوا کن خراج دیتے تھے اسلام کے احکام و قواعد ان پر جاری کریں۔ یہ سکھوں کو باز، گھوڑے اور دوسری قیمتی چیزیں نذر اور خراج کی صورت میں دے سکتے تھے۔ لیکن یہ بات ان کے دل کو نہیں لگتی تھی کہ مسلمان حکومت کو یہ عشر اور زکواۃ کی معمولی سی رقم ادا کریں تاکہ وہ سعی استخلاص جاری رکھے۔ تاکہ وہ غلامی کی بیڑیاں اور زنجیریں کاٹتی رہے۔ تاکہ وہ دشمن کی سرکوبی کرتی رہے۔ یہ اپنے بھائیوں کی گردن کاٹنے کے لئے سکھوں سے اور غیر مسلموں سے ساز باز کر سکتے تھے، ان کی مدد کر سکتے تھے، اگر یہ اس پر آمادہ نہیں تھے کہ بھائی بھائی بن کر رہیں، کوئی کسی پر دست تعدی دراز نہ کرے، کوئی کسی کا حق نہ مارے، کوئی کسی پر زیادتی نہ کرے کتنی عجیب بات تھی ——————— لیکن ایک برہنہ اور تابندہ حقیقت!

پہلے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان لوگوں نے اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے حضرت سید صاحب

کا ساتھ دیا تھا، تاکہ اسلام سربلند ہو، مسلمان سرخرو ہوں، دشمن ذلیل و رسوا ہوں، لیکن اب ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ "سید بادشاہ" کے دستِ حق پرست پر بیعت کرنے والے مقامی لوگوں میں خاص تعداد ان لوگوں کی تھی جو مالِ غنیمت کی لالچ میں، کسی رشتہ دار کو زک دینے کے لئے کسی کے دستِ انتقام سے بچنے کے لئے یا پھر کسی خاص ذاتی یا دنیاوی مصلحت کے لئے شریک ہوئے تھے، لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ اسلام کی خدمت نے ان کی نار وا آزادیاں چھین لی ہیں اور ناگزیر پابندیاں عائد کر دی ہیں تو یہ بگڑ گئے۔ بپھر گئے، دشمن سے ساز باز کرنے لگے، غداری، دین فروشی، وطن دشمنی اور مسلم آزادی پر آمادہ ہو گئے۔

یہ اس میں مگن تھے۔ کہ آج اس کی زمین دبالی، کل اس کی دخل پر چھاپہ مارا۔ مگر اب یہ سلسلہ بند ہو چکا تھا۔ یہ اپنے خاندان کی بیوہ عورتوں سے باندیوں کی طرح کام لیتے تھے انہیں زندگی کی کسی لذت سے لطف اندوز ہونے کا مستحق نہیں سمجھتے تھے لیکن اب یہ اس "ننگ" کو گوارا کرنے پر مجبور تھے کہ عقدِ بیوگان کے راستہ میں رکاوٹ نہ ثابت ہوں یہ اپنے گھر کی نوجوان لڑکیوں کو بٹھائے رکھتے تھے۔ اور خواہ وہ نوجوان سے جوان اور جوان سے بوڑھی ہو جائیں، لیکن اس وقت تک ان کی شادی نہیں کرتے تھے جب تک ان کی منہ مانگی یا کم از کم خاطر خواہ قیمت نہ مل جائے، اب یہ معصیت تھی، اور معصیت کی سزا بھی ملتی تھی پہلے یہ "دشمن" کو اور وہ بھی غیر مسلم دشمن کو خراج نذرانہ اور تحائف بخوشی دیتے تھے۔ لیکن یہ بات کبھی ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ آئی تھی کہ کوئی مسلم حکومت قائم ہو گی، اور وہ آئین شرع کا نفاذ کرے گی۔ اور دین و مذہب کے نام پر ان سے زکواۃ بھی وصول کرے گی اور عشر بھی لے گی، انہیں زکواۃ ادا کرتے ہوئے اور عشر دیتے ہوئے ایک بوجھ سا محسوس ہوتا تھا، مگر مجبوراً دینا پڑتا تھا، پہلے یہ نہروں اور تالابوں میں برہنہ نہاتے تھے، اور اسے بالکل جائز سمجھنے لگے، لیکن اب یہ ایک جرم تھا اور جرم کی سزا ملتی ہی ہے، پہلے نماز پڑھنا نہ پڑھنا ان کی مرضی پر منحصر تھا، اب وہ مجبور تھے کہ نماز پڑھیں، پہلے کم تر اس لئے تھا

کہ برتر کے سامنے جھکے اور برتر اس لئے تھا کہ کمتر اسے سجدۂ تعظیمی کرے، لیکن اب یہ چیز ختم ہو چکی تھی، اب نہ کوئی کمتر تھا، نہ برتر، اب برتری اور بزرگی کا معیار صرف "تقویٰ" تھا۔

پہلے دین سے ناآشنا ملاؤں اور طریقت سے ناواقف پیروں کی حکومت تھی، اسلام دنیا کا پہلا مذہب ہے، جو خدا اور بندے کے درمیان کسی واسطہ کو تسلیم نہیں کرتا، لیکن اسلام کے ماننے والوں نے از خود یہ واسطہ پیدا کر لیا، کوئی مذہبی تقریب اور رسم انجام نہیں پا سکتی تھی، جب تک ملا یا پیر کا دستِ شفقت شامل نہ ہو۔ سید بادشاہ کی اسلامی حکومت نے بُت کی طرح اس واسطہ کو توڑ دیا، خدا اور بندے کے درمیان پھر کوئی واسطہ باقی نہیں رہا۔ یہ بات عوام کے لئے بھی نئی تھی، انہوں نے بھی اسے محسوس کیا، لیکن نام نہاد پیروں اور ملاؤں کے ہاں تو صفِ ماتم بچھ گئی ان کا روزگار جاتا رہا۔ ان کا ذریعۂ معاش ختم ہو گیا۔ انہیں حلوے مانڈے نے داغِ مفارقت دے دیا، وہ کہیں کے نہیں رہے، لہٰذا خفیہ اور اعلانیہ وہ اس تحریک، اس حکومت، اس آئین شرع کی بیخ کنی میں مصروف ہو گئے۔

شروع شروع میں سب کو یہ حکومت اچھی لگی تھی، لیکن جب اس کی ضرب نفس پر، جیب پر، پندار پر پڑی، تو عقیدت، بیزاری، نفرت اور حقارت سے بدل گئی۔

سید بادشاہ کے یمن قدم نے ملکی اور غیر ملکی، مقامی اور غیر مقامی کی تفریق ختم کر دی تھی، لیکن یہ آئین شرع کی ناقابلِ برداشت آفت لائی ہوئی تو انہی غیر ملکیوں یعنی مہاجروں کی تھی، یہ اگر نہ آتے، یہ اگر نہ ہوتے تو کاہے کو یہ روزِ بد دیکھنا پڑتا؟ کیوں شرع کی چٹان سے شیشۂ دل ٹکراتا اور چُور چُور ہوتا؟ کس لئے نفسِ بے محابا نت نئی جکڑ بندیوں میں گرفتار ہوتا؟ آج اگر یہ مہاجر چلے جائیں یا کسی طرح سے فنا ہو جائیں، تو چھنی ہوئی آزادی پھر واپس

لے سیرت سید احمد شہید (غلام رسول مہر)

ل سکتی ہے۔ آئین شرع پھر قرآن وحدیث کے اوراق میں بند ہو جائے گا اور ہم آزاد ہو جائیں گے پھر وہی رنگ رلیاں ہوں گی، نفس پرستیاں ہوں گی، آسائشیں اور راحت پسندیاں ہوں گی ——— لیکن یہ کم بخت مجاہد مٹیں کیوں کر، فنا کس طرح ہوں ———؟

یہی وہ جذبہ تھا جس نے عصبیت کے دبے ہوئے جذبہ کو ابھارا، اور غیر ملکی مہاجروں سے نفرت اور بیزاری کا جذبہ شدید سے شدید تر صورت اختیار کرنے لگا۔

باب ۵۳

سیّد بادشاہ کا آستانہ

بات اتنی بڑھ چکی تھی، اور مقامی وغیر مقامی کی کشمکش نے اتنی نمایاں صورت اختیار کر لی تھی کہ ایک روز ایک قابل غور مسئلہ کی حیثیت سے یہ بات سید بادشاہ یعنی حضرت سید صاحب کی قیام گاہ پر زیر بحث آئی۔

کمرہ میں سناٹا چھایا ہوا تھا، حضرت سیّد صاحب خاموش اور متفکر سے نظر آ رہے تھے۔ پاس ہی حضرت مولانا اسمٰعیل بھی رونق افروز تھے، ان کے چہرہ پر نور پر بھی تشویش و اضطراب کے آثار نمایاں تھے۔ چند عقیدت مند اور جاں نثار تھے۔ جو پیکر سکوت بنے بیٹھے تھے۔ اور حزن و ملال ان کے چہرے سے صاف نمایاں تھے، ایک صاحب مولوی عبدالکریم نے حضرت سیّد صاحب کو مخاطب کر کے فرمایا،

"یا حضرت! اب تو حالات نا قابلِ برداشت صورت اختیار کرتے جاتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے دشمن میدانِ جنگ میں ہم پر غالب نہ آ سکا، لیکن ہمارے گھر میں گھس آیا اور جیت گیا"

ایک دوسرے شریک مجلس عجب خاں نے کہا:

"مولانا! یہ آپ کیا فرماتے ہیں، کیا مقصد ہے آپ کا؟"

مولوی عبدالکریم:- ملکی اور غیر ملکی کی تفریق اب ایک فتنہ بنتی جا رہی ہے، اگر یہی میل و منافر رہے، تو ہم جیتی ہوئی بازی ہار جائیں گے۔

عجب خاں:- یہ آپ صحیح فرماتے ہیں۔ لیکن یہ چند لوگوں کی شورہ پشتی ہے، ختم ہو جائے گی

مولوی عبدالکریم:۔ اب تک میں بھی اسی خیال میں تھا، لیکن اب حالات مجبور کر رہے ہیں کہ امید کا دامن چھوڑ دیا جائے۔

عجب خاں:۔ نہیں ایسا نہ کہیئے، جب تک ہم جیسے جان باز اور سرفروش موجود ہیں، کچھ نہیں ہو سکتا، ہم حضرت سید صاحب پر اور اپنے مجاہد ساتھیوں پر قربان ہو جائیں گے، لیکن ان پر آنچ نہ آنے دیں گے۔

مولوی عبدالکریم:۔ آپ کے اخلاص و دیانت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا، اور آپ جیسے چند لوگ ہیں، جو مایوسی کی تاریکی میں شمع امید بن کر جھلملا رہے ہیں، لیکن آپ اکیلے کیا کر سکتے ہیں، حالات بہت زیادہ بگڑ چکے ہیں۔

عجب خاں:۔ میں انکار نہیں کرتا۔ لیکن امید رکھتا ہوں وہ سدھر جائیں گے۔

مولوی عبدالکریم:۔ کیوں کر ————— ؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم جان ہتھیلی پر رکھ کر دشمن پر شب خون مارتے ہیں، وہ ہراساں ہو جاتا ہے، سراسیمہ ہو جاتا ہے اس کی جمعیت انتشار سے بدلنے لگتی ہے، لیکن جب پیچھے مڑکر دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے، ہمارے ملکی بھائی مالِ غنیمت لوٹ لوٹ کر واپس جا چکے ہیں جو چند باقی ہیں وہ بھی واپس جا رہے ہیں۔ دشمن کمینگاہ سے ہماری اس کمزوری کو دیکھ لیتا ہے، کیا بدھ سنگھ کے لشکر پر جب ہم نے شب خون مارا تھا، یہی واقعہ نہیں گزرا تھا؟

عجب خاں:۔ اس سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے۔

مولوی عبدالکریم:۔ کیا اس طرح ہماری ہوا خیزی نہیں ہوتی ؟

عجب خاں:۔ ضرور ہوتی ہے۔

مولوی عبدالکریم:۔ کیا اس طرح ہم کمزور نہیں ہوتے اور دشمن کی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی؟

عجب خاں:۔ ہوتی ہے مولانا۔

مولوی عبدالکریم:۔ بتایئے پھر اس کا کیا توڑ ہے ؟ یہ ایک اکیلا واقعہ نہیں، اس طرح کے

واقعات آتے دن پیش آتے رہتے ہیں۔

عجیب خاں:۔ آپ صحیح فرماتے ہیں۔

مولوی عبدالکریم: حبیب خاں نے جب وہ رنجیت سنگھ کی قید سے چھوٹ کر آیا تھا، مجھے بتایا تھا کہ کرتار سنگھ نے خوانین کو رشوت اور لالچ کے ذریعہ غداری اور قوم فروشی پر آمادہ کر لیا ہے، پہلے میں نے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی لیکن اب ماننا پڑتا ہے، اس کی اطلاع بالکل صحیح تھی۔

عجیب خاں:۔ واقعی کرتار سنگھ نے اپنا کام خوبی سے انجام دیا، اس نے ہم میں سے بہتوں کو درپردہ سازباز کر کے توڑ لیا۔

مولوی عبدالکریم:۔ اور ابھی نہ جانے کتنوں کو توڑے گا۔

عجیب خاں:۔ خدا نہ کرے، ایسا نہ کہیے مولانا!

مولوی عبدالکریم:۔ خاں صاحب ذرا غور تو کیجئے، ہم اپنی آنکھیں کس طرح بند کر لیں۔ جو کچھ پیش آ رہا ہے، جو کچھ دیکھ رہے ہیں، اس سے انکار کیسے کر دیں؟

عجیب خاں:۔ یہ تو میں بھی نہیں کہتا مولانا!

اب تک عجیب خاں اور مولوی عبدالکریم میں گفتگو ہو رہی تھی، اب حضرت سید صاحب نے گفتگو کا آغاز فرمایا، انہوں نے بڑے موثر اور دل گداز لہجہ میں ارشاد کیا۔

"ہم یہاں کس لئے آئے ہیں؟ ——— کیا اس لئے کہ اپنی حکومت کر لیں؟ بادشاہ بن جائیں یا اس لئے کہ خدا کا حکم جاری کریں، شریعتِ اسلامیہ کا نفاذ کریں اور اس اسلامی خطّہ پر غیر مسلموں کا جو تسلّط قائم ہو گیا ہے اسے ختم کر دیں۔

عجیب خاں:۔ بے شک آپ اس لئے تشریف لائے ہیں، کوئی دشمن بھی آپ کے اخلاص اور حسنِ سلوک پر شک نہیں کر سکتا۔

حضرت سید صاحب:۔ جب تک ہم نے اس سرزمین پر قدم نہیں رکھا تھا یہاں کے حالات

کیا تھے ؟

عجیب خاں :۔ نہایت ابتر، بہت بدتر،

حضرت سیّد صاحب :۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ یہاں کے مسلمان مٹھی بھر غیر مسلموں کے محکوم تھے ؛

عجیب خاں :۔ بے شک یہ واقعہ تھا۔

حضرت سیّد صاحب :۔ مگر اب کیا کیفیت ہے ———— ؟

عجیب خاں :۔ اب حالات بدل چکے ہیں ، جن جن مقامات پر اسلامی لشکر نے قبضہ کیا ہے وہاں شریعت کی حکومت قائم ہے ، اور غیر اسلامی تسلط ختم ہو چکا ہے ۔

مولوی عبدالکریم : اور اگر ہمیں موقع ملے تو انشااللہ باقی مقامات پر بھی یہی کیفیت ہوگی ، حق کا بول بالا ہوگا اور باطل کو سر چھپانے کی جگہ نہیں ملے گی ۔

مولانا اسمٰعیل :۔ انشااللہ ، انشااللہ۔

حضرت سیّد صاحب :۔ ہم نے یہ کام پورے اخلاص اور نیک نیتی کے ساتھ کرنا چاہا تھا۔ لیکن اگر یہاں کے لوگ نہیں چاہتے کہ ہم اس کام کو جاری رکھیں ، تو ہم یہاں سے چلے جائیں گے ۔

عجیب خاں :۔ (سراپا اضطراب بن کر) یا حضرت ! یہ آپ کیا فرماتے ہیں !

حضرت سیّد صاحب :۔ ہم اس لئے آئے تھے کہ مسلمان آزاد ہوں ، خود مختاری کی زندگی بسر کریں ، اس لئے نہیں آئے تھے کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف ہو جائیں ، ایک دوسرے سے لڑنے لگیں ۔ خدا کی قسم ہمارا یہ مقصد نہیں

عجیب خاں :۔ یا حضرت ! آپ بالکل بجا فرماتے ہیں ۔

حضرت سیّد صاحب :۔ لیکن اب کیا ہو رہا ہے ؟ کیا مولوی عبدالکریم نے حقیقت اور واقعہ کی ترجمانی نہیں کی ہے ۔ ؟

عجیب خاں :۔ انہوں نے ایک بات بھی غلط نہیں کہی ۔

مولانا اسمٰعیل :۔ پھر اس کا مداوا کیا ہے ۔
عجب خاں :۔ آپ کا شمار ارباب حل وعقد میں ہے، جو کچھ آپ فرمائیں وہی درست اور بجا ہے ۔
مولانا اسمٰعیل :۔ دو ہی صورتیں ہیں، یا تو ہم ان لوگوں سے لڑیں، جنہوں نے امیرالمومنین کے دست مبارک پر بیعت کی۔ لیکن اب عملاً بیعت توڑ چکے ہیں۔ ورنہ یہاں سے چلے جائیں ۔

ملک خدا تنگ نیست پائے مرا لنگ نیست
خدا کا کام ہے، یہاں نہیں کہیں اور سہی

عجب خاں :۔ مولانا! سب کچھ فرمایئے، جو چاہے کیجئے۔ مگر جانے کا نام نہ لیجئے۔ میری آنکھیں عہد جاہلیت کا وہ منظر بھی دیکھ چکی ہیں، جب سید بادشاہ کا کوکبۂ جلال یہاں نہیں آیا تھا اور میری آنکھیں وہ نظارہ بھی کر رہی ہیں، جو تشریف آوری کے بعد پیش نظر ہے، اللہ اللہ کتنا زمین وآسمان کا فرق ہے، ان دونوں صورتوں میں ۔

سیہ کار تھے باصفا ہو گئے ہم

اگر خدانخواستہ آپ تشریف لے گئے، تو پھر وہی عہد لوٹ آئے گا، جو ہرگز ایک مسلمان خطّے کے شایان شان نہیں قرار دیا جا سکتا ۔
مولوی محمد اکرم :۔ خاں صاحب! آپ بالکل ٹھیک فرماتے ہیں ۔
مولانا اسمٰعیل :۔ لیکن ہمارے لئے ان دونوں کے علاوہ اور چارۂ کار ہی کیا ہے ۔؟
عجب خاں :۔ بے شک ان لوگوں سے جنگ کیجئے، جو بدعہدی اور غدّاری پر مائل ہیں جو شکست بیعت کر رہے ہیں، جو گو بظاہر ہمارے ساتھ ہیں لیکن درپردہ دشمنوں سے ملے ہوئے ہیں
مولانا اسمٰعیل :۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

عجب خاں:۔ کیوں نہیں ہو سکتا مولانا؟

حضرت سید صاحب:۔ کیا آپ کا مشورہ یہ ہے کہ ہم مسلمانوں سے لڑیں؟

عجب خاں:۔ بے شک ——————— وہ مسلمان اس قابل ہیں کہ ان سے لڑا جائے۔ جو بدعہد ہیں، غدار ہیں، دشمنوں کے معاون اور مددگار ہیں۔

حضرت سید صاحب:۔ نہیں خاں صاحب! ہم یہاں اس لئے آئے تھے کہ سکھوں سے لڑیں گے ہندوؤں کا مقابلہ کریں گے۔ ضرورت ہوئی، موقع ملا اور حالات سازگار ہوئے۔ تو انگریزوں سے برسرِ پیکار ہوں گے۔ ہر اس قوم سے معرکہ آرا ہوں گے۔ جو مسلمانوں کو غلام رکھنا چاہتی ہے۔ اسلام کی سربلندی کے راستہ میں مانع ہے دینِ حق کی دشمن ہے ———————

عجب خاں:۔ بے شک، بے شک۔

حضرت سید صاحب:۔ لیکن ہم اس لئے نہیں آئے تھے کہ مسلمانوں کا خون بہائیں۔

مولانا اسمٰعیل:۔ وہ خود اگر غلامی کی زندگی کو آزادی کی زندگی پر ترجیح دیتے ہیں، تو ہم انہیں کس طرح مجبور کر سکتے ہیں؟ انہیں اگر اسلامی حکومت کے بجائے کافروں کی حکومت مرغوب ہے تو کیوں کر انہیں روکا جا سکتا ہے؟ وہ اگر زکواۃ اور عشر دینا پسند نہیں کرتے، دشمن کو خراج دینا اور اس کے سامنے سرنگوں ہونا پسند کرتے ہیں تو کون انہیں روک سکتا ہے؟

حضرت سید صاحب:۔ ہم ہرگز یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ ہماری تلوار مسلمانوں کا خون بہائے

عجب خاں:۔ پھر ——————— یا حضرت! پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟

حضرت سید صاحب:۔ یہی کہ ہم یہاں سے ترکِ اقامت کریں گے؟

عجب خاں:۔ کہاں تشریف لے جانے کا قصد ہے؟

حضرت سید صاحب:۔ یہ کہنا ابھی قبل از وقت ہے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہاں جائیں گے؟

باب ۵۴

زلیخا اور فاطمہ

زلیخا امرت کور، کی محبت نے حبیب خاں کو فرض سے غافل نہیں کر دیا تھا، وہ اسے دل وجان سے چاہتا تھا، اس سے بے تابانہ محبت کرتا تھا، پروانہ وار اس پر قربان ہوتا تھا، لیکن فرض کا سوال جب سامنے آجاتا تھا، تو پھر وہ زلیخا کو اسکے عشق ومحبت کو، ہر چیز کو فراموش کر دیتا تھا اور خود زلیخا بھی اسلام قبول کرنیکے بعد سے حمیتِ اسلامی کا پیکر بن گئی تھی، وہ اس کی جدائی کا غم خوشی سے سہتی تھی، وہ دردِ فرقت میں بھی ایک لذت محسوس کرتی تھی، وہ اختر شماری میں راتیں کاٹ دیتی تھی لیکن اسکا دل اس فخر سے معمور رہتا تھا کہ وہ ایک مجاہد کی رفیقۂ حیات ہے، وہ اپنے آپ پر رشک کرنے لگتی تھی کہ ایک غازی اس کا سرتاج ہے، وہ اپنی ہمجولیوں اور سہیلیوں میں فخر وانبساط کے جذبہ کے ساتھ حبیب خاں کا ذکر کرتی تھی اور یہ ذکر جب اس کی زبان پر آتا تھا تو اس کی آنکھوں کی چمک لازوال محبت کے ترانے گانے لگتی تھی۔

اب وہ کچھ عرصہ بعد ایک بچہ کی ماں بننے والی تھی، جب وہ ایک ننھے سے بچے کا، اور پھر آگے چل کر اس کی معصوم اور دلآویز شرارتوں کا تصور کرتی تھی تو خود بخود اس کے دلفریب ہونٹوں پر جاں نواز تبسم کھیلنے لگتا تھا، اس بچہ کے بارے میں وہ نہ جانے کیا کیا سوچا کرتی، اور دل ہی دل میں خوش ہوا کرتی تھی۔

دوپہر کا وقت تھا، زلیخا اپنے کمرہ میں بیٹھی کچھ سی رہی تھی کہ فاطمہ آگئی۔ یہ پڑوس کے ایک شریف خاندان کی بہو تھی، ابھی حال ہی میں اس کی شادی ہوئی تھی اس خاندان سے اور حبیب خاں کے خاندان سے دوستی بھی تھی، اور قرابت داری بھی، فاطمہ کا شوہر گلباز خاں

کدھر جائیں گے؟ ــــــــــــ بہرحال جو کام یہاں کر رہے تھے۔ وہ کہیں اور کریں گے، یہ تحریک، یہ کام، یہ مقصد کسی خاص خطّہ سے وابستہ نہیں ہے یہ حق کی دعوت ہے، جو لبیک کہے گا، وہ ہمارا ساتھی ہے، جو انحراف کرے گا اسے سلام کرکے آگے بڑھ جائیں گے ــــــــــــ!

عجیب خاں:۔ (روتے ہوئے) اگر آپ نے یہ فیصلہ کر ہی لیا ہے کہ یہاں سے جائیں گے یہاں نہیں رہیں گے، تو غلام کی ایک عرض ضرور مان لیجئے۔

حضرت سید صاحب:۔ کہیے خاں صاحب! آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟

عجیب خاں:۔ یہ کہ غلام آپ کے ساتھ رہے گا، جہاں آپ جائیں گے، وہاں وہ بھی جائیگا۔

حضرت سیّد صاحب:۔ آپ ہمارے بہترین اور قابلِ اعتماد رفیقوں میں ہیں۔ اگر آپ ہمارے ساتھ رہیں گے، تو یہ بات ہمارے لئے باعثِ مسرّت ہوگی۔

عجیب خاں کا چہرہ گلِ تر کی طرح کھل گیا۔

رشتہ میں حبیب خاں کا بھائی ہوتا تھا۔ یہ پشاور کے سردار یار محمد خاں کے لشکر میں ملازم تھا بڑا بہادر اور رجیلا نوجوان تھا۔ حبیب خاں اور گلباز خاں آپس میں بڑے گہرے دوست تھے یہ دوسری بات تھی کہ حبیب خاں نے اپنی زندگی اسلام کی سربلندیوں کے لئے وقف کر دی تھی اور گلباز خاں ایک بڑے خان کے دربار میں ایک وجاہت اور شان کے تحفظ کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔

گلباز خاں اور حبیب خاں کی دوستی، فاطمہ اور زلیخا کے تعلقات پر بھی اثر انداز ہوئی اور بہت جلد یہ دونوں ماں جائی بہنوں سے زیادہ ایک دوسرے سے محبت کرنے لگیں۔

فاطمہ نے زلیخا کے ہاتھ سے کپڑا چھین لیا،

"ہر وقت کام ———— کسی وقت تو نچلی بیٹھا کرو۔"

زلیخا مسکرانے لگی، فاطمہ نے شکایت آمیز لہجہ میں کہا۔

"بس تمہاری یہی بات تو ہمیں بری لگتی ہے۔"

زلیخا:۔ تو بہ، تم نے تو ناک میں دم کر دیا ہے، کام کروں تو خفا، خوش ہو کر تمہارا استقبال کروں تو جرم، پھر آخر کروں کیا؟

فاطمہ:۔ ہم سے باتیں کرو۔

زلیخا:۔ آؤ بیٹھو ———— تم تو اس طرح کھڑی گھور رہی ہو، جیسے اب حملہ کیا ہی چاہتی ہو۔

فاطمہ:۔ (پاس آکر بیٹھتے ہوئے) باتیں بنانے کا فن تو تم سے کوئی سیکھ لے؟

زلیخا:۔ تو سیکھ لو، بڑے شوق اور چاؤ سے سکھا دوں گی۔

فاطمہ:۔ شکریہ ———— معاف کیجئے مجھے، کیا کروں گی سیکھ کر؟

زلیخا:۔ کام آئے گا!

فاطمہ:۔ آچکا ——— بس بخشو۔

زلیخا:۔ سچ کہتی ہوں ——— گلباز خاں تمہارا کلمہ پڑھنے لگے گا۔

فاطمہ:۔ وہ اب بھی پڑھتے ہیں۔

زلیخا:۔ پاؤں دھو دھو کر پیئے گا۔

فاطمہ:۔ انہیں اس کے سوا اور آتا کیا ہے

زلیخا:۔ کلمہ پڑھنے لگے گا تمہارا۔

فاطمہ:۔ ساس اور نندیں اسی کا تو مجھے طعنہ دیتی ہیں۔

زلیخا:۔ تمہیں دیکھ دیکھ کر جیئے گا۔

فاطمہ:۔ جب آتے ہیں یہی کہتے ہیں، جب جاتے ہیں، یہی فرماتے ہوئے جاتے ہیں۔

زلیخا:۔ تو مطلب یہ کہ تمہیں سب کچھ آتا ہے، کچھ سیکھنے کی ضرورت نہیں؟

فاطمہ:۔ مجھے تو کچھ بھی نہیں آتا۔

زلیخا:۔ پھر گلباز خاں بندۂ بے دام کیسے بن گیا؟

فاطمہ:۔ اسے خدائی دین سمجھ لو اور کیا؟

زلیخا:۔ حد ہوگئی بھئی! تم سے بڑھ کر باتیں بنانا اور کسے آتی ہوں گی؟ تم تو استاد نکلیں۔

فاطمہ:۔ تو پھر شاگرد بن جاؤ۔

زلیخا:۔ (کان پکڑ کر) ہاں بھئی بن گئی، واقعی بیچارہ گلباز خاں تمہارے سامنے آکر گم صم ہو جاتا ہوگا، تم نے اس وقت میری سٹی بھی گم کر دی۔

فاطمہ:۔ بار بار ان کا نام کیوں لئے جا رہی ہو، حبیب خاں کو بھی تو یاد کرو۔

زلیخا:۔ ٹھنڈی سانس لے کر، ان کی یاد تو جی کے ساتھ ہے۔

فاطمہ:۔ کیوں زلیخا! سچ کہنا بہت چاہتی ہو اسے؟

زلیخا:۔ ہاں بہت زیادہ، جان و دل سے زیادہ۔

فاطمہ :۔ آخر کیوں ——————؟

زلیخا :۔ (مسکرا کر) کچھ پاگل ہوگئی ہو؟ دماغ چل گیا ہے؟ یہ بھی کوئی سوال ہوا؟
تم کیوں گلباز خاں کو چاہتی ہو؟

فاطمہ :۔ میں تو نہیں چاہتی، وہی چاہتے ہیں،

زلیخا :۔ چل جھوٹی کہیں کی۔

فاطمہ :۔ سچ ——————میں جانتی ہی نہیں چاہت کیا ہوتی ہے اور محبت کسے
کہتے ہیں۔

زلیخا :۔ آہا، بڑی بھولی، بڑی معصوم، کیا کہنا ہے ان کا۔

فاطمہ :۔ تو تمہارے نزدیک میں جھوٹ بول رہی ہوں؟

زلیخا :۔ اوّل سے آخر تک جھوٹ، سراسر جھوٹ!

فاطمہ :۔ (ہنس کر روٹھتے ہوئے) اچھا ہم جھوٹے سہی، تم تو بڑی سچی ہو،

زلیخا :۔ اور کیا نہیں، تم نے جو کچھ پوچھا، سچ سچ بتا دیا۔

فاطمہ :۔ اچھا ایک بات تو بتاؤ، دیکھو سچ سچ بتانا۔

زلیخا :۔ پوچھ کے تو دیکھو،

فاطمہ :۔ اگر واقعی حبیب خاں کو آنا ہی چاہتی ہو تو پھر اسے تم نے سیّد بادشاہ کی جماعت میں
کیوں شریک ہونے دیا؟

زلیخا :۔ اس سے کیا ہوتا ہے ——————کیا میری محبت انہیں مذہب سے برگشتہ
کر سکتی ہے؟

فاطمہ :۔ آدمی جو کام کرتا ہے، اونچ نیچ دیکھ کر کرتا ہے۔

زلیخا :۔ وہ تو میں بھی جانتی ہوں، لیکن مجھے معلوم نہیں اس میں اونچ نیچ کی کیا بات ہے۔

فاطمہ :۔ کیوں نہیں ہے، جان جوکھم کے کام میں آدمی کو سوچ سمجھ کر ہی ہاتھ ڈالنا چاہیئے۔

زلیخا: میں سمجھی نہیں، تم کیا کہنا چاہتی ہو؟

فاطمہ:۔ حبیب خاں سیّد بادشاہ کی جماعت میں شریک ہے یا نہیں؟

زلیخا: ہاں ہیں ——— تو؟

فاطمہ: یہ جان جوکھوں کا کام نہیں ہوا؟ ——— سکھ الگ دشمن، اور اپنی قوم والے الگ خار کھائے ہوئے، کیا اس سے بڑھ کر بھی خطرناک زندگی ہو سکتی ہے کوئی؟

زلیخا:۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ سکھ دشمن ہیں، ہو سکتا ہے کہ ہندو بھی دشمنی پر اتر آئیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انگریز خون کے پیاسے ہو جائیں۔ لیکن اپنی قوم والے بھی خار کھائے بیٹھے ہیں۔ اسے کون مان سکتا ہے۔؟

فاطمہ:۔ بہن سچ ——— واقعی یہی بات ہے۔

زلیخا:۔ میں نہیں مان سکتی۔

فاطمہ:۔ نہیں مانتیں تو ایک دن سر پر ہاتھ رکھ کر روؤگی اور روتے نہیں بن پڑے گی۔۔

زلیخا:۔ خدا نہ کرے، تم ایسی بات کہتی ہو؟

فاطمہ:۔ یہی کہنے تو آئی ہوں، کیسے نہ کہوں؟

زلیخا:۔ یعنی گھر سے یہ فیصلہ کر کے چلی ہو کہ ایسی بدشگونی کی بات کہو گی مجھ سے؟

فاطمہ! تم بھی شوہر والی ہو، اور میری دعا ہے کہ گلباز خاں ہمیشہ زندہ رہے لیکن ایک بیوی کے اپنے شوہر کے لئے کیسے جذبات ہوتے ہیں، اس کا اندازہ تمہیں ہونا چاہیے

فاطمہ:۔ اسی احساس نے یہ الفاظ میرے منہ سے نکلوائے ہیں، ورنہ میرا کیا تھا خاموش رہتی۔ چاہے کوئی مرے یا جیے۔

زلیخا:۔ تم نے میرے سینے میں گھونسہ مارا (بھرائی ہوئی آواز میں باچشم پُرنم) مجھے تم سے یہ امید نہ تھی، تم نہ صرف گلباز خاں کی بیوی ہو، جو میرے شوہر کا بھائی ہوتا ہے بلکہ میری دوست

سہیلی، رازدار، غمگسار بھی ہو ——— کیا تمہیں ایسے الفاظ مجھ سے کہنا چاہیئے تھے ———؟

فاطمہ:۔ ہائے اللہ! کس طرح سمجھاؤں؟ یہ جو کچھ کہہ رہی ہوں دوستی ہی میں تو کہہ رہی ہوں ورنہ مجھے کسی کے پھٹے میں ٹانگ اڑانے کی کیا ضرورت تھی بہن!

اتنے میں گھر کی کچھ اور عورتیں آگئیں، اور دوسری قسم کی باتیں شروع ہوگئیں۔

باب ۵۵

پھر وہی باتیں

زلیخا کو ان عورتوں سے اور ان کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ چاہتی تھی یہ ٹلیں تو وہ فاطمہ سے پوچھے ان عجیب وغریب باتوں کا مقصد کیا ہے۔؟

فاطمہ کی باتیں سن کر اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا، وہ سوچنے لگی تھی کہیں خدانخواستہ حبیب خاں کسی خطرہ میں تو نہیں گھر گیا ہے۔؟ اور خیال آتے ہی اس کا کلیجہ منہ کو آنے لگتا تھا۔

آخر بڑی مشکل سے یہ عورتیں واپس گئیں، زلیخا اور فاطمہ میں پھر گفتگو شروع ہوگئی۔ زلیخا نے کہا "تمہاری گفتگو سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے خدانخواستہ وہ کسی خطرہ میں گرفتار ہیں"

فاطمہ نے جواب دیا۔

"ہاں یہی بات تو ہے، یہی بتانے تو میں تمہیں آئی تھی"

زلیخا:۔ تو پھر پوری بات بتادیں چبا چبا کر باتیں کرنے سے کیا فائدہ ــــــــ؟

فاطمہ:۔ بات یہ ہے کہ اب لڑائی سکھوں کے بجائے آپس میں ہوگی۔

زلیخا:۔ (سہم کر) آپس میں لڑائی ہوگی، یہ کیا کہہ رہی ہو فاطمہ؟

فاطمہ:۔ میں جھوٹ نہیں کہتی،

زلیخا:۔ تو آپس میں کون لڑے گا ــــــــــــــ یہ بھی تو سوچو!

فاطمہ:۔ سید بادشاہ کے آدمی اور خانوں کے آدمی،

زلیخا:۔ سید بادشاہ تو کافروں سے جہاد کرنے نکلے ہیں، وہ مسلمانوں سے کیوں لڑنے لگے؟

فاطمہ:۔ بات یہ ہے کہ یہاں کے مسلمان ان کی حکومت نہیں چاہتے۔

زلیخا:۔ یہ تو نہ کہو، میں جانتی ہوں مسلمان ان سے کتنی عقیدت رکھتے ہیں۔

فاطمہ:۔ ہاں، مسلمان تو ان سے عقیدت رکھتے ہیں، لیکن ہمارے خان اور سرداران کی
حکومت کو پسند نہیں کرتے۔

زلیخا:۔ کوئی وجہ بھی تو ہوگی پسند نہ کرنے کی؟

فاطمہ:۔ بھئی! میں زیادہ باتیں نہیں جانتی، اتنا جانتی ہوں کہ خادے خاں کا انتقام لینے کے لئے
سردار یار محمد خاں تل گئے ہیں، وہ ضرور بدلہ لے کر رہیں گے۔

زلیخا:۔ خادے خاں کا انتقام؟

فاطمہ:۔ ہاں اسی کا۔

زلیخا:۔ وہی خادے خاں جو سکھوں کو مسلمانوں پر چڑھا لایا تھا، جس نے دوست بن کر دشمنی
کی تھی، جو سید بادشاہ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے بعد دشمن سے جا ملا تھا؟ جسے
راہِ راست پہ لانے کی سید بادشاہ نے بڑی کوشش کی تھی؟ اور جس نے مجاہدوں
پر زندگی تنگ کر دی تھی ——————؟
مجاہد سکھوں کے علاقہ سے صحیح سلامت آجاتے تھے، مگر خادے خاں کے علاقہ میں
پہنچ کر ستائے جاتے تھے۔ وہی خادے خاں نا؟

فاطمہ:۔ ہاں وہی۔

زلیخا:۔ یار محمد اس کا انتقام لینا چاہتا ہے؟

فاطمہ:۔ ہاں اسی کا —————— ساری تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔

زلیخا:۔ تمہیں کیسے معلوم؟

فاطمہ:۔ میں سب کچھ جانتی ہوں، مجھے وہ سب کچھ بتا دیتے ہیں، کل رات آئے تھے اور
آج صبح چلے گئے۔

زلیخا:۔ گل باز خاں؟

فاطمہ:۔ (شرماکر) ہاں اور کون؟

زلیخا:۔ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے اب ———— ؟

فاطمہ:۔ ہاں ———— جب سے یہ باتیں میں نے سنی ہیں، کسی پہلو قرار نہیں، بیتاب تھی کہ جاکر تمہیں سارا ماجرا بتا دوں، اور تم حبیب خاں کو واپس بلالو۔

زلیخا:۔ تمہاری اس محبت کا بہت بہت شکریہ۔

فاطمہ:۔ خالی شکریہ سے کیا ہوتا ہے، حبیب خاں کو واپس بلاؤ۔

زلیخا:۔ یہ نہیں ہو سکتا

فاطمہ:۔ کچھ دیوانی ہوتی ہو

زلیخا:۔ سو سمجھو ———— نہ وہ واپس آ سکتے ہیں، نہ میں بلا سکتی ہوں نہ انہیں واپس آنا چاہیے نہ مجھے بلانا چاہیے۔

فاطمہ:۔ یہ کیسی باتیں کر رہی ہو زلیخا ———— ؟

زلیخا:۔ یہ باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتیں،

فاطمہ:۔ بڑی آئیں افلاطون بن کر ———— خدا کے لئے عقل کے ناخن لو، سمجھ کی باتیں کرو۔

زلیخا:۔ تمہاری ہمدردی کا شکریہ ادا کر چکی، آگے میں جانوں میرا کام!

فاطمہ:۔ ہائے یہ اندھیر ———— تم نہیں جانتیں یار محمد کی تیاریاں کتنی زبردست ہیں اس کے ساتھ بہت سے لوگ ہیں، اور بھی کئی خانوں نے اس کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا ہے، سکھوں کی پشت پناہی بھی اسے حاصل ہے، سید بادشاہ اس سے نہیں جیت سکتے، ہرگز نہیں جیت سکتے۔

زلیخا:۔ سید بادشاہ کسی سے نہیں ہار سکتے، انھیں کوئی شکست نہیں دے سکتا۔

فاطمہ:۔ سید بادشاہ کا ذکر چھوڑو، حبیب خاں کی فکر کرو۔ اس کی جان بچالو۔

زلیخا:۔ ان کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی فخر نہیں ہو سکتا کہ وہ خدا کے راستہ میں سر دے دیں۔!

فاطمہ:۔ ہائے یہ کیا کہہ رہی ہو زلیخا ؟

زلیخا:۔ یہ میرا دل کہہ رہا ہے، جو ایک مسلمان کو کہنا چاہیئے۔

فاطمہ:۔ اپنے ہاتھوں اپنا سہاگ اجاڑ لوگی ؟

زلیخا:۔ اگر خدا کی مرضی یہی ہے تو ضرور پوری ہوگی۔

فاطمہ:۔ تمہاری جگہ میں ہوتی تو دیوانی ہو جاتی، تم کتنے اطمینان سے باتیں کر رہی ہو۔

زلیخا:۔ اگر وہ بیمار ہوتے، تو مجھے فکر ہوتی کہ وہ اچھے ہو جائیں، کسی دشمن کے نرغہ میں ہوتے تو خود تلوار لے کر ان کی مدد کو پہنچتی۔ لیکن اگر خدا کے راستہ میں شہادت حاصل کرنے کے لیے وہ اپنا سر کٹانے پر آمادہ ہوں۔ تو میں انہیں کسی طرح نہیں روک سکتی، بلکہ مسکراتی ہوئی میدانِ جہاد کی طرف رخصت کروں گی۔

فاطمہ:۔ یہ میں کیا سن رہی ہوں ؟

زلیخا:۔ ایک سچی بات۔

فاطمہ:۔ کیا ایک بیوی اپنے شوہر کی موت چاہ سکتی ہے ؟

زلیخا:۔ کیوں نہیں ؟ —— کربلا کے میدان میں کیا ہوا تھا؟

فاطمہ:۔ وہ اور بات تھی۔

زلیخا:۔ ہم بھی انہی بزرگوں کے غلام ہیں ان کے نقشِ قدم پر چلنا ہمارے لئے باعثِ فخر ہے

فاطمہ:۔ واہ رے فخر —————— معلوم ہوگیا۔ تم حبیب خاں سے کتنی محبت کرتی ہو

زلیخا:۔ یہ تم سے زیادہ انہیں معلوم ہے۔

فاطمہ:۔ اگر اپنی بیوگی کا، اور حبیب خاں کی جوانا مرگی کا خیال نہیں تو اس ننھی سی جان کا خیال کرو جو تمہارے پیٹ میں کروٹیں لے رہی ہے۔ ؟ وہ بے گناہ بچہ یتیم پیدا ہوگا اور دنیا اسے ٹھکرائے گی۔

زلیخا:۔ نہیں، دنیا اس کے قدموں کے نیچے ہوگی، اپنے باپ کی طرح وہ بھی مجاہد بنے گا خدا کے راستہ میں جہاد کرے گا اور خدا کے دین کی سربلندی کے لئے جامِ شہادت مردانہ وار نوش کرے گا۔

فاطمہ:۔ ابھی وہ پیدا نہیں ہوا۔لیکن اس کی جان کی گاہک بھی بن گئیں
ایسی بیوی اور ایسی ماں میں نے آج تک نہیں دیکھی۔

زلیخا:۔ کیا تم مجھ سے لڑنے آئی ہو؟

فاطمہ:۔ لڑنے نہیں سمجھانے ——— اب بھی وقت ہے، موقع ہے، اس سے
فائدہ اٹھاؤ، ورنہ پھر کچھ کرتے دھرتے نہیں بن پڑے گا، وہی ہوگا، جو خدا کو منظور ہوگا

زلیخا۔ :۔ نہیں فاطمہ اس معاملہ میں میں کچھ نہیں کرسکتی، وہی ہوگا، جو خدا کو منظور ہوگا ؟

فاطمہ:۔ کیا اگر تم حبیب کو واپس بلاؤ تو وہ آ نہیں پائے گا!

زلیخا:۔ تم نہیں جانتیں، وہ مجھ سے نفرت کرنے لگیں گے۔

فاطمہ:۔ تو کیا ہوا! ان کی نفرت سے ایک جان تو بچ جائے گی۔

زلیخا:۔ لیکن اس طرح ان کی جان بچانا میں بھی نہیں چاہتی۔

فاطمہ:۔ یہ تم کہہ رہی ہو ——— ؟ حبیب کی بیوی کہہ رہی ہے؟

زلیخا:۔ دیکھ تو رہی ہو۔

فاطمہ:۔ تمہارا دل ہے یا پتھر؟

زلیخا:۔ نہیں فاطمہ! کسی کے سینہ میں بھی پتھر کا دل نہیں ہوتا، اور ایک عورت کے اور خاص
طور پر ایک بیوی کے سینہ میں تو پتھر کا دل ہو ہی نہیں سکتا ———!

فاطمہ:۔ اسی لئے تو مجھے حیرت ہے۔

زلیخا:۔ لیکن میں یہ سوچتی ہوں، اگر میں انہیں بچالوں اور وہ میرا کہنا مان لیں، اور جہاد سے
کنارہ کش ہو جائیں، تو کے دن زندہ رہیں گے؟

فاطمہ:۔ بہت دن، ابھی تو وہ جوان ہیں، کوئی یہ مرنے کا زمانہ ہے؟

زلیخا:۔ لیکن جوان بھی مرتے رہتے ہیں، اور انہیں کوئی نہیں روک پاتا، اور فرض کرو
وہ بوڑھے ہوکر مریں، لیکن مریں گے تو؟

فاطمہ:۔ ہاں موت سے کون بچ سکتا ہے، مرنا تو ایک دن سب ہی کو ہے۔

زلیخا:۔ پھر مرنے کے بعد کیا ہوگا؟

فاطمہ:۔ جیسے آدمی کے اعمال ہوں گے، ویسا ہی اس کا حشر ہوگا۔

زلیخا:۔ ٹھیک کہتی ہو ـــــــ خدا جب ان سے پوچھے گا کہ تم نے میرے دین کی حمایت اور نصرت کے مقابلہ میں اپنی جان کیوں عزیز رکھی۔ تو وہ کیا جواب دیں گے؟ ـــــــ خدا اس حرکت پر خوش ہوگا یا ناخوش، سزا دے گا یا انعام ـــــــ کیوں فاطمہ بتاؤ۔

فاطمہ:۔ (کچھ سوچتے ہوئے) میری سمجھ میں تو نہیں آتا۔

زلیخا:۔ میں بتاتی ہوں ـــــــ خدا کے سامنے جب وہ لوگ پیش ہوں گے جنہوں نے اس کی راہ میں اپنی جان قربان کردی، وہ جنّت میں جائیں گے۔ خدا ان سے خوش ہوگا اور جنہوں نے خدا کے نیک بندوں سے جنگ کی، خدا کے دین کی حمایت سے انکار کیا، خدا کے دشمنوں کا ساتھ دیا، اور اپنی جان بچانے کے لئے کافروں اور مشرکوں کے آگے سر جھکایا۔ وہ جہنم میں جائیں گے۔ اور خدا ان سے ناخوش ہوگا۔

فاطمہ:۔ (سہم کر) بات تو ٹھیک کہتی ہو۔

زلیخا:۔ کیا واقعی تمہارا خیال یہی ہے کہ میں سچ کہہ رہی ہوں؟

فاطمہ:۔ ہاں، اس میں جھوٹ کیا ہے ـــــــ جنّت اسے ملے گی جو خدا کا بن جائے۔ جو خدا کے دشمنوں کا ہو رہے اسے جنّت مانگنے یا جنّت کی امید رکھنے کا حق ہی کیا ہے۔

زلیخا:۔ تو میری بہن! پھر ایک کام کرو۔

فاطمہ:۔ کہو ـــــــ میں تو ہمیشہ تمہاری بات مانتی ہوں۔

زلیخا:۔ خدا سے دعا کرو کہ وہ مجھے توفیق دے کہ اگر وہ مرتبۂ شہادت پر فائز ہو جائیں تو

میں حوصلہ کے ساتھ اس حادثہ کو برداشت کرلوں۔ یہ دعا بھی کرو کہ وہ دلیری اور ہمت کے ساتھ خدا کے دین پر اپنی جان نثار کریں، یہ بھی دعا کرو کہ میرے پیٹ سے بچہ پیدا ہو، بڑا ہو اور وہ بھی پکا اور سچا مجاہد بنے اور خدا کے راستہ میں اپنی زندگی قربان کر دے ——————۔

یہ کہتے کہتے زلیخا کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے، فاطمہ اس سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ زلیخا نے اپنے آنسو پونچھ لئے اور استقلال کے ساتھ کہا "نہیں بہن! رونے کی ضرورت نہیں، نیک کام رو رو کر نہیں کئے جاتے، ہنس ہنس کر اور مسکرا مسکرا کر انجام دیئے جاتے ہیں، دیکھو میں مسکرا رہی ہوں"

فاطمہ نے اس سے گلوگیر آواز میں کہا۔

"تم کتنی اچھی ہو"

زلیخا:۔ تو پھر میری سی بن کیوں نہیں جاتیں؟

فاطمہ:۔ کاش خدا مجھے یہ شرف عطا کرے۔

زلیخا:۔ ناؤمت —————— لیکن اگر میری باتیں تمہیں ٹھیک معلوم ہوتی ہیں تو اپنا طرز عمل بدل لو۔

فاطمہ:۔ کیا کروں؟

زلیخا:۔ گلباز خاں کو سمجھاؤ کہ وہ خدا کے دشمنوں کا ساتھ نہ دے۔

فاطمہ:۔ وہ کسی کے سمجھانے سے نہیں سمجھ سکتے۔

زلیخا:۔ تمہارے الفاظ بھی ان پر اثر نہیں کریں گے؟

فاطمہ:۔ نہیں، وہ اپنے آقا کا دم بھرتے ہیں، اس کی تابعداری پر فخر کرتے ہیں، وہ سب کچھ کر سکتے ہیں، لیکن یار محمد خاں کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے۔

زلیخا:۔ یار محمد گلباز خاں کو کیا تنخواہ دیتا ہے؟

فاطمہ:۔ میں نہیں جانتی، شاید پچاس روپیہ مہینہ دیتے ہیں۔

زلیخا:۔ اور ———— اس کے علاوہ کیا دیتا ہے ؟

فاطمہ:۔ انعام واکرام بھی دیتے ہیں کبھی کبھی۔

زلیخا:۔ بس یا کچھ اور بھی ؟

فاطمہ:۔ بس اس سے زیادہ اور کیا دیں گے ؟

زلیخا:۔ وہ حکومت نہیں دے سکتا اس ملک کی ؟

فاطمہ:۔ توبہ کرو۔ حکومت کیا دے گا، یہ اس کے بس میں کہاں

زلیخا:۔ وہ اگر گلباز خاں سے خفا ہو جائے۔ تو نکال دے گا دو چار کوڑے مارے گا۔

فاطمہ:۔ ہاں اور کیا ؟

زلیخا:۔ لیکن جہنم میں تو نہیں ڈال سکتا اسے ؟

فاطمہ:۔ جہنم سے پہلے خود تو بچ لے۔

زلیخا:۔ اور اگر بہت زیادہ خوش ہو تو جنّت بھی نہیں دے سکتا۔

فاطمہ:۔ کیسی پاگلوں کی سی باتیں کر رہی ہو۔ جنت دینے کا اسے کیا حق ہے ؟

زلیخا:۔ میں کہہ رہی تھی کہ گلباز خاں، ایک اپنے ہی جیسے آدمی کا نوکر ہے، جو اسے مار نہیں سکتا، جلا نہیں سکتا۔ جہنم نہیں دے سکتا، جنت نہیں دے سکتا۔ لیکن اس کی وفاداری پر قائم ہے۔ پھر اگر میرا شوہر اس کی وفاداری پر قائم ہے۔ جو مار بھی سکتا ہے اور جلا بھی سکتا ہے، جس کے قبضہ میں جنت بھی ہے اور جہنم بھی، جو ساری دنیا کا مالک ہے۔ جسے چاہے بادشاہ بنا دے، جسے چاہے فقیر کر دے، جس فقیر کو چاہے دولت کونین بخش دے اور جس شہریار سے چاہے تاج خسروی چھین لے، تو تم چاہتی ہو کہ وہ اس کی وفاداری سے منحرف ہو جائے ؟

فاطمہ:۔ (کانپ کر) نہیں میں یہ نہیں چاہتی۔

زلیخا:۔ شاباش اور ایسا کبھی چاہنا بھی نہیں۔

فاطمہ:۔ (سہمے ہوئے انداز میں) انہیں کبھی نہیں چاہوں گی۔

زلیخا:۔ بلکہ کوشش اس کی کرو کہ گلباز خاں راہِ راست پر آجائے۔ وہ یارمحمد کا ساتھ چھوڑ دے اور محمدؐ کے دین کے لئے اپنی جان وقف کر دے۔ محمد کے خدا کے دشمنوں سے لڑے اور اس وقت تک لڑے جب تک اس کی رگوں میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی ہے۔

فاطمہ:۔ (اثر انگیز لہجہ میں) میں کوشش کروں گی۔ دعا کرو، خدا میرے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اثر دے اور وہ میرا کہنا مان جائیں۔

باب ۵۶

بے کلی

فاطمہ کے چلے جانے کے بعد زلیخا کا دن بڑی بے کلی سے گزرا۔ یقیناً وہ پوری سچائی کے ساتھ اس پر تیار تھی کہ اگر حبیب اللہ خاں خدا کے راستہ میں کام آ جاتا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں اس کا اسلام رسمی اسلام نہیں تھا وہ صدق دل سے مسلمان ہوئی تھی اور اسلام کی خوبیاں اس کے دل میں بس گئی تھیں اس نے جب یہ کہا تھا کہ اس کا ہونے والا بچہ بھی بڑا ہو کر اگر اسلام پر قربان ہو جائے تو وہ خوش ہوگی اور یہ جھوٹ نہیں کہا تھا، اگر موقع ہوتا اور ضرورت پیش آتی تو وہ خود بھی تیر و تفنگ اور نیزہ و شمشیر لے کر میدانِ جنگ میں لڑتی ہوئی اپنی جان دے سکتی تھی۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود دل قابو میں نہیں آتا تھا۔ یہ خیال کہ حبیب خاں خطرہ میں گھرا ہوا ہے، اسے بے چین کئے دیتا تھا۔ وہ چاہتی تھی اُڑ کر اپنے عاشق اور شوہر کے پاس پہنچے، اور کم از کم اسے خطرہ سے آگاہ تو کر دے، زندگی اور موت خدا کے ہاتھ ہے۔ لیکن احتیاط اور دُور اندیشی تو خود انسان کے اپنے ہاتھ میں ہے، اور پھر سوال صرف حبیب خاں کا نہیں تھا پوری جماعت کا تھا۔ خود سیّد بادشاہ خطرہ میں تھے۔ مولانا اسمٰعیل خطرہ میں تھے۔ مجاہدین کی پوری جماعت خطرہ میں تھی، اور خدانخواستہ سیّد بادشاہ کسی حادثہ سے دوچار ہوئے یا جماعت مجاہدین فنا کے گھاٹ اتر گئی، تو پھر اس سرزمین پر غیر مسلموں کی حکومت ایک طویل اور نامعلوم مدّت کے لئے مستقل ہو جائے گی، مسلمان، غلامی اور محکومی کی زندگی بسر کرتے رہیں گے۔ اسلامی اقتدار پامال ہوتے رہیں گے اور کوئی کچھ نہ کر سکے گا۔

سارا دن وہ یہی سوچتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا اس خطرہ کو کس طرح ٹالے

اس مصیبت کا مداوا کس طرح کرے ــــــــــ؟ وقت گزرتا جا رہا تھا، اور وقت کے ساتھ ساتھ زلیخا کی طبیعت بگڑتی چلی جا رہی تھی، یہاں تک کہ وہ شدید بخار میں مبتلا ہو گئی اس نے اپنی کیفیت کو گھر میں کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا، لیکن دل تھا کہ تہ و بالا ہوا جا رہا تھا، طبیعت تھی کہ اُنڈی چلی آ رہی تھی۔

رات ہو گئی۔

چراغ جل گئے اور وہ اپنے بستر پر پڑ گئی، کھانے کو بار بار پوچھا گیا، اصرار کیا گیا، لیکن اس سے ایک لقمہ بھی نہ کھایا جا سکا۔

اور تقریباً یہی کیفیت فاطمہ کی بھی تھی۔

وہ جب سے زلیخا کے پاس سے واپس گئی تھی، اسی اودھیڑ بن میں تھی کہ کیا کرے؟ نماز بخشوانے گئی تھی اُلٹے روزے گلے پڑے۔ حبیب خاں کی جان بچا لینے کا پیام لے کر زلیخا کے پاس پہنچی تھی۔ لیکن وہاں جا کر معلوم ہوا اس سے کہیں زیادہ گلباز خاں خطرہ میں ہے اب تک جن باتوں پر اس نے کبھی غور نہیں کیا تھا۔ اب تک جن باتوں کو وہ ذرا بھی اہمیت نہیں دیتی تھی۔ اب وہی باتیں اسے سب سے زیادہ اہم اور نتیجہ خیز نظر آ رہی تھیں اب تک زندگی کا مصرف اس کے نزدیک صرف یہ تھا کہ انسان کھائے پیئے، مزے کرے اور جب موت آ جائے مر جائے۔ لیکن اب اسے معلوم ہوا کہ ــــــــــ اس طرح جینا زندگی کو غارت کرنا ہے، اصل زندگی تو یہ ہے آدمی جب تک جیئے، خدا کے لئے جئے۔ اور اگر اس کی خوشنودی اور رضا کے راستہ میں مر جائے، جان دے دے تو زہے قسمت۔ یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

وہ حیران تھی کہ گلباز خاں کو کس طرح اس عظیم خطرے سے آگاہ کرے۔؟

یہاں تک کہ دن شام کے اندھیرے میں روپوش ہو گیا، اور رات بسیرا لینے کے لئے آن موجود ہوئی، کھانے کا وقت آیا اور گزر گیا۔ لیکن اس نے اس طرف توجہ بھی نہ کی۔

ملّا کی دوڑ مسجد ——————— جب کوئی بات سمجھ میں نہ آئی، تو وہ پھر زلیخا کے پاس پہنچی، وہ اوڑھے لپٹے بستر پر پڑی تھی، فاطمہ نے پوچھا،

"کیوں زلیخا! کیسی طبیعت ہے ؟ ابھی سے سو رہی ہو ؟"

وہ اپنی طبیعت سنبھالتی ہوئی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"اچھی ہوں یوں ہی لیٹ گئی تھی آج کام بہت کرنا پڑا۔"

فاطمہ:۔ تم نے تو مجھے عجیب خلجان میں مبتلا کر دیا ہے۔

زلیخا:۔ کیوں خیر تو ہے ؟ کیا کیا میں نے ؟

فاطمہ:۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں ؟

زلیخا:۔ آخر ہوا کیا ؟ ——————— کچھ بتاؤ بھی تو !

فاطمہ:۔ تمہارا ہی تو سب کچھ کیا دھرا ہے اور تم ہی نہیں جانتیں ؟

زلیخا:۔ (مسکراتے ہوئے) میں سمجھ گئی تم گلباز خاں کے لئے فکر مند ہو ؟ کیوں یہی بات ہے نا ؟

فاطمہ:۔ ہاں اور کیا ؟ ——————— بتاؤ اس گمراہی اور ہلاکت کے گڑھے سے کس طرح انہیں نکالوں ؟

زلیخا:۔ عورت سب کچھ کر سکتی ہے، بشرطیکہ وہ چاہے۔

فاطمہ:۔ جب سے تمہارے پاس سے گئی ہوں اس خلش نے پریشان کر رکھا ہے، کسی پہلو قرار نہیں آتا۔

زلیخا:۔ ہاں سچ کہتی ہو، آخر محبت بھی تو کرتی ہو اس سے !

فاطمہ:۔ ان کے سر میں درد ہوتا ہے تو میں بے چین ہو جاتی ہوں، ان کے پھانس چبھ جاتی ہے، تو ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے وہ میرے دل میں چبھی ہے۔ اگر خدانخواستہ ذرا سا بخار بھی آ جاتا ہے انہیں، تو میں تڑپ جاتی ہوں ———————

زلیخا:۔ وہ تو ہونا ہی چاہے۔

فاطمہ:۔ اور عجیب یہ سوچتی ہوں کہ خدا نخواستہ اگر وہ اپنے کرتوت کے باعث جہنم کے مستحق ٹھہرے، تو میں کس طرح انہیں آگ میں جلتا دیکھ سکوں گی، یہ سوچ کر میرے تو بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

یہ کہتے کہتے فاطمہ کی آنکھیں اُبلنے لگیں۔

زلیخا:۔ نہیں فاطمہ روتے نہیں، رونے سے کوئی کام بھی نہیں بن سکتا۔

فاطمہ:۔ پھر کیا کروں آخر؟ تمہی بتاؤ۔ کچھ میرا تو دماغ بے کار ہوا جا رہا ہے۔

زلیخا:۔ گلباز خاں کو سمجھاؤ، وہ اچھے دل کا آدمی ہے، میرا دل گواہی دیتا ہے سمجھ جائے گا۔

فاطمہ:۔ یہ امید تو مجھے بھی ہے۔ لیکن انہیں بلاؤں کیسے؟ وہ تو یار محمد کے ہاں گئے ہوئے ہیں

زلیخا:۔ ہر دوسرے تیسرے دن تو آتا ہی رہتا ہے، تمہارے بغیر اسے چین کہاں پڑتا ہے۔

فاطمہ:۔ (مسکرا کر شرماتے ہوئے) یہ لو کہاں کی باتیں لے کر بیٹھ گئیں، ہم اپنی فکر میں گھلے جا رہے ہیں۔

زلیخا:۔ فکر مند ہونے سے کیا فائدہ؟ خدا سے دعا کرو کہ وہ ہمیں سیدھا راستہ دکھائے۔ اور بُرے راستہ سے ہٹا لے، اپنے دوستوں میں محشور کرے اور دشمنوں سے دُور رکھے

فاطمہ:۔ اب تو یہی دُعا زبان پر بار بار آ رہی ہے۔ اس کے سوا میں سب کچھ بھُول چکی ہوں

زلیخا:۔ پھر انشاء اللہ انجام بخیر ہوگا۔ دل سے نکلی ہوئی دعا کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ گلباز خاں کا چھوٹا بھائی عظیم خاں دوڑتا ہوا آیا۔ اور اس نے کہا

"ارے تم یہاں بیٹھی ہو؟"

فاطمہ نے رکھائی سے کہا۔

"تجھے کیا، میرا جہاں جی چاہے گا بیٹھوں گی، جا اپنا کام کر۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"تو میں کیسے دیتا ہوں جا کر۔"

فاطمہ، کس سے کہے گا، کیا وہ آگئے ہیں ـــــــــــــ؟

وہ بولا۔
ہاں اور کیا، ورنہ مجھے کیا پڑی تھی تمہارا کھوج لگانے کی"
زلیخا مسکرانے لگی۔

باب ۵۰

گلبازخاں

فاطمہ گھر پہنچی تو گلباز خاں اس کے استقبال کے لئے موجود تھا۔ محبت سے بھرے ہوئے شکایت آمیز لہجہ میں کہنے لگا۔

"بہت پریشان کرتی ہو! کہاں تھیں ——————؟"

وہ بولی۔

"ذرا زلیخا کے ہاں چلی گئی تھی! کیا معلوم تھا، تم آ جاؤ گے، ورنہ نہ جاتی۔"

گلبازخاں:۔ ارے —————— تم تو کچھ خفا معلوم ہوتی ہو؟

واقعی؟

فاطمہ:۔ نہیں خفا تو نہیں ہوں،

گلبازخاں:۔ تو گھر میں کسی سے لڑائی ہے؟

فاطمہ:۔ یہ بات بھی نہیں ہے۔

گلبازخاں:۔ پھر طبیعت خراب ہے کچھ؟

فاطمہ:۔ طبیعت تو اچھی ہے۔

گلبازخاں:۔ نہ خفا ہو، نہ کسی سے لڑی ہو، نہ طبیعت خراب ہے، مگر چہرہ اترا ہوا ہے تیوریاں چڑھی ہوئی ہیں، وہ گرم جوشی نہیں، جو ہمیشہ نظر آتی تھی، وہ تبسم کہاں ہے جو مجھے دیکھتے ہی تمہارے دلکش ہونٹوں پر نمودار ہو جاتا تھا؟ وہ شوخی اور طراری کدھر گئی جس کا اور تمہارا چولی دامن کا ساتھ تھا —؟

مجھ سے چھپاتی ہو؟ ہم وہ ہیں جو اڑتی چڑیا کو پہچان لیتے ہیں ــــــ
سچ سچ بتاؤ کیا بات ہے؟
فاطمہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔
گلباز خاں اس کی نمناک آنکھوں کو دیکھ کر بیتاب ہو گیا۔
"بتاؤ فاطمہ کیا بات ہے؟
وہ کہنے لگی۔
"کہہ تو رہی ہوں کوئی خاص بات نہیں ہے۔

گلباز خاں:۔ ذرا سی مہلت ملی تھی، اس سے فائدہ اٹھا کر یہاں آگیا کہ تمہارا دیدار کر لوں، تم سے کچھ دیر باتیں کر لوں، اپنی کہوں، تمہاری سنوں اور یہ قیمتی وقت تم اس طرح ضائع کئے دے رہی ہو، کیا یہ ظلم نہیں ہے۔؟

فاطمہ:۔ (آنسو پونچھتے ہوئے) بعض دفعہ آدمی کچھ سوچنے لگتا ہے تو کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔

گلباز خاں:۔ اوہو تو اب آپ مفکر بن گئی ہیں؟ ــــــ فرمایئے کیا سوچا جا رہا تھا۔؟

فاطمہ:۔ یہی کہ اس زندگی کا حشر کیا ہوگا؟

گلباز خاں:۔ حشر کیا ہوگا؟ یہ تو کسی کو نہیں معلوم؟

فاطمہ:۔ نہیں میرا مطلب یہ ہے کہ ہم جو زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ ہمیں کدھر لئے جا رہی ہے ــــــ جنت کی طرف یا جہنم کی طرف؟

گلباز خاں:۔ (غور سے فاطمہ کو دیکھتے ہوئے) یہ آج تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟ نہ کسی ملّا کی بیٹی ہو، نہ کسی ملّا کی بیوی۔

فاطمہ:۔ اس سے کیا ہوتا ہے، مسلمان تو ہوں ــــــ!

گلباز خاں:۔ مسلمان کون نہیں ہے؟ کیا میں نہیں ہوں۔؟

فاطمہ:۔ اگر ہم مسلمان ہیں تو ہمارے طور طریقے بھی تو مسلمانوں کے سے ہونے چاہئیں۔

گلباز خاں:۔ ہاں ہونے چاہئیں، نہیں ہیں، یہ انسانی کمزوری ہے، خدا معاف کرنے والا ہے

فاطمہ: بے شک خدا غفورالرحیم ہے، وہ انسان کے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے، لیکن ہر گناہ تو معاف نہیں کرتا؟

گلباز خاں:۔ توبہ میں بڑی طاقت ہے، وہ ہر گناہ معاف کرالیتی ہے۔ فاطمہ: کیا شرک بھی؟

گلباز خاں:۔ نہیں شرک تو نہیں معاف ہو سکتا۔ فاطمہ:۔ کیا منافقت بھی؟

گلباز خاں:۔ نہیں، یہ بھی بہت بڑا اور ناقابلِ معافی جرم ہے خدا کے نزدیک۔!

فاطمہ:۔ اور بے گناہوں کا قتل؟

گلباز خاں:۔ توبہ کرو، فاطمہ! بھلا کسی بے گناہ کا قتل بھی معاف ہو سکتا ہے؟ کبھی نہیں۔

فاطمہ:۔ اور اگر خدا کے نیک بندوں کو ستایا جائے؟ خدا کی عبادت کرنے والوں کی گردنیں کاٹی جائیں۔ خدا کے لئے جہاد کرنے والوں کے راستہ میں کانٹے بچھائے جائیں، خدا کے صالح اور طیب و طاہر بندوں کی ہلاکت اور بربادی کے منصوبے تیار کئے جائیں / خدا کی حکومت قائم کرنے والوں کے ساتھ غداری کی جائے۔؟ معاہدہ توڑ دیا جائے۔؟ بیعت فسخ کر دی جائے، وعدہ ایفا نہ کیا جائے، اور غیر مسلم، دشمنوں یعنی کافروں اور مشرکوں سے ساز باز کر لی جائے ——— تو؟

گلباز خاں فاطمہ کی یہ باتیں ہکا بکا سن رہا تھا، اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ واقعی یہ فاطمہ کے بول ہیں۔ ایک بھولی بھالی اور الھڑ لڑکی کے بول، جو شوخی اور طرارّی کے سوا کچھ نہیں جانتی، اس نے ایک عجیب انداز میں اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہاری باتوں کا جواب تو یہ ہے کہ یہ ساری باتیں بڑی ہیں، خراب ہیں، گناہ ہیں اور ایک مسلمان کے لئے یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ ایسی حرکتیں کرے۔ لیکن۔

فاطمہ:۔ لیکن کیا ———؟

گلباز خاں :۔ لیکن یہ بول تمہارے نہیں معلوم ہوتے، تمہارے منہ سے یہ باتیں اچھی بھی نہیں لگتیں یہ سبق تمہیں کس نے پڑھایا ہے ؟

فاطمہ :۔ (شرمیلی لیکن محبت بھری نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے) تمہاری محبت نے ۔

گلباز خاں :۔ (مسکراتے ہوئے) میری محبت نے تمہیں ایک رات میں اتنا قابل بنا دیا ہے ؟

فاطمہ :۔ محبت اس سے کم مدّت میں بھی سب کچھ کر سکتی ہے ۔

گلباز خاں :۔ تو اب مجھے محبت کا سبق بھی تم سے لینا پڑے گا ؟

فاطمہ :۔ یہ بتاؤ اگر تمہیں خدانخواستہ بیمار دیکھوں تو کیا یہ میرا فرض نہیں ہے کہ تم سے پرہیز نہ کروں اور تمہاری تیمارداری کروں ؟ تمہارے علاج معالجہ میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھوں ؟

گلباز خاں :۔ بے شک ہے ——————— لیکن تم نے مجھ میں کیا خامی پائی یہ بھی تو دیکھوں ؟

فاطمہ :۔ تم بڑے اچھے آدمی ہو، اور نہ بھی اچھے ہو، تو بھی میں تم سے محبت کرتی ہوں، میری نظر میں تو تم اچھے ہی اچھے ہو ۔

گلباز خاں :۔ شکریہ شکریہ، لیکن یہ کہ ارشاد ہو ان باتوں کا یہ محل کیا ہے ؟

فاطمہ :۔ جب میں یہ سوچتی ہوں کہ جس راستہ پر تم چل رہے ہو۔ یہ جنّت کا نہیں، جہنم کا راستہ ہے تو میرا دل کانپ جاتا ہے، میری روح لرز جاتی ہے ۔

گلباز خاں :۔ فاطمہ ! فاطمہ ! یہ تم کیا کہہ رہی ہو ؟

فاطمہ :۔ میں غلط نہیں کہتی، جھوٹ نہیں کہتی ۔

گلباز خاں :۔ ایسی باتیں تو میں نے تم سے کبھی نہیں سنی تھیں ۔

فاطمہ :۔ لیکن ایسی باتیں کرنے پر میں مجبور ہوں ۔

گلباز خاں :۔ کس نے مجبور کیا ہے تمہیں، کیوں مجبور ہو ؟

فاطمہ :۔ تمہارے سر میں درد ہوتا ہے تو میرے دل میں ہونے لگتا ہے، تمہیں ذرا سست

دیکھتی ہوں تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے ۔ ذرا بھی کسی وقت تمہیں تکلیف کے عالم میں دیکھ لوں ، تو پھر میں اپنے ہوش میں نہیں رہتی ، میری جان پر بن جاتی ہے ــــــــ !

گلبازخاں :۔ کہنے کی کیا ضرورت ہے ، کیا میں نہیں جانتا ، میری جان پر بن جاتی ہے ــــــــ !

فاطمہ :۔ پھر جب یہ بھیانک تصور میری آنکھوں کے سامنے آتا ہے کہ تم وہ ہو جس سے خدا خفا ہے ، اور تمہارا انجام خدانخواستہ وہ ہوگا جو خدا کے معتوب بندوں کا ہوتا ہے تو سوچ لو کیا گزر جاتی ہوگی مجھ پہ ؟

گلبازخاں :۔ یقیناً تمہاری حالت غیر ہو جاتی ہوگی۔

فاطمہ :۔ پھر تم ہی سمجھ لو۔

گلبازخاں :۔ سمجھ تو لیا ، لیکن خدا کی بندی ! یہ تو بتاؤ ، یہ خیالات تمہارے دماغ میں آتے کیوں ہیں ؟

فاطمہ :۔ کیسے نہ آئیں ۔ جب کہ تم یار محمد کے ساتھی ہو اور وہ چھٹا ہوا غدار ہے جو خدا کے ایک نیک ، سچے اور اچھے بندے سید بادشاہ کے درپے آزار ہو رہا ہے جو مجاہدوں کی جماعت ختم کر دینا چاہتا ہے ، تم خود ہی تو مجھے بتا چکے ہو ، وہ سکھوں سے ساز باز رکھتا ہے ، اور چاہتا ہے کہ مجاہدین پہ وہ غالب آ جائیں ۔ کیا یہ سچ نہیں ہے ؟

گلبازخاں :۔ ہاں ہے تو ؟

فاطمہ :۔ تو میں اسے کس طرح گوارا کر لوں کہ ایسے خراب آدمی کا ساتھ دے کر تم اپنی عاقبت بگاڑ لو ، میں تو اگر تمہیں اس راستہ پہ چلتے دیکھوں گی تو زہر کھا لوں گی ۔

گلبازخاں :۔ فاطمہ ــــــــ !

فاطمہ :۔ ہاں سچ کہتی ہوں ، جیتے جی تو میں تمہیں تباہی کے راستے پہ چلتا نہیں دیکھ سکتی ۔ روکوں گی ، اگر نہ روک سکی تو اپنی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند کر لوں گی کہ یہ دلخراش منظر میری آنکھیں نہ دیکھ سکیں ،

گلبازخاں :۔ لیکن تمہارا یہ خیال صحیح نہیں ہے ــــــــ !

فاطمہ:۔ تو جو صحیح بات ہے وہ بتا دو، اگر سمجھ میں آگئی تو مان لوں گی۔ اور پھر کچھ نہیں کہوں گی، بلکہ اگر کوئی تمہیں کچھ کہے گا تو اس کا منہ بند کر دوں گی۔

گلباز خاں:۔ اب اتنی ہی بڑی تقریر مجھے بھی کرنا پڑے گی۔
نا بابا! میرے پاس وقت بہت کم ہے ——————— پھر کسی دن دیکھا جائے گا۔

فاطمہ:۔ پھر تم نے مجھے رُلانے والی باتیں شروع کر دیں؟

گلباز خاں:۔ لیکن مجھے نیند جو آ رہی ہے۔

فاطمہ:۔ اچھا، میں قہوہ بنا کر لاتی ہوں، نیند اڑ جائے گی ابھی۔

باب ۵۸

کشمکش خیال ؟

گلباز خاں کے لئے فاطمہ کی یہ باتیں نئی بھی تھیں اور عجیب بھی۔ اور ناپسندیدہ بھی، وہ ایک آزاد منش سپاہی تھا، مذہب، قوم، ملت، ان چیزوں سے اسے کوئی سروکار نہ تھا۔ یار محمد خاں اس کی قدر کرتا تھا، اسے معقول تنخواہ دیتا تھا، انعام واکرام سے بھی نوازتا رہتا تھا۔ اس لئے وہ اس کی وفاداری کا دم بھرتا تھا، لیکن اگر یار محمد کا کوئی مخالف اس کی زیادہ قدر افزائی اور دل دہی کرتا تو وہ اس کی وفاداری کا دم بھرنے لگتا، اور اگر ضرورت ہوتی تو یار محمد کے خلاف صف آرا ہونے میں بھی تامل نہ کرتا، وہ فاطمہ سے محبت کرتا تھا۔ اس لئے کہ وہ خوب صورت بھی تھی اور خوب سیرت بھی، لیکن فاطمہ کو اس نے اپنے مشیر کی حیثیت کبھی نہیں دی تھی نہ اس سے یہ توقع رکھتا تھا کہ اس کے سپاہیانہ معاملات و مسائل کے خارزار سے وہ اپنا دامن الجھائے گی۔

وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ فاطمہ قہوہ لے کر آگئی، گلباز خاں نے ایک گھونٹ پیتے ہوئے اور لب چاٹتے ہوئے کہا،

"بہت خوب ہے لطف آگیا۔ کیوں نہ ہو آخر، تمہارے ہاتھ لگے ہیں اس میں۔

وہ بولی۔

"یہ باتیں چھوڑیئے، کام کی باتیں کیجئے۔

گلباز خاں:۔ کام کی بات یہ ہے کہ ہمیں تمہیں ایک اصول پر کاربند رہنا چاہیئے۔ فاطمہ منہ سے کچھ نہ بولی، اس کی طرف دیکھنے لگی۔

گلباز خاں:۔ میرا مطلب یہ ہے کہ خدا نے مرد اور عورت کو الگ الگ صنف میں پیدا کیا ہے، اور دونوں کے فرائض بھی الگ الگ رکھے ہیں۔

فاطمہ:۔ ہاں تو ——— اس سے کیا ہوتا ہے؟

گلباز خاں:۔ تم گھر کی ملکہ ہو، جو چاہو کرو، نہ آج تک میں نے کبھی مداخلت کی ہے، نہ آئندہ یہ جرم سرزد ہوگا۔ گھر سے باہر کے امور میرے دائرہ میں داخل ہیں، ان میں خود مختاری اور آزادی مجھے حاصل ہے، تم نہ بولو، تم دخل دینے کی کوشش نہ کرو۔ اس طرح یہ گاڑی مزے میں چل سکے گی۔

فاطمہ:۔ یعنی اگر میں آپ کو ہلاکت اور تباہی کے راستہ پر گامزن دیکھوں تو نہ روکوں؟

گلباز خاں:۔ تم نہیں جانتیں، کون راستہ کیسا ہے؟

فاطمہ:۔ کیسے نہیں جانتی، بغیر جانے ہوئے بولتی ہوں؟

گلباز خاں:۔ ہاں اور کیا بالکل ناسمجھی کی باتیں ہیں یہ۔

فاطمہ:۔ (خوشامدانہ لہجہ میں) خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کرو۔

گلباز خاں:۔ تم کیا جانو، کون آدمی کیسا ہے؟ تم نہیں جانتیں، رنگے سیار کیسے ہوتے ہیں۔

فاطمہ:۔ رنگے سیار ——— یہ کسے کہہ رہے ہو تم؟

گلباز خاں:۔ جنہیں تم صالح، نیک، سچّا اور پکّا مسلمان سمجھتی ہو ———؟

فاطمہ:۔ (کانوں میں انگلیاں دے کر) اللہ چپ رہو، ایسی باتیں میں نہیں سُن سکتی۔

گلباز خاں:۔ میں تو چپ ہی تھا، تم نے مجھے بولنے پر مجبور کیا ہے۔

فاطمہ:۔ (بے بسی کے ساتھ) کیا معلوم تھا تمہارے منہ سے ایسی باتیں سننا پڑیں گی۔

گلباز خاں:۔ (پیار کے لہجہ میں) فاطمہ تم نے دنیا نہیں دیکھی ہے، میں نے دیکھی ہے، تم لوگوں کے عادات و اطوار سے ناواقف ہو، میں اڑتی چڑیا پہچان لیتا ہوں۔ تمہیں مختلف قسم کے لوگوں سے سابقہ نہیں رہا ہے، مجھے رہا ہے۔ تم لوگوں

کے ظاہر و باطن سے نا آشنا ہو، مجھ پر عیاں ہے، تم ظاہر دیکھ کر فیصلہ کر لیتی ہو میری نگاہ باطن کی گہرائی تک جاتی ہے۔ اور میں سب کچھ تاڑ لیتا ہوں۔

فاطمہ:۔ آخر تمہارا مطلب کیا ہے؟

گلباز خاں:۔ یہی کہ جن لوگوں کے تم گن گا رہی ہو، وہ ویسے نہیں ہیں جیسے تمہیں نظر آتے ہیں

فاطمہ:۔ واہ حبیب خاں ہی کو دیکھو کتنا اچھا آدمی ہے۔

گلباز خاں:۔ ہاں ہے، اور میں اس سے محبت بھی کرتا ہوں، لیکن بے وقوف ہے۔ چالاکوں میں پھنس گیا ہے،

فاطمہ:۔ اور زلیخا ——————؟

گلباز خاں:۔ کیا کہنا ہے زلیخا کا، میرے دل میں اس کی بڑی قدر و منزلت ہے۔ ایک غیر مذہب سے ہمارے مذہب میں آئی ہے اور ہم سب سے اچھی مسلمان ہے

فاطمہ:۔ وہ بھی تو سید بادشاہ کی دل سے عقیدت مند ہے۔

گلباز خاں:۔ ہاں تمہاری طرح،

فاطمہ:۔ یعنی وہ بھی بے وقوف ہے؟

گلباز خاں:۔ اور کیا —————— جیسی تم بھولی بھالی اور سادہ لوح و بے وقوف ہو، ویسی ہی وہ ہے، اور حماقت کا علاج لقمان حکیم کے پاس بھی نہیں ہے۔

فاطمہ:۔ (لاجواب ہو کر) واہ بھئی۔ یہ بھی خوب رہی۔

گلباز خاں:۔ اور کیا —————— ذرا سوچو تو یہ مولوی ملا۔ اس لئے ہیں کہ نماز پڑھائیں مسجدیں آباد کریں، کوئی مرے جئے تو پہنچ جائیں اور فاتحہ درود اور دعا کر لیں۔ یہ کیا جانیں، حکومت کس طرح کی جاتی ہے؟ نظام حکومت کیوں کر استوار کیا جاتا ہے؟ نظم و ضبط قائم کرنے کی کیا صورت ہوتی ہے؟ رعایا کے ساتھ کیا اور کیسا برتاؤ کیا جاتا ہے؟

فاطمہ:۔ پھر کون جانتا ہے یہ باتیں ——————؟

گلباز خاں: وہ جانتا ہے جو باپ دادا سے حکومت کرتا چلا آیا ہے،

فاطمہ:۔ یعنی یار محمد خاں؟

گلباز خاں:۔ ایک یار محمد خاں کیا، ہر وہ شخص جو سپاہی ہے جو اندازِ حکمرانی سے واقف ہے جو پشتوں سے یہی کام کرتا چلا آیا ہے،

فاطمہ:۔ سپاہی تو سید بادشاہ کے لوگ بھی ہیں۔

گلباز خاں:۔ جی ہاں، کیا کہنا، بڑے رستم ہیں اپنے وقت کے۔

فاطمہ:۔ واہ تم تو بنانے لگے۔

گلباز خاں:۔ تو اور کیا کروں؟ —————— ہر وہ شخص سپاہی نہیں بن سکتا جو تلوار ہاتھ میں لے لے تلوار چلانا ایک فن ہے، جو بڑی مشقت اور ریاض سے آتا ہے۔

فاطمہ:۔ راؤب کر، اونھ ہوگا۔

گلباز خاں:۔ بتاؤ سمجھ گئیں ہماری بات؟

فاطمہ:۔ (مسکرا کر) نہیں۔

گلباز خاں:۔ وعدہ کرو، اب اس قسم کے معاملات میں ٹانگ نہیں اڑایا کروگی،

فاطمہ:۔ میں تو جس میں تمہاری بھلائی دیکھوں گی، کہوں گی، چاہے تمہیں بڑا لگے یا اچھا تمہاری خفگی کے ڈر سے یہ تو نہیں کر سکتی کہ جتنی مکھی تمہیں نگل جانے دوں،

گلباز خاں:۔ وہ تو ٹھیک ہے، لیکن کوئی بات ہو بھی تو —————— ذرا سوچو تو یہ بھی کوئی بات ہوگی کہ چند لوگوں نے لاٹھیاں اور تلواریں سنبھالیں اور اٹھا کر سیدھے یہاں پہنچ گئے۔ اور حکمران بن بیٹھے، اور لگے اپنا حکم چلانے، نماز پڑھو ورنہ سزا ملے گی کمر میں لنگی باندھ کر نہاؤ۔ ورنہ پٹو گے زکوٰۃ دو، ورنہ جرمانہ ہوگا۔ عشر ادا کرو ورنہ مستحق تعزیر ہوگے۔ روزہ رکھو، ورنہ شامت آئے گی۔ دنیا کی دلچسپیوں اور تفریحوں میں حصہ

نہ لو، ورنہ سر سلامت نہ رہے گا، ہر وقت تسبیح ہاتھ میں لئے رہو، ورنہ پٹنے کے لئے تیار ہو جاؤ، فلاں جائداد جو تمہارے دادا نے فلاں آدمی سے آج سے پچاس برس پہلے چھین لی تھی، بلکہ اپنے زور بازو سے حاصل کر لی تھی، وہ اب اس کے پوتے کو واپس کر دو۔ کہ وہ اس کا مستحق ہے نہ دوگے تو زبردستی چھین لی جائے گی۔ اٹھو، کمر باندھو اور سکھوں سے لڑو۔ چل کر، ورنہ تمہیں یہیں قتل کر دیا جائے گا۔ کیوں لڑیں سکھوں سے ———— ؟ وہ اسی کو مارتے ہیں جو ان سے سرتابی کرتا ہے

ورنہ انہیں اپنے باج اور خراج سے مطلب ہے، اور کسی چیز سے وہ سروکار نہیں رکھتے، ہم کیا کھاتے ہیں کیا پہنتے ہیں؟ کیا پیتے ہیں، کیا اوڑھتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں یا نہیں۔ زکواۃ دیتے ہیں یا نہیں اس سے کوئی سروکار نہیں رکھتے، اور یہ ملا لوگ جو ہندوستان سے آئے ہیں، ہر معاملہ میں دخل دینے کے لئے بے چین ہیں۔

فاطمہ:۔ لیکن کہتے تو ٹھیک ہی ہوں گے۔

گلباز خاں:۔ کیسی ٹھیک باتیں ———— زندگی نہ ہوئی وبالِ جان ہو گئی! یہ زندگی کے چند دن اسی لئے ہیں کہ آدمی کھائے۔ پیئے، موج اڑائے اور مر جائے، یا اس لئے کہ صبح سے شام تک مصلے پر بیٹھا رہے ————۔

فاطمہ:۔ لیکن ————۔

گلباز خاں:۔ لیکن ویکن کچھ نہیں۔ یہ سب ملاؤں کی باتیں ہیں، میں ان پر اعتماد و یقین نہیں رکھتا، خدا کو کیا ضرورت ہے کہ ہمیں خواہ مخواہ پریشان کرے، ملاؤں کا حلوا مانڈا اسی سے چلتا ہے، لہذا وہ ایسی باتیں اپنے دماغ سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر پیدا کرتے ہیں۔

فاطمہ:۔ اچھا چھوڑو ان باتوں کو ایک کام تو کرو۔

گلباز خاں:۔ کہو ذرا اشارہ کر کے دیکھو گردن کاٹ کے رکھ دوں گا۔

فاطمہ:۔ بس وہی بیکار باتیں ————!

گلباز خاں:- سچ کہتا ہوں تجربہ کرکے دیکھ لو۔

فاطمہ:- میں یہ کہہ رہی تھی کہ حبیب خاں کو تو بچالو کسی طرح۔

گلباز خاں:- تمہیں اس کی اتنی فکر کیوں ہے؟

فاطمہ:- ایک تو اس لئے کہ تمہارا دوست اور بھائی ہے اور سب سے بڑھ کر اس لئے کہ وہ زلیخا کا شوہر ہے، اور میں کرتی ہوں اس سے محبت، اس سے اچھی لڑکی آج تک میری نظر سے نہیں گزری۔

گلباز خاں:- زلیخا واقعی بڑی اچھی اور قابل قدر لڑکی ہے۔

فاطمہ:- پھر میں کیوں کر گوارا کروں کہ وہ بیوہ ہو جائے۔بے سہارا ہو جائے۔ دنیا میں کوئی اس کا نہ رہے۔

گلباز خاں:- ہاں، یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن میرے بس میں کیا ہے؟

فاطمہ:- اور اب زلیخا تنہا نہیں ہے، بہت جلد ایک بچہ کی ماں بھی بننے والی ہے۔ اس غریب کا کیا حشر ہو گا کون ان کے سر پر ہاتھ رکھے گا؟ —————— سچ کہتی ہوں جب اس کا خیال آجاتا ہے، میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔ مجھے اپنا خیال آجاتا ہے۔ تم یاد آجاتے ہو۔

گلباز خاں:- مصیبت یہ ہے کہ حبیب بڑا ضدی، خود سر اور نافرمان آدمی ہے۔ نہ جانے کتنی مرتبہ اسے سمجھا چکا ہوں۔ لیکن کیا مجال ہے جو مان جائے؟

فاطمہ:- وہ تمہارا دوست ہے، بھائی ہے؟ —————— کچھ تو کرو۔

گلباز خاں:- میں واقعی اس سے محبت کرتا ہوں، بڑی شدید محبت، لیکن وہ میرے قبضہ میں نہیں آتا۔

فاطمہ:- پھر سمجھاؤ۔

گلباز خاں:- بے نتیجہ ہے اس سے کچھ کہنا سننا —————— ہاں ایک ترکیب ہو سکتی ہے

فاطمہ:۔ تو بتاؤ پھر کیا ترکیب ہو سکتی ہے۔

گلباز خاں:۔ اور وہ تم ہی کر سکتی ہو کوئی اور نہیں،

فاطمہ:۔ ضرور کروں گی،

گلباز خاں:۔ تم سمجھاؤ جاکر زلیخا کو جس طرح مجھے ابھی اونچ نیچ دکھا رہی تھیں، اسے دکھاؤ وہ اگر حبیب خاں کو پکڑے گی تو کام بن جائے گا۔

فاطمہ:۔ نہیں، یہ ترکیب کامیاب نہیں ہو سکتی۔

گلباز خاں:۔ کامیاب کیوں نہ ہوگی، کوشش تو کر کے دیکھو۔

فاطمہ:۔ کیا فائدہ ؟

گلباز خاں:۔ بڑی مایوس اور دل گرفتہ نظر آتی ہو، زلیخا کی طرف سے ——— ؟

فاطمہ:۔ ہاں ——— جس طرح تم حبیب خاں کی طبیعت، عادت اور مزاج سے واقف ہو۔ اسی طرح میں زلیخا کی مزاج دان ہوں۔

گلباز خاں:۔ ہمارا کام ختم ہوگیا، اس کے بعد ہم اور کیا کر سکتے ہیں ——— ؟

فاطمہ:۔ لیکن بڑا دکھ ہوتا ہے یہ سوچ کر،

گلباز خاں:۔ میری تو آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ لیکن جو شخص خودکشی کا فیصلہ کر چکا ہو اسے کون روک سکتا ہے۔ ؟

فاطمہ:۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تمہارے یار محمد خاں سید بادشاہ کا ساتھ نہ دیں انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیں اور ان سے جنگ کا ارادہ بدل دیں ———

گلباز خاں:۔ نہیں۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا ———

فاطمہ:۔ یہ تو بڑی معمولی بات ہے۔

گلباز خاں:۔ یہ تصادم نہیں رک سکتا کسی طرح ——— اس پر سوچنا ترک کر دو اور نتیجہ خدا پر چھوڑ دو۔

باب ۵۹

زلیخا مجھے تم پر فخر ہے

گلباز خاں رات بھر رہ کر صبح صبح واپس چلا گیا، وہ یار محمد خاں کا نفس ناطقہ بنا ہوا تھا۔ اس کی ہر تدبیر اور ترتیب میں شریک رہتا تھا اس کے ذہن و دماغ کی ساری صلاحیتیں صرف اسی امر پر صرف ہو رہی تھیں کہ خاو سے خاں کا بدلہ لیا جائے۔ مجاہدین کا صفایا کر دیا جائے۔

اتفاق کی بات، ادھر گلباز خاں واپس گیا، ادھر حبیب خاں اپنے گھر میں داخل ہوا ہمیشہ زلیخا اسے گھر کا کام کرتی ہوئی ملتی تھی۔ اسے دیکھتے ہی اس کے گالوں پر سرخی کی ایک لہر دوڑ جاتی تھی اور وہ مسکراتی ہوئی اس کا استقبال کرتی تھی، جلدی جلدی اس کا ناشتہ تیار کرتی تھی اور پھر اس سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگتی تھی، لیکن آج وہ نظر نہیں آئی۔ حبیب کا دل دھک سے ہو گیا، وہ سیدھا اس کمرہ میں پہنچا، جو زلیخا کا مسکن تھا۔ اس نے دیکھا وہ جاگ رہی ہے، لیکن اس کی آنکھیں سرخ ہیں، چہرہ زرد ہے ہونٹ سوکھے ہوئے ہیں اور چہرے سے عجیب بے کلی سی ظاہر ہو رہی ہے یہ کیفیت دیکھ کر وہ گھبرا گیا، بجلی کی سی تیزی سے اس کے پاس پہنچا۔ وہیں چارپائی پر اس کے پاس بیٹھ گیا اور پوچھا۔

"کیسی ہو زلیخا!"

وہ مسکرائی ——— لیکن اس تبسم میں مسرت کی فراوانی کے بجائے ایک خاص قسم کی سوگواری نمایاں تھی۔ اس نے کہا۔

"اچھی ہوں۔"

حبیب خاں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا، اور پھر اضطراب کے ساتھ اسے چھوڑتے ہوئے کہا۔

"تمہیں تو بخار ہے"

وہ کہنے لگی۔

"اب تو بہت کم ہے، رات کو زیادہ تھا۔ نیند بھی نہیں آئی"

حبیب خاں:- بخار کیوں ہوگیا تمہیں؟

زلیخا:- (مسکراتے ہوئے) میں کیا جانوں؟ اسی سے پوچھئے۔

یہ تو بتائیے آپ کیسے ہیں۔؟

حبیب خاں:- شکر ہے خدا کا، اچھا ہوں۔

زلیخا:- جھوٹ نہ بولئے، آدمی کا چہرہ سب کچھ بتا دیتا ہے۔

حبیب خاں:- (مسکرا کر) میرے چہرے نے کیا چغلی کھائی ہے تم سے؟

زلیخا:- وہ کہتا ہے، آپ بہت زیادہ پریشان ہیں، کوئی فکر ہے، جس نے آپ کا سکون چین رکھا ہے۔ کوئی دکھ جس سے آپ بیقرار ہیں، کوئی بات ہے جس نے آپ کا تبسم چھین لیا ہے۔

حبیب خاں:- بات تو ٹھیک ہے۔

زلیخا:- پھر آپ مجھ سے چھپانے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں؟

حبیب خاں:- میں اسی لئے ہوں کہ دکھوں کا مقابلہ کروں، فکروں سے لڑوں طوفانوں سے ٹکر لوں، حالات کے سامنے سپر نہ ڈالوں۔ اور تم اس لئے ہو کہ جب تک زندہ ہوں خوش رہو، تم میری زندگی کی ہر چیز پر حاوی ہو، میری اقلیم حیات پر تمہارا سکہ چلتا ہے۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ اپنی فکروں اور دکھوں کا شریک بھی تمہیں بنا لوں،

زلیخا:۔ آپ مجھے اب تک نہیں سمجھ سکے ——————!

حبیب خاں:۔ میرا تو یہ خیال ہے، میں نے تمہیں اچھی طرح پرکھ بھی لیا ہے، اور سمجھ بھی لیا ہے۔

زلیخا:۔ یہ بات ہوتی تو اپنا سوز و درد مجھ سے چھپانے کی کوشش نہ کرتے، میں آپ کی رفیقۂ حیات ہوں، اور مجھے حق ہے آپ کی زندگی کا ہر واقعہ اور حادثہ میرے علم میں آئے۔

حبیب خاں:۔ چاہے تم کچھ نہ کر سکو؟

زلیخا:۔ یہ آپ نے کیسے جان لیا، میں کچھ نہیں کر سکتی؟

حبیب خاں:۔ بھائی تم سب کچھ کر سکتی ہو، جو چاہنا کر لینا، پہلے اچھی ہو جاؤ۔

زلیخا:۔ صحت اور بیماری کا ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں۔

حبیب خاں:۔ کیسے نہیں ہے۔ کیا تمہیں اور بیمار ڈال دوں؟

زلیخا:۔ میں اچھی ہو جاؤں گی۔

حبیب خاں:۔ جن باتوں نے میرے سکون و آرام کو تاراج کر ڈالا ہے انہیں سن کر تم اچھی ہو جاؤ گی؟

زلیخا:۔ ہاں —————— کہہ کر تو دیکھئے۔

حبیب خاں:۔ پریشان نہ کرو زلیخا! تم نہیں جانتیں میں کتنا پریشان ہوں۔ کیسی کیسی فکروں میں مبتلا ہوں، ذرا سا موقع ملا، تو تمہارے پاس بھاگ آیا کہ کچھ دیر تمہاری جاں نواز باتوں میں دل بہلاؤں گا۔ تمہیں دیکھوں گا، خوش ہوں گا، مستقل طور پر نہ سہی، تھوڑی دیر کے لئے سہی، سکون کی چھنی ہوئی نعمت حاصل ہو جائے گی۔ لیکن تم نے دوسرے قسم کی باتیں چھیڑ دیں۔ ان سے تو میرے اضطراب اور بیکلی میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

زلیخا:۔ اچھا میں خاموش ہوئی جاتی ہوں۔

حبیب خاں: یہ لیجئے، خفا ہوگئیں آپ،

زلیخا: عجیب مشکل ہے، نہ ایسے بنتا ہے نہ ویسے چپ رہتی ہوں تو خفگی کا طعنہ ملتا ہے بات کرتی ہوں تو خاموش رہنے کی ہدایت ہوتی ہے۔ آخر کروں کیا ؟

حبیب خاں: (مسکراتے ہوئے) اللہ اللہ! خفگی ہے کہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہی جا رہی ہے

زلیخا: خوب مذاق اڑا لیجئے۔ جی بھر کے میری بے بسی کا۔

حبیب خاں: (ایک جذبہ کے ساتھ) جب تک میں زندہ ہوں تم بے بس کیسے ہو سکتی ہو؟ ایسی باتیں نہ کرو۔ ورنہ مجھے صدمہ ہوگا،

زلیخا: میرے بس میں ہو تو آپ کی فکر خود لے لوں، لیکن آپ تو مجھ پر اعتماد بھی نہیں کرتے

حبیب خاں: پھر وہی خفگی، وہی طنز، آخر تم چاہتی کیا ہو ؟

زلیخا: اپنی پریشانی کا سبب بتائیے، میں یہ جان کر رہوں گی۔

آخر حبیب خاں نے ساری کتھا زلیخا کو سنا ڈالی اور ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"یہ ہیں حالات، بتاؤ کیا کروں ! ——— دے سکتی ہو کوئی مشورہ ؟"

زلیخا: ان حالات کی بھنک مجھے فاطمہ کے ذریعہ پہلے سے مل چکی تھی۔

حبیب خاں: فاطمہ کے ذریعے ؟ اس سے کیا باتیں ہوئی تھیں ؟

زلیخا: وہ بتا رہی تھی، یار محمد خاں سید بادشاہ کا دشمن ہو چکا ہے۔

مجاہدین کا نام سن کر اس کی تیوریاں چڑھ جاتی ہیں، غازیوں کے ذکر سے بھڑک اٹھتا ہے اور اب وہ فیصلہ کر چکا ہے کہ کوئی دقیقہ سید بادشاہ کی حیات کو ختم کرنے کے سلسلہ میں نہیں اٹھا رکھے گا۔ حتیٰ کہ جنگ تک سے گریز نہیں کرے گا۔

حبیب خاں: فاطمہ کو یہ باتیں گلباز خاں سے معلوم ہوئی ہوں گی ؟

زلیخا: ہاں بڑی نیک لڑکی ہے، بیچاری کہہ رہی تھی جس طرح ہو سکے حبیب کو واپس بلا لو، ورنہ ان کی جان کو خطرہ ہے۔

حبیب خاں :۔ (تیوریاں چڑھاکر) پھر تم نے کیا جواب دیا؟

زلیخا :۔ میں نے کہا، نہ میں انہیں واپس بلا سکتی ہوں، نہ وہ واپس آ سکتے ہیں۔ کہنے لگی کیوں؟ میں نے کہا، وہ اپنے لئے کفن سر سے باندھ کر نہیں نکلے ہیں، خدا کے لئے نکلے ہیں اور ان کی سب سے بڑی خوش قسمتی یہ ہے کہ وہ اس مقصد پر قربان ہو جائیں۔ جام شہادت نوش کریں۔ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی اور گویا ہوئی کیا تم اپنا سہاگ برباد کر لوگی؟ میں نے جواب دیا۔ خدا کی خوشنودی کے لئے جب جان دی جا سکتی ہے، تو سہاگ کیا چیز ہے! کہنے لگی، یہ بچہ جو تمہارے پیٹ میں کروٹ لے رہا ہے اس کا حشر کیا ہوگا؟ اس کی تو حبیب خاں کے بعد کوئی بات بھی نہیں پوچھے گا۔ میں نے کہا خدا تو ہے، وہ پوچھے گا۔ کہنے لگی، یہ یتیم در در کی ٹھوکریں کھائے گا۔ میں نے کہا یہ یتیم بھی بڑا ہو کر غازی بنے گا اور مجاہد بنے گا۔ اور اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چل کر شرفِ شہادت حاصل کرے گا۔

کہنے لگی اور اگر لڑکی ہوئی تو وہ کیا کرے گی؟ میں نے کہا کسی مجاہد کی رفیقۂ حیات بنے گی تو کہنے لگی، میں سمجھ گئی تم حبیب خاں سے محبت نہیں کرتیں، صرف وہی جان باز بچا بتا ہے تمہیں، میں نے جواب دیا، یہ بات وہ تم سے زیادہ جانتے ہیں۔

حبیب خاں بڑے غور سے زلیخا کی باتیں سنتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔

"زلیخا! مجھے تم پر فخر ہے"

پھر اس کی آواز بھر آگئی، گلا رندھ گیا اور وہ کچھ نہ کہہ سکا۔

باب ۶۰

یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے

سید بادشاہ (حضرت سید صاحب) کے یمن قدم سے اس پورے علاقہ کے حالات میں زبردست تغیر آگیا تھا۔ جہاں جہاں اسلامی حکومت قائم ہوئی تھی، وہاں اسلامیت اور للّٰہیت کا ایسا دلکشا منظر نظر آتا تھا کہ غیر اور دشمن بھی دیکھ کر دنگ رہ جاتے تھے۔ اللہ کے ان نیک اور پاکباز بندوں کی سیرت اور شخصیت نے صرف انہی لوگوں کی اصلاح نہیں کی، جو مذہب پرست تھے، دین کے متوالے تھے، ان لوگوں کو بھی خاک سے اکسیر بنا دیا، جو کچھ نہ تھے، جن کے کردار اور گفتار میں اسلامیت اور للّٰہیت کا کہیں نام نہ تھا، جو عصیاں شعار اور خطا کار تھے۔ لیکن اس مردِ کامل کی نظر پڑتے ہی کچھ سے کچھ ہو گئے ——— انہی لوگوں میں ایک ملت آزار، قوم دشمن اور مذہب بیزار ڈاکو بھی تھا۔

بھیلیہ ڈاکو۔ اس کی ذات سے مسلمانوں کو وہ نقصان پہنچ رہا تھا، جو شاید سکھوں سے بھی نہیں پہنچتا تھا۔

بھیلیہ نام ایک شخص ٹوپی کا رہنے والا، بڑا ظالم، مردم آزار تھا۔ لوگ اس کے ہاتھ سے تنگ آگئے تو اتفاق کر کے اسے بستی سے نکال دیا۔ وہ سکھوں کے پاس چلا گیا۔ انہوں نے دریا کے کنارے اس کے لئے ایک برج بنا دیا۔ پچاس ساٹھ آدمی ہر وقت اس کے پاس رہتے تھے۔ جب موقع پاتا دریا سے گزر کر مسلمانوں کے دیہات میں ڈاکے ڈالتا۔ ایسے مواقع پر اس کے ساتھ سو سوا سو آدمی ہوتے تھے۔

دریائے سندھ کے وسط میں ایک جزیرہ تھا، جسے تنہائی کا بیلہ کہتے تھے۔ اس میں مشوانی

لوگ آباد تھے۔ جس زمانے میں لکھن سنگھ ہزارے کا گورنر تھا۔ بھیلیہ نے اس کی اجازت سے اس بیلہ پر ڈاکہ مارا۔ سکھ بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ مشوانیوں نے سخت مقابلہ کیا اور بھیلیہ کے ساتھیوں میں سے تقریباً اسّی آدمی مارے گئے۔ ان میں سے پندرہ سولہ سکھ بھی تھے مقتولوں میں بھیلیہ کا بھائی احمد علی بھی شامل تھا۔ لیکن بیلے اور بستی پر بھیلیہ کا قبضہ ہو گیا اور اس نے وہیں سکونت اختیار کر لی۔ اس جگہ سے وہ ٹوپی، مینئی، منارہ، کھیل اور اردگرد کے بڑے بڑے مواضع پر یورشیں کرتا رہتا تھا۔ جب سیّد صاحب امب تشریف لائے، تو لوگوں نے انتہائی پریشانی کے عالم میں اس کے تدارک کی درخواست کی۔

سیّد صاحب نے اسے ایک خط لکھا کہ آپ مسلمان ہیں، اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں آپ کے لئے یہ کیوں کر زیبا ہے کہ اپنے مسلمان بھائیوں کو لوٹیں اور ایذائیں دیں؟ ہمارے پاس آ جائیں آپ کی زمینیں بھی واپس دلا دیں گے۔ اور بستی میں از سرِ نو آباد بھی کرا دیں گے

یہ دعوت نامہ پڑھتے ہی اس کی سوئی ہوئی اسلامی حمیت جاگ اٹھی اور وہ اپنے پچاس آدمیوں کو لے کر سید صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ تین گھوڑے، تین تلواریں اور تین بندوقیں بطور نذر پیش کیں۔ سیّد صاحب نے ایک سبز دوشالہ، بہت سے کپڑے اور نقد روپیہ دیا نیز اس کے تمام ساتھیوں کو ایک ایک دستار اور ایک ایک لنگی عطا کی۔ ان سب نے بیعت کر لی۔ پھر آپ نے ٹوپی کے رئیسوں کو بلا کر بھیلیہ کا معاملہ ان کے سامنے پیش کیا اور اس کے تمام حقوق دلا دیئے کھبل کے پاس ایک بے چراغ گاؤں تھا، جو ٹوپی، گندف اور گیارہ باڑہ والوں کی مشترکہ ملکیّت میں تھا۔ سید صاحب کے ارشاد پر سب نے وہ گاؤں بھیلیہ کو دے دیا۔ اس طرح ایک مسلمان گمراہی سے بھی محفوظ ہو گیا اور مسلمانوں کو اس کے شر سے بھی امن مل گیا۔

کچھ مدّت کے بعد بھیلیہ کو معلوم ہوا کہ سکھوں کی رسد سکندر پور سے دربند جا رہی ہے اس نے سید صاحب کے پاس حاضر ہو کر عرض کیا کہ اجازت ہو تو تماشا دکھاؤں میں رسد

کے قافلے پر حملہ کردں گا۔کسی امداد کی ضرورت نہیں، البتہ اگر کوئی خاص شکل پیش آجائے اور سکھوں کا دباؤ ہم پر بڑھ جائے تو توپیں چلاکر ہماری اعانت فرما دیجئے، چنانچہ وہ دریا سے پار اترا اور اپنے آدمیوں کو لے کر ایک نالہ میں بیٹھ گیا۔ سیّد صاحب نے چند غازیوں کو دیکھ بھال کے لئے عشرہ کے اوپر کوٹلے میں بٹھا دیا۔ جہاں سب کچھ نظر آتا تھا۔

رسد، بیلوں خچروں اور گدھوں پر لدی ہوئی تھی، اور اس کی حفاظت کے لئے پانسو سکھ ساتھ تھے۔ بھیلیہ نے اچانک گھات سے نکل کر حملہ کیا، چودہ سکھ مارے گئے، باقی رسد کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ پورا سامان بھیلیہ کے قبضے میں آیا۔

غازیوں کی پیہم اور مسلسل ترکتازیوں اور کامرانیوں نے سکھ سپاہیوں اور لشکریوں میں ایک قسم کی دہشت اور سراسیمگی پیدا کر دی تھی، کئی بڑے بڑے لشکر، نامور اور تجربہ کار سپہ سالاروں کی قیادت میں آئے۔ اور پٹ کر، لٹ کر، چوٹ کھا کر واپس گئے۔ ذنتورا جو فرانس کا باشندہ تھا اور جسے رنجیت سنگھ نے سکھ افسروں کی مرضی کے خلاف صرف اس لئے "سپریم کمانڈر" بنا دیا تھا کہ سکھوں کو جدید قسم کا طرزِ جنگ سکھائے دو مرتبہ مقابلہ پر لشکر لے کر آیا، لیکن ہمت نہ پڑی کہ ٹھہر سکتا، بغیر لڑے اور جنگ کئے، واپس چلا گیا۔ چنانچہ سکھوں میں عام طور پر یہ مشہور ہوگیا کہ یہ شخص "خلیفہ صاحب" (حضرت سیّد صاحب) سے در پردہ ملا ہوا ہے۔ یہ مسلم راج چاہتا ہے اور سکھ امپائر کا تختہ الٹ دینے کا متمنّی ہے ہری سنگھ نلوہ اور کئی دوسرے سکھ جرنیل بھی منہ کی کھا چکے تھے۔ غازیوں کے شب خون اور معرکہ آرائیوں نے ان کا حوصلہ پست کر دیا تھا۔

رنجیت سنگھ کو ابتدا میں خیال تھا کہ سیّد صاحب بھی ویسے ہی جاہ طلب آدمی ہیں۔ جیسے مغلوں کے زوال پر ہندوستان میں جابجا پیدا ہو گئے تھے اور ان میں سے

---

[۱۸۹] سیرت سیّد احمد شہیدؒ (غلام رسول مہر)

لوگ آباد تھے۔ جس زمانے میں لکھن سنگھ ہزارے کا گورنر تھا۔ بھیلیہ نے اس کی اجازت سے اس بیلہ پر ڈاکہ مارا۔ سکھ بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ مشوانیوں نے سخت مقابلہ کیا اور بھیلیہ کے ساتھیوں میں سے تقریباً اسّی آدمی مارے گئے۔ ان میں سے پندرہ سولہ سکھ بھی تھے مقتولوں میں بھیلیہ کا بھائی احمد علی بھی شامل تھا۔ لیکن بیلے اور بستی پر بھیلیہ کا قبضہ ہو گیا اور اس نے وہیں سکونت اختیار کر لی۔ اس جگہ سے وہ ٹوپی، مینئی، منارہ، کھیل اور راڈگر کے بڑے بڑے مواضع پر یورشیں کرتا رہتا تھا، جب سیّد صاحب امب تشریف لائے۔ تو لوگوں نے انتہائی پریشانی کے عالم میں اس کے تدارک کی درخواست کی۔

سیّد صاحب نے اسے ایک خط لکھا کہ آپ مسلمان ہیں، اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں آپ کے لئے یہ کیوں کر زیبا ہے کہ اپنے مسلمان بھائیوں کو لوٹیں اور ایذائیں دیں! ہمارے پاس آ جائیں آپ کی زمینیں بھی واپس دلا دیں گے۔ اور بستی میں از سرِ نو آباد بھی کرا دیں گے

یہ دعوت نامہ پڑھتے ہی اس کی سوئی ہوئی اسلامی حمیت جاگ اٹھی اور وہ اپنے پچاس آدمیوں کو لے کر سید صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ تین گھوڑے، تین تلواریں اور تین بندوقیں بطور نذر پیش کیں۔ سیّد صاحب نے ایک سبز دوشالہ، بہت سے کپڑے اور نقد روپیہ دیا نیز اس کے تمام ساتھیوں کو ایک ایک دستار اور ایک ایک لنگی عطا کی، ان سب نے بیعت کر لی۔ پھر آپ نے ٹوپی کے رئیسوں کو بلا کر بھیلیہ کا معاملہ ان کے سامنے پیش کیا اور اس کے تمام حقوق دلا دیئے کھبل کے پاس ایک بے چراغ گاؤں تھا، جو ٹوپی، گندف اور گیارہ باڑہ والوں کی مشترکہ ملکیت میں تھا۔ سید صاحب کے ارشاد پر سب نے وہ گاؤں بھیلیہ کو دے دیا۔ اس طرح ایک مسلمان گمراہی سے بھی محفوظ ہو گیا اور مسلمانوں کو اس کے شر سے بھی امن مل گیا۔

کچھ مدّت کے بعد بھیلیہ کو معلوم ہوا کہ سکھوں کی رسد سکندرپور سے دربند جا رہی ہے اس نے سید صاحب کے پاس حاضر ہو کر عرض کیا کہ اجازت ہو تو تماشا دکھاؤں میں رسد

کے قافلے پر حملہ کروں گا۔ کسی امداد کی ضرورت نہیں، البتہ اگر کوئی خاص شکل پیش آجائے اور سکھوں کا دباؤ ہم پر بڑھ جائے تو توپیں چلاکر ہماری اعانت فرما دیجئے۔ چنانچہ وہ دریا سے پار اترا اور اپنے آدمیوں کو لے کر ایک نالہ میں بیٹھ گیا۔ سیّد صاحب نے چند غازیوں کو دیکھ بھال کے لئے عشرہ کے اوپر کوٹھے میں بٹھا دیا۔ جہاں سب کچھ نظر آتا تھا۔

رسد، بیلوں خچروں اور گدھوں پر لدی ہوئی تھی، اور اس کی حفاظت کے لئے پانسو سکھ ساتھ تھے۔ بھیلیہ نے اچانک گھات سے نکل کر حملہ کیا: چودہ سکھ مارے گئے، باقی رسد کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ پورا سامان بھیلیہ کے قبضے میں آیا۔[1]

غازیوں کی پیہم اور مسلسل ترکتازیوں اور کامرانیوں نے سکھ سپاہیوں اور لشکریوں میں ایک قسم کی دہشت اور سراسیمگی پیدا کر دی تھی، کئی بڑے بڑے لشکر، نامور اور تجربہ کار سپہ سالاروں کی قیادت میں آئے۔ اور پٹ کر، لٹ کر، چوٹ کھا کر واپس گئے۔ ذنتورا جو فرانس کا باشندہ تھا اور جسے رنجیت سنگھ نے سکھ افسروں کی مرضی کے خلاف صرف اس لئے "سپریم کمانڈر" بنا دیا تھا کہ سکھوں کو جدید قسم کا طرز جنگ سکھائے دو مرتبہ مقابلہ پر لشکر لے کر آیا، لیکن ہمت نہ پڑی کہ ٹھہر سکتا، بغیر لڑے اور جنگ کئے، واپس چلا گیا۔ چنانچہ سکھوں میں عام طور پر یہ مشہور ہو گیا کہ یہ شخص "خلیفہ صاحب" (حضرت سیّد صاحب) سے درپردہ ملا ہوا ہے۔ یہ مسلم راج چاہتا ہے اور سکھ امپائر کا تختہ الٹ دینے کا متمنی ہے ہری سنگھ نلوہ اور کئی دوسرے سکھ جرنیل بھی منہ کی کھا چکے تھے۔ غازیوں کے شب خون اور معرکہ آرائیوں نے ان کا حوصلہ پست کر دیا تھا۔

رنجیت سنگھ کو ابتدا میں خیال تھا کہ سیّد صاحب بھی ویسے ہی جاہ طلب آدمی ہیں۔ جیسے مغلوں کے زوال پر ہندوستان میں جابجا پیدا ہو گئے تھے اور ان میں سے

---

[1] سیرت سیّد احمد شہیدؒ (غلام رسول مہر)

بعض نے ریاستیں بھی قائم کر لی تھیں، خود رنجیت سنگھ بھی انہیں میں سے تھا۔ اس وجہ سے اس نے سمجھ لیا کہ دو چار شکستوں کے بعد وہ دل برداشتہ ہو کر واپس چلے جائیں گے لیکن جب اس نے دیکھا کہ سیّد صاحب جس طرف جاتے ہیں فضا کو جلد از جلد ساز گار بنا کر زبردست جنگی محاذ پیدا کر لیتے ہیں نیز اسے غازیوں کی بے غرضی، شان ایثار اور راہ حق میں بے مثال شجاعت کا صحیح اندازہ ہو گیا تو اس نے صلح کے ذریعے سے سیّد صاحب کو رام کرنا چاہا۔ چنانچہ ایک فوج اکنور شیر سنگھ، ونتورا اور ایلارڈ کی سرکردگی میں علاقہ سرحد میں بھیج دی۔ اس کے ساتھ ہی ایک سفارت سیّد صاحب کی خدمت میں پہنچ گئی، جو وزیر سنگھ اور فقیر عزیزالدّین پر مشتمل تھی [۱]

مسلمانوں کے لشکر میں سکھوں کی آؤ بھگت اور خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا۔

اس سفارت کے ساتھ جو سکھ آئے وہ عام طور پر، اور وزیر سنگھ خاص طور پر حضرت سیّد صاحب کے اوضاع و اطوار، اور سیرت و شخصیت سے بے انتہا متاثر ہوا۔ اس نے اپنے رفیق کار فقیر عزیزالدین سے کہا۔

"میں نے دنیا والے دیکھے ہیں۔ ارباب دولت و ثروت بھی میری نظر سے گزرے ہیں تاجداروں اور فرمانرواؤں کے دربار میں حاضری کا موقع بھی مجھے ملا ہے

---

[۱] روایتوں میں ہے کہ وزیر سنگھ، رنجیت سنگھ کے اقربا میں سے تھا۔ فقیر عزیزالدین حضرت عبداللہ المومن انصاری کے اخلاف میں سے تھے۔ فقیر عزیزالدین، رنجیت سنگھ کے طبیب خاص، مشیر معتمد اور کفیل امور خارجہ تھے۔ ان کی گفتگو بڑی دلکش ہوتی تھی۔ ان کے دو حقیقی بھائی فقیر نورالدین اور فقیر امام الدین بھی سکھوں کے عہد میں بلند عہدوں پر فائز تھے۔ فقیر عزیزالدین کے دو صاحبزادے تھے، شہاب الدین اور چراغ الدین۔ (سیرت احمد شہید)

فاتح اور کشور کشا بھی میری نظروں کے سامنے ہیں، میں نے درباروں کا جاہ و جلال دیکھا ہے شہر یاروں کا طمطراق اور دبدبہ دیکھا ہے، خود عالی جاہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کب کسی سے کم ہیں، وہ فاتح ہیں اور فرماں روا بھی، لیکن جو بات ان فقیر سپاہیوں اور ان سپاہیوں کے سردار حضرت سید صاحب امیں میں نے دیکھی وہ کہیں نظر نہیں آئی۔ دل خود بخود ان کی طرف کھنچتا ہے ——

فقیر عزیزالدین نے جواب دیا۔

آپ بجا فرماتے ہیں۔ واقعی یہ اللہ والے لوگ ہیں۔

وزیر سنگھ:۔ ذرا دیکھئے تو، یہ لشکر دوسرے لشکروں سے کیسا مختلف ہے۔

فقیر عزیزالدین:۔ جی ہاں، بہت مختلف ہے۔

وزیر سنگھ:۔ ہمارے سپاہی وہ کون سا ناپاک مشغلہ ہے جس میں آلودہ نہیں؟ ہمارے لشکر میں کیا نہیں ہوتا؟ دوسری فوجوں اور لشکروں کی بھی یہی کیفیت ہے۔ وہاں راگ رنگ میں لوگ مست رہتے ہیں۔ زناکاریاں ہوتی ہیں، عیاشیاں ہوتی ہیں۔ تفریحیں ہوتی ہیں۔ ناچ ہوتا ہے۔ گانا ہوتا ہے ——————۔

فقیر عزیزالدین:۔ جی ہاں، سب کچھ ہوتا ہے، واقعی کیا نہیں ہوتا۔

وزیر سنگھ:۔ اور یہاں ——————؟

فقیر عزیزالدین:۔ اب تک تو کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی۔

وزیر سنگھ:۔ آ بھی نہیں سکتی۔ جہاں ہر وقت خدا کا چرچا رہتا ہو۔ جہاں کا ایک ایک سپاہی انتہائی خشوع و خضوع کے ساتھ نماز پڑھتا ہو۔ جہاں ایثار و قناعت کا یہ عالم ہو کہ نہ ساز و سامان موجود ہے، نہ دولت و ثروت، لباس میں پیوند لگا، سادہ، عبادت میں انہماک اور ولولۂ جہاد کا یہ عالم کہ اپنے سے کئی گنی زیادہ فوج سے لڑنے کو تیار، وقت کی بہت بڑی حکومت سے ٹکر لینے کو موجود

فقیر عزیزالدین :۔ (ہنستے ہوئے) جی ہاں عجیب کیفیت ہے ۔
وزیر سنگھ :۔ جب بھی میں سیّد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں یہی چاہا ہے کہ یہ دامن پکڑ لوں اور پھر کبھی نہ چھوڑوں ۔
فقیر عزیزالدین :۔ (حیرت کے ساتھ) یہ آپ کیا فرما رہے ہیں ؟
وزیر سنگھ :۔ میں غلط نہیں کہتا۔ واقعی میرے دل میں یہ جذبہ مچل رہا ہے ۔
فقیر عزیزالدین :۔ (گھبرا کر) خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کیجئے ۔ دیوار ہم گوش دارد ایسا نہ ہو یہ باتیں مہاراجہ کے کان تک پہنچ جائیں اور پھر لینے کے دینے پڑ جائیں ۔
وزیر سنگھ :۔ (بے پروائی سے) فقیر صاحب ! یہ آپ کیا فرماتے ہیں ۔ زندگی کی بہرحال ایک مدّت ہے ، اور وہ مدّت کچھ زیادہ طویل نہیں ۔ اس مختصر سی زندگی کے لئے دنیا کے پیدا کرنے والے کو بھول جانا اور اس کے حقیر بندوں کے سامنے سر جھکانا دانشمندوں کا شیوہ نہیں ۔
فقیر عزیزالدین :۔ جی ہاں ، یہ تو آپ بجا فرماتے ہیں ، لیکن اسے فراموش نہ کیجئے کہ آپ یہاں سفیر کی حیثیت سے آئے ہیں ، طالبِ حق کی حیثیت سے نہیں ۔
وزیر سنگھ :۔ آپ درست فرماتے ہیں ، میں اپنی اس حیثیت کو بھولا نہیں ہوں ۔
فقیر عزیزالدین :۔ پہلے سفارت کے فرائض انجام دے لیجئے ۔ پھر یہاں سے واپس جا کر جو چاہے کیجئے ۔
وزیر سنگھ :۔ ایسا ہی ہوگا ۔
فقیر عزیزالدین :۔ اب وقت ہوگیا ، ہمیں سید صاحب کی خدمت میں چلنے کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے ۔
وزیر سنگھ :۔ میں تیار ہوں ، لیکن گفتگو زیادہ تر آپ کریں گے ۔ میں صرف سنوں گا ۔
فقیر عزیزالدین :۔ واہ جناب ! یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟

وزیرسنگھ:۔ یہی ہوگا۔ میں سیّد صاحب کا جلوہ دیکھ کر اس درجہ متاثر ہو چکا ہوں کہ اگر بولا تو اپنی کی سی کہوں گا۔ آپ ہی سوچ لیجئے۔ اس کا انجام کیا ہوگا؟ اور جواب طلب ہوا تو آپ مہاراجہ سے کیا کہیں گے ——— ؟

فقیر عزیزالدین:۔ (مسکرا کر) آپ وہاں بھی خاموش ہی رہیں گے؟

وزیرسنگھ:۔ ہاں ——— اور اگر بولا تو میری گفتگو بہر حال آپ کے حسب منشا نہیں ہوگی ——— !

فقیر عزیزالدین:۔ بہت زیادہ پریشان ہو کر) بہت بہتر۔

اتنے میں مولانا اسمٰعیل اور چند دوسرے اکابر، سفارت کی پیشوائی یعنی سردار اور فقیر کو حضرت سیّد صاحب کی خدمت میں لے جانے کے لئے تشریف لے آئے

باب ۶۱

ایک سردار، ایک فقیر، ایک درویش

رنجیت سنگھ کے سفیروں کا یہ مختصر سا قافلہ حضرت سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا واقعی یہ عجیب سفارت تھی اور عجیب تر دربار۔

ایک بوریہ پردہ درویش باصفا بیٹھا تھا جس کا تکیہ صرف خدا پر تھا۔ نہ ساز و سامان جنگ پر تھا، نہ مال و دولت پر۔ اس کے سامنے ایک غاصب اور ظالم حکومت کے نمائندے بیٹھے تھے۔

بادشاہوں کے درباروں میں جب سفارتیں آتی ہیں تو انہیں مرعوب اور دہشت زدہ کرنے کے لئے بڑے جاہ و جلال اور طمطراق کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ لیکن اس دربار میں نہ جاہ و جلال کا مظاہرہ تھا، نہ طمطراق کی کیفیت، نہ وہ فوج و اسلحہ کی نمائش، نہ زرق برق لباس، نہ غلاموں کی صفیں، نہ کنیزوں کے پردے۔ نہ ساقی ہوش، نہ دور جام، نہ نقیب، نہ چوبدار، نہ حاجت نہ امراء و روسا کے دستے، نہ سپہ داروں اور سپہ سالاروں کا سا شکوہ و تجمل۔

سب سے پہلے فقیر عزیزالدین نے رنجیت سنگھ کی طرف سے کچھ تحائف نذر گزارے۔ پھر کہا۔

"میں اپنے بادشاہ کی طرف سے خیرسگالی کا پیام لایا ہوں۔"

حضرت سید صاحب:- یہ پیام ہم اس دن بھیج چکے ہیں، جس دن ہم نے اس سرزمین پر قدم رکھا تھا۔

فقیر عزیزالدین:- ہمارے مہاراجہ آپ کا بہت زیادہ ادب و احترام کرتے ہیں۔

حضرت سیّد صاحب:- ادب و احترام، نیاز و نیازکشی، بندگی اور عبودیت صرف ایک ہی ذات کے لئے سزاوار ہے، اور وہ ہماری اور آپ کی خالق، خدائے واحد و قادر و توانا کی ہستی ہے۔

فقیر عزیزالدین:- بجا ارشاد ہوا، بے شک اس کے سامنے ہم سب کی گردن جھکتی ہے۔

حضرت سیّد صاحب:- بس یہی اصل عبادت ہے۔

فقیر عزیزالدین:- ہمارے مہاراجہ کی خواہش ہے کہ ان کے اور آپ کے درمیان کسی طرح کی تلخی اور نقیض باقی نہ رہے۔

حضرت سیّد صاحب:- اس سے بڑھ کر کیا بات ہو سکتی ہے؟

فقیر عزیزالدین:- ہمارے مہاراجہ اس پر تیار ہیں کہ ماورائے سندھ کا پورا علاقہ آپ کے حوالہ کر دیں۔ بشرطیکہ اس پر قناعت کی جائے۔ اور دریا کے مشرقی و جنوبی کناروں کے علاقوں پر غازیوں کے حملے بند کر دیئے جائیں۔ مہاراجہ نے مجھ سے فرمایا ہے کہ میں آپ سے عرض کر دوں کہ آپ فقیر و درویش ہیں وہ امیر و تاجدار امیروں کا فرض ہے کہ وہ فقیروں اور درویشوں کی خدمت کریں۔ فقیروں کا فرض ہے کہ وہ ان کے لئے دعا کریں۔ اگر خلیفہ صاحب (حضرت سید صاحب) اس سے زیادہ کا قصد کریں گے تو حریص اور دنیا دار سمجھے جائیں گے[1]

حضرت سیّد صاحب خاموشی سے فقیر عزیزالدین کی باتیں سنتے رہے۔ پھر انہوں نے فرمایا۔

"آپ اپنے مہاراجہ سے کہہ دیجئے۔ ہمارا مقصد کشورکشائی اور جہاں بانی نہیں ہے

---

[1] سیرت سید احمد شہید (غلام رسول مہر)

نہ ہم بادشاہ اور حکمران بننے کا خواب دیکھ رہے ہیں ۔

فقیر عزیزالدین :۔ بے شک ، بے شک ۔

حضرت سیّد صاحب :۔ اگر مہاراجہ اسلام قبول کرلیں اور اسلامی حکومت اس خطّہ پر قائم کردیں تو میں اپنے تمام ساتھیوں کے ساتھ ان کے لشکر کا ایک ادنیٰ سپاہی بن جاؤں گا ۔

فقیر عزیزالدین :۔ یا حضرت ! یہ کس طرح ممکن ہے ؟

حضرت سیّد صاحب :۔ تو پھر ہم جنگ پر مجبور ہیں ۔ خواہ ہمارا ایک ایک آدمی کام آ جائے ۔ یہ بات کس طرح گوارا کی جاسکتی ہے کہ مسلمان غیر مسلموں کی غلامی کریں ۔ ان پر ظلم کئے جائیں اور ان کی مسجدوں کی بے حرمتی کی جائے ۔ ان کے جان و مال اور ناموس پر ڈاکے ڈالے جائیں اور ہم ماورائے سندھ کا علاقہ لے کر خاموش بیٹھ جائیں ۔ گویا ہمارا مقصد اپنا پیٹ بھرنا اور دولت دنیا حاصل کرنا ہے ، اسلام اور مسلمانوں کی خدمت نہیں ——————

فقیر صاحب ! یہ نہیں ہوسکتا ۔

فقیر عزیزالدین :۔ کاش کوئی صورت مفاہمت کی نکل سکتی ۔

حضرت سیّد صاحب :۔ مفاہمت اصولوں کو قربان کرکے نہیں کی جاسکتی ، نہ ایسی مفاہمت زیادہ عرصہ تک قائم رہ سکتی ہے ۔

فقیر عزیزالدین :۔ مہاراجہ کے سپہ سالار ونتورا اور ایلارڈ بھی اپنے لشکر کے ساتھ آئے ہوئے ہیں ۔

حضرت سیّد صاحب :۔ ہاں ہمیں معلوم ہے ۔ جس روز ہمیں سفارت کی اطلاع ملی تھی ، اسی دن لشکر کشی کا حال بھی معلوم ہوگیا تھا ، شاید مقصد یہ ہے کہ اگر سفارت ناکام ہو تو فوجی تاخت و تاراج اور پیش قدمی شروع کردی جائے ۔ بہرحال ہم ہر صورت

حال کا مقابلہ کرنے کو تیار ہیں۔

فقیر عزیزالدین :۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کی سفارت ڈنتوراسے مل لے ؟

حضرت سیّد صاحب :۔ اس سے کیا فائدہ مرتب ہوگا ؟

فقیر عزیزالدین :۔ صحیح پوزیشن واضح ہو جائے گی۔

حضرت سیّد صاحب :۔ کیا آپ یہاں سے واپس جاکر اپنے مہاراجہ کو صحیح حالات سے اطلاع نہیں دیں گے ؟

فقیر عزیزالدین :۔ ضرور دوں گا لیکن میں مہاراجہ تک دیر سے پہنچوں گا۔ ڈنتورا اور ایلارڈ یہیں ہیں۔ وہ اگر فوراً صورتِ حالات سے واقف ہو جائیں تو زیادہ بہتر ہوگا خود ڈنتورا کی بھی یہ تمنّا ہے کہ وہ آپ کے آدمیوں سے آپ کا صحیح نقطہ نظر معلوم کرلے۔

حضرت سیّد صاحب :۔ بہت بہتر، یہ بھی ہو جائے گا۔

باب ۶۴

دوٹوک

فقیر عزیزالدین اور وزیر سنگھ کی سفارت حضرت سیّد صاحب کے آستانہ سے رخصت ہوگئی۔ سیّد صاحب نے ان دونوں کو بڑے اعزاز و احترام کے ساتھ رخصت کیا۔ روایت ہے کہ وزیر سنگھ بعد میں سیّد صاحب کے پاکیزہ اوضاع و اطوار اور پاکیزہ افکار دیکھ کر مسلمان ہوگیا۔ البتہ مصلحتاً اس نے اپنا اسلام مخفی رکھا۔ پھر بھی اس کی یہ کیفیت تھی کہ ہر نازک موقع پر وہ سیّد صاحب کو خیر خواہانہ ضروری خبریں بھیجتا رہا۔ نیز اکاموکا آنے والے غازیوں کی بھی امداد کرتا رہا۔

سفارت کو رخصت کرنے کے بعد سید صاحب نے اپنی طرف سے مولوی خیرالدین شیرکوٹی اور حاجی بہادر شاہ کو وکیل بنا کر پنجتار بھیج دیا تاکہ وہاں سے سمہ جا کر شیر سنگھ، ونتورا اور ایلارڈ سے ملاقات کریں۔ خرچ راہ کے لئے انہیں دس روپے بیت المال سے دیئے گئے۔ آپ نے بڑی بڑی سفارتوں کے حالات پڑھے اور سُنے ہوں گے ان کے مقابلے میں سیّد صاحب جیسے درویش با صفا کی سفارت بہ ظاہر آپ کی نظروں میں کیا جچے گی۔ جس کے خرچ کے لئے کل دس روپے کافی سمجھے گئے۔ تاہم ان درویش سفیروں کی شانِ ادا فرائض سب سے ممتاز نظر آئے گی۔[1]

مولوی خیرالدین اور حاجی بہادر شاہ خاں نے پنجتار سے سلیم خاں پنج کر اپنی

---

[1] سیرت سید احمد شہید (غلام رسول مہر)

آمد کی اطلاع سکھ لشکر میں بھیج دی، وہاں سے پانچ سوار پیشوائی اور رہنمائی کے لئے آئے جب لشکر میں پہنچے تو ان کے لئے جو قیامگاہ تجویز ہو چکی تھی، وہاں اترے چاول، آٹا، گھی بکرا اور بیس روپے بطور دعوت ان کی خدمت میں پیش کئے گئے۔ دوسرے روز وزیر سنگھ انہیں ذنتورا اور ایلارڈ کے پاس لے چلنے کی غرض سے آیا۔ ذنتورا نے کہہ دیا تھا کہ سفیر چاہیں تو ہتھیاروں سمیت آئیں۔ اس ملاقات میں ایلارڈ کے علاوہ وزیر سنگھ اور فقیر عزیزالدین بھی ذنتورا کے پاس موجود تھے۔ ایک اخبار نویس اس غرض سے بلا لیا گیا کہ گفتگو کی تفصیل لکھتا جائے۔ ذنتورا بے تکلف فارسی بولتا تھا۔ اس نے سب سے پہلے پوچھا کہ آپ دونوں صاحبوں میں سے علوم دین کا زیادہ ماہر کون ہے؟ حاجی بہادر شاہ نے مولوی خیرالدین کی طرف اشارہ کیا، ذنتورا نے کہا کہ میں کچھ علمی گفتگو بھی کرنا چاہتا ہوں۔ مولوی خیرالدین بولے اگر دینی گفتگو منظور ہے تو سخت جواب سے رنجیدہ نہ ہوں، ذنتورا نے کہا کہ جو مناسب سمجھیں کہیں لیکن گفتگو عالمانہ ہونی چاہئے، میں خود بھی مذہب اسلام کا مطالعہ کر چکا ہوں اور اسلامی تاریخ کی کتابیں بھی دیکھ چکا ہوں[1] اس کے بعد یوں گفتگو ہوئی۔

ذنتورا: ہمارا ڈیرہ جب حضرو میں تھا تو ایک فقیر صورت آدمی ہمارے پاس آتا تھا، کہتا تھا کہ میں خلیفہ صاحب کا آدمی ہوں۔ اس نے تجویز پیش کی تھی کہ اگر مہاراجہ رنجیت سنگھ علاقہ یوسف زئی کی مالگذاری خلیفہ صاحب کی معرفت وصول کر لیا کریں تو فوج کشی کی ضرورت نہ رہے اور ملک تاخت و تاراج کا ہدف نہ بنے۔ یہ تجویز مجھے پسند آئی، اس لئے کہ اس میں فریقین کی بھلائی ہے۔ کیا یہ درست ہے؟

مولوی خیرالدین: یہ بالکل غلط ہے۔ معلوم نہیں وہ کون شخص تھا۔ اس نے افسوسناک سخن سازی

---

[1] روایتوں میں ہے کہ ذنتورا نوجوان تھا اور ایلارڈ قدرے معمر۔ دوران ملاقات میں وہ زیادہ تر خاموش رہا۔

سے کام لیا۔ ہمارے حضرت کو کفار کا فرمانبردار بننے اور انہیں مالیہ دینے سے کیا واسطہ؟ وہ ملک وجاگیر کے لئے اس دُور دشت سرزمین میں نہیں آئے۔

ونتورا:۔ اگر ملک وجاگیر کی طمع نہیں تو بے سروسامانی کے باوجود اس فرمانروا سے جنگ کا قصد کیوں رکھتے ہیں، جو خزائن وممالک کا مالک ہے اور جس کے جھنڈے تلے بہت بڑا لشکر جمع ہے۔

مولوی صاحب:۔ آپ نے سنا ہوگا کہ امیرالمومنین ہندوستان میں بڑی عزت وجاہت کے مالک ہیں، لاکھوں آدمی ان کے مرید ہیں۔ وہاں امیروں کی طرح عیش وآرام کی زندگی میسّر تھی، اسے چھوڑ کر پہاڑوں میں سرگردانی کی ضرورت نہ تھی۔ انہیں ہر قسم کی راحت حاصل تھی۔ حکام ان کی توقیر کرتے تھے۔ اس زندگی سے کنارہ کش ہوکر اس کوہستان کے اندر رات دن محنت ومشقت برداشت کرنا اور بے سروسامانی کے باوجود ایک قوی اور صاحبِ ملک وفوج دشمن کے مقابلے کا ارادہ رکھنا کسی عقلمند کے نزدیک بھی بے سبب نہیں ہوسکتا۔ جہاد ایک مشکل تر عبادت ہے یہ عبادت محض مال کی کثرت کے بل پر بھی ادا نہیں ہوسکتی۔ ہاں اللہ تعالےٰ کی توفیق شامل حال ہو تو سب کچھ ممکن ہے۔ مشکلات کی وجہ سے عبادتِ جہاد کا ثواب بھی سب سے زیادہ ہے۔ اس لئے کہ اس عبادت میں جان ومال وعیال سے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔

ونتورا:۔ بے شک۔

مولوی صاحب:۔ ہمارے حضرت خدا کی عنایت سے بارگاہِ الٰہی کے مقبول صاحب ارادہ اور اولوالعزم ہیں، چاہتے ہیں کہ اس عبادت کو بھی ادا فرمائیں۔ اس کی دو شرطیں ہیں، اول وجود امام جسے عرف میں سردار کہا جاتا ہے، دوم جائے امن ہندوستان میں جائے امن نہ تھی۔ سنا جاتا ہے کہ قوم یوسف زئی کو سکھوں سے

جہاد درپیش ہے اوران کے پاس سردار نہیں۔ لہٰذا ہمارے حضرت چھ سو آدمیوں کے ساتھ یہاں تشریف لے آئے۔ یہاں کے مسلمانوں کو ترغیب و تحریص سے اس کار خیر پر آمادہ کیا حضرت کے دست مبارک پر بیعت امامت ہوئی۔ اسی دن سے سب آپ کو امام، امیرالمومنین یا خلیفہ کہنے لگے۔

یہ بھی سمجھ لیجئے۔ کہ جہاں مطلب جنگ اور ملک گیری نہیں۔ اس لفظ کے معنی ہیں۔ اپنی طاقت و قوت کے مطابق اعلاء کلمۃ اللہ میں سعی و کوشش یہ بھی ضروری نہیں کہ امام کا سامان اعدا کے برابر ہو، ہاں یہ ضروری ہے کہ دین کی ترقی میں انتہائی سعی کی جائے اس سلسلے میں اگر جنگ بھی پیش آجائے اور مصلحت کا اقتضا یہی ہو تو حرب و ضرب سے بھی توقف نہ کیا جائے۔ لیکن اصل مطلب محض ترقی دین ہے۔ فتوحات اس کا محض ثمرہ ہیں سب سے بڑی فتح یہی ہے کہ انسان زندگی بھر مجاہد فی سبیل اللہ بنا رہے، غازیوں کے درجے قرآن مجید میں واضح کر دیئے گئے ہیں۔ اگر وہ شہید ہو جائیں تو اس رتبے تک پہنچ جاتے ہیں کہ رسالت کے بعد اس سے بڑا رتبہ کوئی نہیں۔ اگر فتح پائیں اور ملک ہاتھ آئے تو نور علی نور۔

ونتورا:۔ بے شک آپ کے مذہب میں جہاد اور شہادت کا مرتبہ بہت اونچا ہے۔

مولوی صاحب:۔ یہ عجیب بات ہے "آپ کے مذہب" کی قید کا کیا مطلب؟ کہنا چاہئے کہ اس عبادت کا درجہ سب پیغمبروں کے نزدیک بہت اونچا ہے۔

ونتورا:۔ میں مانتا ہوں۔ لیکن یہ بات خلاف عقل ہے کہ ایک ایسا آدمی یہ ارادہ کرے جس کے پاس نہ فوج ہے، نہ توپیں ہیں، نہ مال و متاع ہے، نہ ملک ہے۔

مولوی صاحب:۔ اہل دنیا کو فوجوں، توپوں اور خزانوں پر اعتماد ہے۔ ہمارا بھروسہ صرف خدائے قادر و توانا کی قدرت و قوت پر ہے۔ نہ ہمیں فتح کا دعوے ہے اور نہ شکست کا غم، یہ دونوں چیزیں خدائے قادر کے ہاتھ میں ہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے

کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللہ۔ (بسا اوقات چھوٹے گروہوں نے خدا کے حکم سے بڑے گروہوں پر غلبہ پایا) اگر آپ کو اس سے انکار ہے تو تاریخ دانی کا دعویٰ غلط ہے۔

ایلارڈ:۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ بے سروسامان اور بے سلاح ارباب سلاح پر غالب آجائیں

دنتورا:۔ (ایلارڈ سے) مولوی صاحب سچ فرماتے ہیں کہ بڑے چھوٹوں کے ہاتھ سے بھی تباہ ہوتے رہے۔

(پھر دنتورا مولوی صاحب سے مخاطب ہوا) ہم بات کچھ کہہ رہے تھے (بیچ میں اور ذکر چھڑ گیا۔ ہمیں خلیفہ صاحب سے محبت ہے۔ جس کی وجہ سے سرکار خالصہ میں بدنام ہو گئے ہیں۔ یہ محبت جنگ کے موقع پر کسی کام نہ آئے گی۔

مولوی صاحب:۔ یہ درست ہے کہ آپ اپنی سرکار میں نمک حرام ٹھہریں گے۔

دنتورا:۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ ہمارے اور خلیفہ صاحب کے درمیان تحائف و ہدایا کی رسم جاری ہو جائے۔ پہلے میں کوئی چیز بھیجتا ہوں، پھر خلیفہ صاحب بھیجیں تاکہ مجھے واپس جانے کے لئے عذر ہاتھ آجائے۔ پھر خلیفہ صاحب یوسف زئیوں کے باب میں جو چاہیں کریں۔ اس ملک پر خالصہ فوج نہیں آئے گی۔

مولوی صاحب:۔ ہمارے حضرت صاحب کو آپ کی دوستی اور محبت سے کوئی غرض نہیں اگر آپ کو غرض ہے تو پہلے خود سلسلہ جنبانی کریں۔ ہمارے حضرت بڑے عالی حوصلہ اور بلند ہمت بزرگ ہیں۔ آپ کے تحائف کے معاوضے میں ضرور تحائف بھیجیں

لے سکھوں کا عام دستور تھا کہ اہل سرحد سے گھوڑے باز اور شکاری کتے خراج میں لیتے تھے اور گھوڑا دے دینے کو نشان اطاعت سمجھا جاتا تھا۔ دنتورا لطائف الحیل گھوڑا لیکر سید صاحب کو دربار لاہور کا مطیع ثابت کرنا چاہتا تھا۔ مولوی صاحب پر یہ حقیقت آشکارا تھی۔

گے۔ نگران کی سرکار کے تحفے کیا ہیں؟ کسی کو سر بند یا کلاہ یا جبہ عنایت فرمادیا۔ حضرت کے پاس عمدہ ہتھیار بھی ہیں، ممکن ہے کوئی ہتھیار بھیج دیں۔

ذنتورا:- ہمیں سر بند و کلاہ و سلاح کی حاجت نہیں، ہاں گھوڑا مرحمت فرمائیں تو بات بھی ہے

مولوی صاحب:- میں آپ کا مطلب سمجھ گیا، گھوڑا ہم کبھی نہ دیں گے لے

ذنتورا:- اپنی طرف سے انکار نہ کیجئے۔ خلیفہ صاحب کو لکھیے، وہ بڑے عاقل اور معاملہ فہم ہیں۔ امید ہے اس بات کو خوشی سے مان لیں گے۔

اس موقع پر فقیر عزیزالدین اور حاجی بہادر شاہ خاں نے بھی مولوی خیرالدین سے کہا کہ جرنیل صاحب کی یہ تجویز مان لینے میں مضائقہ نہیں، لیکن مولوی صاحب بولے۔

"جو شخص ملک و جاگیر کا طلب گار ہو اس کے لئے یہ چیز اچھی ہوگی۔ جو اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جہاد کی نیت سے نکلا ہے اس کے لئے یہ بہت بڑی ہے چنانچہ جو شخص نماز، روزہ یا دوسرے نیک کام محض خلق خدا میں نیک نامی حاصل کرنے کی غرض سے کرتا ہے، وہ کام اس شخص کے لئے عذاب و خسران کا باعث بن جاتے ہیں اسی طرح جہاد بھی فسادِ نیت سے وبال ہو جاتا ہے۔ میں حضرت کو ایسی بات لکھ نہیں سکتا۔ اس نیت میں ہم اور حضرت یکساں ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہم نے انھیں امام بنایا ہے۔ اور امام کے بغیر جہاد نہیں ہو سکتا، لیکن جو شے ثواب جہاد میں فساد کا باعث ہے اس سے انکار میں ہم اور حضرت برابر ہیں۔

ذنتورا نے دو تین مرتبہ اصرار کیا، مولوی صاحب بولے کہ اصرار بے سود ہے۔ ہم آپ کو گھوڑا کیا گدھا بھی نہیں دے سکتے۔ آپ سے خراج و جزیہ لینے کا ارادہ کئے

(بقیہ حاشیہ) اس لئے بہ شد و مد انکار کیا۔ باڑے کے چاول بہت مشہور تھے، سکھ یہ چاول بھی کثیر مقدار میں درانی سرداروں سے سال بہ سال وصول کرتے تھے۔

بیٹھے ہیں، آپ کو کس طرح دیں ؟

ذ تورا :- اچھا اگر خلیفہ صاحب باوجود بے سروسامانی مہاراجہ جیسے صاحب لشکر و جاہ کے مقابلے میں کامیاب ہو جائیں گے تو ہم ان کی اطاعت قبول کر لیں گے۔ جو کچھ آپ نے ہمارے سامنے بیان کیا ہے ، کیا آپ ہمارے کنور صاحب (شیر سنگھ) کے سامنے بھی بیان فرمائیں گے ؟

مولوی صاحب :- انشاء اللہ تعالیٰ مع شے زائد۔

مولوی صاحب سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مفصل گفتگو سنائی جب اس بات پر پہنچے کہ ہم گھوڑا کیا گدھا بھی نہیں دیں گے تو سید صاحب نے خوش ہو کر فرمایا۔ اسی غرض سے میں نے آپ کو بھیجا تھا۔ دوسرے شخص سے ایسی صاف گوئی ممکن نہ تھی [1] .

---

[1] حیات سید احمد شہید (غلام رسول مہر)

باب ۶۴

فتح شکست سے بدل گئی

مسلمانوں کی ناکامیوں کا اگر سراغ لگایا جائے تو ضرور ان کی تہ میں مسلمانوں ہی کی غداریاں، قوم فروشیاں اور خود غرضیاں نظر آئیں گی۔

کہ بامن آنچہ کرد آں آشنا کرد

عالم اسلام کی سب سے بڑی تحریک جہاد خود مسلمانوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوئی۔ اس تحریک کو ناکام بنانے کا عزم لے کر خود مسلمان اٹھے اور کامیاب ہوئے، واقعی یہ کتنا بڑا کارنامہ تھا جو انہوں نے انجام دیا، جو آج تک تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے اس پر ہمیشگی کی مہر ثبت ہو چکی ہے، اب کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتا۔ کبھی نہیں۔

بیعت امامت کے بعد سرحد کے خوانین، روسا اور عوام نے گروہ در گروہ اور فوج در فوج بیعت جہاد شروع کر دی تھی، وہ سکھوں کی ترکتازیوں سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ ان کے گاؤں وقتاً فوقتاً نذر آتش ہوتے رہتے تھے۔ خود انہیں آئے دن گھر بار چھوڑ کر بال بچوں سمیت پہاڑوں میں پناہ لینی پڑتی تھی، اس حالت اضطراب کو ختم کرنے کی شکل یہی تھی کہ وہ جم کر سکھوں کا مقابلہ کرتے اور ثبات و استقامت سے ان کی قوت پر کاری ضرب لگاتے۔ اس غرض کے لئے ایک مرکز درکار تھا، سید صاحب کی ذات بابرکات سے یہ ضرورت پوری ہو گئی تو وہ اطراف واکناف سے آ آ کر بیعت کرنے لگے بیعت کے بعد ہر شخص زبان حال سے یہ ترانہ گاتا تھا۔

باسبک روحال بر امیدِ شہادت زندہ ایم
پیش ما ذکرِ حیاتِ جاوداں باشد گراں

سردارانِ پشاور میں سے سلطان محمد خاں اور سید محمد خاں پہلے سید صاحب کی بیعت کر چکے تھے۔ یار محمد خاں اور پیر محمد خاں کی طرف سے اب اطاعت و فرمانبرداری کی عرضیاں پہنچیں۔ یار محمد خاں کے بارے میں سب کی رائے بالاتفاق یہ تھی کہ غدر و خیانت اس کا عام شیوہ ہے، لیکن سید صاحب نے فرمایا، جب یہ شخص ہماری شرکت کا دم بھرتا ہے تو ہمیں اس پر بھروسا کرنا چاہیے۔ دل کا حال خدائے علیم کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ یار محمد خاں کے متعلق اہلِ سرحد کی رائے بالکل درست تھی۔

درحقیقت سید صاحب جانتے تھے کہ اہل سرحد عموماً تذبذب اور بے یقینی کے مرض میں مبتلا ہیں۔ یہ مرض سکھوں کے مقابلے میں احساس کمتری سے پیدا ہوا تھا اور احساس کمتری اسی صورت میں زائل ہو سکتا تھا کہ سرحدیوں کی قوت کو منظم کر کے سکھوں پر کاری ضربیں لگائی جائیں۔ جہاد میں ابتدائی فیروزمندی کے بعد غدر و خیانت کے امکانات خود بخود کم ہو جاتے۔

اطاعت و رفاقت کا عہد لینے کے بعد سردارانِ پشاور نے لشکر اور توپ خانے کے ساتھ پشاور سے نوشہرے کا رُخ کیا۔ جب "سرائی" پہنچے، جہاں سے نوشہرہ پانچ کوس رہ جاتا ہے تو ہنڈا اطلاع بھیجی، سید صاحب نے پانسو آدمی ساتھ لئے اور سرداران کی ملاقات کے لئے نوشہرے پہنچ گئے۔ اسی ملاقات میں فیصلہ ہوا کہ متحدہ قوت سے سکھوں پر یورش کی جائے۔

ان دنوں ہندوستانی غازیوں کے لشکر میں سامانِ معیشت کی بے حد قلت تھی۔ سید صاحب نے چلتے وقت جو روپے ساتھ لئے تھے، وہ ختم ہو چکے تھے، جن رقموں کا انتظار تھا وہ پہنچی نہ تھیں۔ کسی پر بوجھ ڈالنا سید صاحب کی عادت شریف طبیعت اور

شانِ تربیت کے خلاف تھا۔ کبھی کبھی ضرورت کے مطابق کھا نا مل جاتا۔ اکثر فاقے کرنے پڑتے یا ساگ پات کھا کر گزارہ کر لیا جاتا[۱] یہ حالت عسرت کئی مہینے جاری رہی۔ لیکن سب بالکل مطمئن تھے۔ کسی کی زبان پر حرفِ شکایت نہ آیا۔

سیّد صاحب ہنڈی میں تھے کہ بدھ سنگھ کی طرف سے ایک خط ملا جس میں حضرو پر چھاپے کے متعلق طعن و تعریض سے کام لیا گیا تھا۔ خط سے صاف ٹپکتا تھا کہ اکوڑے اور حضرو کی تاختوں نے بدھ سنگھ کو سراسیمہ کر دیا تھا اور سراسیمگی نے طعن و تعریض کا جامہ پہن لیا۔ سید صاحب نے ۱۵ جمادی الثانی ۱۲۴۲ھ (۱۴ جنوری ۱۸۲۷ء) کو اس خط کا جواب بھیجا۔ یہ جواب بھی سید صاحب کے مقاصد و عزائم کا ایک نہایت عمدہ مرقع ہے، فرماتے ہیں کہ۔

دین محمدی کی نصرت کے لئے جو کوشش جس صورت میں ممکن ہوگی ضرور بجا لاؤں گا اور جس تدبیر کو بھی مفید پاؤں گا، اسے لازماً اختیار کروں گا۔

مجھے نہ بہادری جتانا مقصود ہے، نہ ریاست حاصل کرنا چاہتا ہوں اس کا ثبوت یوں مل سکتا ہے کہ سکھوں کے بڑے بڑے سرداروں اور رئیسوں میں سے جو شخص دین محمدی کو قبول کرے، میں سو زبان سے اس کی مردانگی کا اعتراف و اظہار کروں گا اور ہزار جان سے اس کی سلطنت کی ترقی چاہوں گا۔"

بیعت امامت کے بعد کم و بیش دو مہینوں میں اسّی ہزار سرحدی عوام جہاد کے لئے فراہم ہو گئے۔ سردارانِ پشاور کا لشکر اس سے الگ تھا۔ اس کی تعداد بیس ہزار بتائی جاتی تھی۔ دوسرے خوانین و رؤسا نے بھی سعی فرمائی۔ جن میں سے امیر احمد خاں باجوڑی

---

[۱] منظورہ میں ہے: "گاہے نوبت بہ سیری می رسید والا اکثر بہ فاقہ می گزشت یا بخوردن حشیشات وذرہ قناعت میکردند" (سیّد احمد شہید)

کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ان میں سے ہر گروہ کا نشان الگ الگ تھا اور بڑے بڑے نشان ایک ہزار سے کم نہ ہوں گے۔ سیّد صاحب کے اپنے ڈیروں کی نگرانی کے لیے چوکیدار مقرر کئے۔ مارچ کے پہلے ہفتے میں نوشہرہ پہنچ گئے، جہاں سے بدھ سنگھ پر یورش منظور تھی وہ شیدو میں خیمہ زن تھا جو اکوڑے سے چار میل جنوب میں ہے۔ بدھ سنگھ کے پاس سازوسامان بہت زیادہ تھا۔

شیدو صوبہ سرحد کا مشہور گاؤں ہے۔ اکوڑے سے قریباً چار میل جنوب میں ہے یعنی اٹک کی سمت میں جرنیلی سڑک کے پاس مشرقی سمت میں ہے۔ اسی جانب تھوڑے فاصلے پر دریائے لنڈے بہتا ہے۔ ریل کی لائن مغربی سمت میں ہے۔

گاؤں کے مغرب میں میل ڈیڑھ میل پر خٹک کی پہاڑیاں ہیں، ان کے دامن سے لے کر دریا تک زمین برابر ڈھلان ہوتی چلی گئی ہے۔ جابجا نالوں کے بہاؤ ملتے ہیں جو پہاڑیوں کی سمت سے آکر دریا میں ملتے ہیں۔ برسات ہو جائے تو ان کے زور سے پانی بہنے لگتا ہے، لیکن جلد خشک ہو جاتا ہے۔

سکھوں کی لشکر گاہ گاؤں کے جنوب مغرب میں تھی۔ لشکر گاہ کے ارد گرد حفاظت کے لئے خاردار جھاڑیوں سے سنگھر بنالی گئی تھی۔

سرداران پشاور پہلے سے دریا کے مغربی کنارے پر تھے۔ ادھر ہی سے سکھوں میں پیش قدمی کرنا کرنا منظور تھا۔ اہل سرحد کے لشکر بھی دریا کو عبور کر کے ادھر ہی پہنچ گئے۔ اور درانی لشکر کے قریب ڈیرا جمالیا۔ سیّد صاحب بھی اپنے غازیوں کے ساتھ ادھر چلے گئے۔

آپ کے لئے دونوں وقت کا کھانا اور میوہ یار محمد خاں بھیجتا تھا۔ گلباز خاں سردار کی طرف سے مہانداری کا منتظم تھا۔ وہی کھانا خوانوں میں لگا کر لاتا۔

پڑاؤ پر پہنچتے ہی باہم مشورہ کر کے فیصلہ کر لیا گیا کہ صبح کو لڑائی ہو گی صبح جنگ سے پیشتر کی رات کو سردار کے ہاں سے کھچڑی اور گنڈیریاں آئیں۔ سیّد صاحب نے کھچڑی کھائی اور چند گنڈیریاں چوسیں۔ کچھ دیر بعد طبیعت بگڑ گئی۔ اچانک غشی طاری ہو جاتی۔

کسی وقت افاقہ معلوم ہوتا۔ رات میں تکلیف بڑھ گئی۔ قے اور استفراغ شروع ہو گئے دو تین گھڑی رات رہے لڑائی کی تیاری کا نقارہ بجا اور مولانا اسمٰعیل سیّد صاحب کے خیمے میں آئے تو آپ کو بے ہوش پایا۔ جب ذرا افاقہ ہوا تو عرض کیا کہ لڑائی کے لئے نکلنے کا وقت آ گیا۔ سردار یار محمد خاں نے آپ کی سواری کے لئے ہاتھی بھیجا ہے فرمایا ہمارا سفید گھوڑا جو فتح خاں پنجتاری نے ہم کو دیا ہے، شادل خاں کنج پوری سے کہو کہ اس پر سوار ہو کر فتح خاں کے پاس جائیں باقی ہندوستانی سب کے سب ہمارے ساتھ رہیں۔

سید صاحب چونکہ بار بار بے ہوش ہو جاتے تھے، اس لیے سوار ہونے میں توقف ہوا۔ اس اثنا میں یار محمد خاں کی طرف سے پے در پے قاصد آتے رہے تکلیف ہی کی حالت میں آپ ہاتھی پر سوار ہوئے۔ مولانا اسمٰعیل ساتھ ہودے میں بیٹھے، اس لئے کہ سید صاحب کی طبیعت بہت خراب تھی۔

سکھ لشکرگاہ اور اسلامی جیوش کے درمیان ایک خشک نالہ تھا۔ سکھوں نے توپیں لشکرگاہ میں مناسب جگہ پر نصب کر رکھی تھیں اور ان کے چند جیشوں نے آگے بڑھ کر نالے میں چار مورچے بنا لئے تھے۔ لڑائی شروع ہوتے ہی ان مورچوں سے اسلامی لشکر پر گولیاں برسنے لگیں اور لشکرگاہ سے توپوں کے گولے دنادن آنے شروع ہو گئے۔

سلطان محمد خاں، پیر محمد خاں پنجتاری اور دوسرے مجاہدوں نے جو گھوڑوں پر سوار تھے باگیں اٹھائیں اور بجلی کی سرعت سے نالے والے مورچوں پر حملہ آور ہوئے امیر احمد خاں باجوڑی سید صاحب سے بہت قریب تھا۔ اس نے پانسو سواروں اور پیادوں کو تیار کیا اور سیّد صاحب سے یورش کی اجازت چاہی۔ آپ نے فرمایا فی امان اللہ غرض اس یورش سے نالے کے سارے مورچے فتح ہو گئے۔ زیادہ تر سکھ سپاہی مارے گئے۔ باقی جانیں لے کر فرار ہو گئے اسلامی لشکر ایک بڑی آفت سے محفوظ ہو گیا اس

مدت میں یار محمد خاں لشکریوں سمیت چپ چاپ اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ نہ یورش میں شریک ہوا نہ لڑائی میں کوئی حصّہ لیا۔

جو سکھ نالے کے مورچے چھوڑ کر بھاگے تھے، وہ پیچھے ہٹ کر ایک اور جگہ اوٹ میں کھڑے ہو گئے۔ سمہ کے غازیوں نے اس جگہ پر بھی ہلہ بول دیا اور سکھوں کو جاروب کی طرح صاف کرتے ہوئے سکھ لشکرگاہ میں گھس گیا۔ غازیان سمہ اور گوجڑی شہزادے کی یورش نے سکھوں میں ہلچل مچا دی اور ان کی توپیں بھی بند ہو گئیں۔ اب بہ ظاہر اسلامیوں کی فتح میں کوئی شبہ باقی نہ رہا تھا۔ بلکہ ایک شخص نے سید صاحب کو فتح کی مبارکباد بھی دے دی۔ سید صاحب کی کیفیت وہی تھی کہ کبھی ہوش آ جاتا، اکثر بے ہوش رہتے، مولانا اسمٰعیل ان کی دیکھ بھال میں اس درجہ مصروف تھے کہ انہیں لڑائی کے دم بہ دم حالات کا بھی پورا علم نہ تھا۔

مقدمات فتح نمایاں ہو چکے تھے کہ سردار یار محمد خاں کی ایک رنج افزا حرکت نے اچانک فتح کو مصیبت خیز شکست میں بدل دیا۔

یار محمد خاں کے لشکر سے دو آدمی سکھوں کی طرف آئے۔ بات کر کے واپس گئے تو یار محمد خاں نے باگ اٹھائی اور چل دیا۔ اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ یار محمد خاں نے لڑائی میں قطعاً حصّہ نہ لیا، پھر جب سکھوں کی جمعیت ریزہ ریزہ ہو رہی تھی تو اس بے درد نے راہ فرار اختیار کی۔ اس کے عسکری بھی ساتھ ہی کافور ہو گئے۔

محض یہی نہیں بلکہ ایک یا ایک سے زیادہ آدمیوں نے اس فرار کے خوب اشاعت کی مختلف لشکریوں میں پھر پھر کر اور پکار پکار کر اعلان کیا کہ یار محمد خاں بھاگ گیا۔ یہ سنتے ہی سلطان محمد خاں اور پیر محمد خاں بھی اپنے لشکروں سمیت بے تحاشا اٹھ دوڑے غازیان سمہ نے یہ شور سنا تو سوچے سمجھے بغیر انہوں نے بھی راہ گریز اختیار کی، پھر پریشانی اور بے ترتیبی کا یہ عالم تھا کہ جس نے فرار کا لفظ سنا اٹھ بھاگا اور جس طرف رُخ ہوا نکل گیا

جو غازی یورش کر کے سکھ لشکرگاہ تک چلے گئے تھے یا خاربندی سے گزر کر لشکرگاہ کے اندر پہنچ گئے تھے، انھوں نے اپنے پیچھے فرار کا نقشہ دیکھا تو حیران رہ گئے۔ انہیں قطعاً معلوم نہ تھا کہ کیا صورت پیش آئی۔ اسی عالم حیرت میں وہ پیچھے ہٹے سکھوں کے ایک جیش نے درانیوں کا تعاقب کیا دوسرے نے سمہ والوں کا پیچھا کیا، باقی کوئی گروہ کہیں نہ ٹھہر سکا۔ صرف گوڈڑی شہزادے نے بھاگنا گوارا نہ کیا۔ سکھ لشکرگاہ سے پیچھے ہٹ کر شیدو گاؤں میں مورچہ قائم کر لیا۔ سکھوں نے پورا زور لگایا لیکن بہادر شہزادے نے مقابلہ نہ چھوڑا۔ جب شیدو پر سکھوں کا ہجوم بہت بڑھ گیا تو لڑتا ہوا قدم بہ قدم گاؤں سے باہر نکلا۔ ایک ایک ساتھی شہید ہوتا رہا اور شہزادہ پیچھے کی طرف ہٹتا گیا۔ جب قبرستان میں پہنچا تو خود بھی خون شہادت میں تیرتا ہوا مالکِ حقیقی کے دربار میں پہنچ گیا۔ اس نے ڈیڑھ دو مہینے پیشتر سید صاحب کی بیعت کی تھی تو کہا تھا کہ آپ کو چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں گا۔ شیدو کے میدان میں اس صادق العہد نے اپنے اس پیمان پر خونِ شہادت سے مہر لگا دی۔

یار محمد خاں کی بدعہدی اور غداری کوئی مشکوک واقعہ نہیں۔ ایک ثابت حقیقت ہے وہ سکھوں سے مل گیا تھا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ سکھوں سے ساز باز کر کے مسلمانوں کو نیست و نابود کر دے گا۔

رنجیت سنگھ نے بھی سلاطین کی طرح اپنے دربار کا روزنامچہ مرتب کرنے کا حکم دیا تھا یہی روزنامچہ بعد میں عمدۃ التواریخ کے نام سے چھپا۔ اس میں ہے۔

منقول السنۂ باشندگان آں روئے آب اٹک است کہ عالی جاہ یار محمد خاں، پاسِ ارتباط و اتحاد اسرکار دولتمدار رنجیت سنگھ، در حین اشتعال نوائرِ جدال و قتال احمد شاہ

اٹک پار کے لوگوں کا بیان ہے کہ جب جنگ کی آگ بھڑکی تو یار محمد خاں نے رنجیت سنگھ کے ساتھ ربط و اتحاد پیشِ نظر رکھتے ہوئے سید صاحب کو زہر دے

راشربت شیریں سم قاتل نوشانیدہ قرار بفرار　　دیا اور خود بھاگ نکلنے کی ٹھان لی ۔ اس
دادند و تمامی لشکریاں نیز بہ متابعت او　　کا لشکر بھی ساتھ ہی فرار ہوگیا ۔
پرداختند[1] ۔

زہر دینے کا واقعہ ثابت ہوجانے کے بعد بتانے کی ضرورت نہیں رہتی کہ یہ سب کچھ سکھوں کے ساتھ ساز باز کے بعد عمل میں آیا درحقیقت ساز باز لڑائی شروع ہونے سے پیشتر پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا ۔ اسی وجہ سے یار محمد خاں نے میدانِ جنگ میں ایسے مقام پر فوج کھڑی کی جہاں سے وہ بہ سہولت تمام فرار ہوسکتا تھا ۔ نیز جنگ میں اس نے کوئی حصہ نہ لیا ۔

سید صاحب یہ غرض لے کر نوشہرہ پہنچے تھے ۔ کہ آگے بڑھ کر اٹک کا محاصرہ کریں ۔ لیکن ہری سنگھ نے بدھ سنگھ کو بھاری فوج دے کر مجاہدین کے مقابلے کے لئے شیدو بھیج دیا اور خود بیس ہزار آدمیوں کے ساتھ دریائے سندھ پر موجود رہا ۔

سید صاحب نے بدھ سنگھ کی فوج کو گھیر کر سخت بدحال کر دیا ۔ آخر وہ لڑنے کے لئے تیار ہوگیا ۔ اس نے درانی سرداروں کو بتا دیا کہ اگر سید صاحب کی اعانت سے الگ تھلک رہو گے تو تمہارے علاقوں پر قبضہ نہیں کیا جائے گا یہ بھی بتا دیا کہ رنجیت سنگھ خود آرہا ہے اگر سید صاحب کا ساتھ دیا اور لڑائی میں حصہ لیا تو تمہارا جو حشر ہوگا وہ کسی شرح کا محتاج نہیں ۔

سرداروں پر جن کا سرخیل یار محمد خاں تھا اس انتباہ کا خاطر خواہ اثر ہوا ۔ وہ لڑائی کے شروع ہوتے ہی بھاگ نکلے ۔ یار محمد خاں سب سے آگے تھا اس غدر و خیانت نے مطلوب نتیجہ پیدا کر دیا ۔ سکھ سپاہیوں نے مسلمانوں کو بھاری نقصان پہنچا کر

---

[1] عمدۃ التواریخ دفتر دوم ص۲۱۱ (سید احمد شہید)

شکست دی[۱]۔

لیکن یار محمد خاں کو اس غداری سے کوئی فائدہ نہ پہنچا۔ رنجیت سنگھ نے خراج کی رقم دگنی کر دی۔ مسجدوں کی بے حرمتی کی، ملک کو لوٹا اور آخر کار وہ یار محمد خاں کے بیٹے کو یرغمال میں لے کر واپس ہوا[۲]

یہ فتح سکھ دربار کے نزدیک اتنی عظیم الشان تھی کہ اس کی خوشی میں توپیں سر کی گئیں

چراغاں در لاہور و تمامی ممالک محروسہ شد و سرکار والا ہزار ہا بر محتاجین و فقرا ایثار کردہ جشن شاہانہ فرمودند[۳]

لاہور اور تمام سکھ مقبوضات میں چراغ جلائے گئے، رنجیت سنگھ نے ہزاروں روپے محتاجوں اور فقیروں میں بانٹے اور شاہانہ جشن منایا[۳]

اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سکھوں پر سید صاحب کی تحریک جہاد نے کس درجہ سراسیمگی طاری کر دی تھی۔ اور فتح کو انہوں نے کتنی اہمیت دی۔ یار محمد خاں سے پامردی کی امید تو شاید ہو ہی نہ سکتی تھی۔ لیکن اگر وہ غدر و خیانت سے دور رہتا اور غازیوں میں ابتری پیدا نہ کرتا تو بدھ سنگھ شیدو میں شکست کھا جاتا۔ اس کی فوج کٹ جاتی اساز و سامان جنگ غازیوں کے ہاتھ لگتا اور ان کا دوسرا قدم حصار اٹک پر پڑتا۔ افسوس کہ یار محمد خاں کی نالائقی نے ان تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

درانی سردار اس وقت سے مستقل طور پر سکھوں کی تابعت میں چلے گئے اور سید صاحب کی مساعی جہاد میں شدید رکاوٹیں پیدا کرنے لگے۔ اس سلسلے میں

---

۱ پشاور گزیٹر صفحہ ۶۶ (سید احمد شہید) ۲ پیجٹ اینڈ میسن صفحہ ۵۸ (سید احمد شہید)

۳ عمدۃ التواریخ دفتر دوم صفحہ ۴۱۳

اہل سرحد کو جن ظلموں کا ہدف بننا پڑا۔ ان کے زخم سوا سو سال گزر جاتے پر بھی کاملاً مندمل نہیں ہوئے۔

اس گھمسان کی لڑائی میں چھ ہزار غازی مقتول ہوئے[1] یہ پاک اور قیمتی خون صرف یار محمد خاں کی خیانت کے باعث رائیگاں بہا۔

---

[1] ظفر نامہ دیوان امرناتھ صفحہ ۱۸۱ (سید احمد شہید)

باب ۶۴

ہری سنگھ نلوہ

اہل سرحد کے عزائم کی کمزوری اور درانی سردار یار محمد خاں کی غدآری نے مسلمانوں کے لئے تباہیوں اور بربادیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر دیا وہی سکھ جن کے حوصلے پست ہو چکے تھے اور جو مسلمانوں کی یورش سے ہراساں اور خائف نظر آتے تھے۔ اب اپنی سازشوں میں کامیاب ہونے کے بعد پھر سے فتح و ظفر حاصل کر رہے تھے۔ کرتار سنگھ نے ایک مدت تک تخویف و تحریص کی کمندیں پھینکیں۔ بظاہر وہ ناکام رہا لیکن درحقیقت درآنی سردار پہلے ہی جھٹکے میں اسیر دام ہو گئے۔

ابدالیوں کے عہد عروج میں ہزارہ اگرچہ افغان سلطنت میں شامل تھا اور کشمیر کے راستے پر واقع ہونے کے باعث اس کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ لیکن افغان حکمرانوں نے ہزارے کے مقامی خوانین و رؤسا کے انتظامی معاملات میں قطعاً مداخلت نہ کی بلکہ اس علاقے کے لئے کبھی گورنر مقرر نہ کیا، ابدالیوں کی مصلحت صرف یہ تھی کہ امن قائم رہے، اور کشمیر کا راستہ مخدوش نہ ہو۔ اس مصلحت کی حفاظت میں رؤسا ہزارہ نے کبھی تامل نہ کیا۔ بڑے بڑے سردار کشمیر جاتے یا وہاں سے لوٹتے تو مختلف رؤسا اپنے اپنے علاقوں میں ان کے لئے مہمانداری کا انتظام کر دیتے۔ دریا سے گزرنے کے لئے کشتیاں بہم پہنچا دیتے۔ کبھی کبھی تحائف کی صورت میں نذریں بھی پیش کر دیتے۔ ابدالی اس صورت حال پر بالکل مطمئن تھے رؤسا میں کشمکش کا کوئی واقعہ پیش آجاتا تو ابدالی اس کا فیصلہ کر دیتے۔ ضرورت کے وقت اپنی فوج کے لئے تنخواہ دار آدمی لے لیتے۔

جب سدوزیوں اور بارک زیوں کی باہمی خونریزیوں کے باعث افغان سلطنت کا پرچم اقبال سرنگوں ہوگیا تو روسا ہزارہ نے رسمی تابعیت سے بھی آہستہ آہستہ بے پرواہی اختیار کرلی اور تمام گروہوں نے اپنی مستقل سرداریوں کی داغ بیل ڈال دی۔

پھر اچانک ایک ایسا واقعہ پیش آگیا جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے آزاد سرحدی علاقے میں انوکھا تھا۔ اس کی وجہ سے ہزارے میں ایک نئی قوت کے لئے قبض وتصرت کے دروازے کھل گئے پھر اہل ہزارہ پر ہولناک مصیبتیں آئیں اور تیس پینتیس برس تک ان کا خون پانی کی طرح بہتا رہا۔

مانک رلئے کے ترک رئیس ہاشم خاں نے کمال خاں ترک کو قتل کر دیا، محمد خاں ترین مقتولوں کے وارثوں کا مددگار بن گیا، اور ہاشم خاں کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ اس نے تشویش واضطراد کے عالم میں راولپنڈی کے سکھ گورنر لکھن سنگھ سے مدد مانگی وہ فی الفور پانسو سوار لے کر ہزارے پہنچ گیا اور سرائے صالح میں قلعہ تعمیر کرکے میدانی علاقے سے بالجبر خراج وصول کرنے لگا۔

اس بلائے ناگہانی نے ہزارے کے خوانین ورؤسا کی آنکھیں کھول دیں۔ انھوں نے چپکے چپکے ایکے کا بندوبست کیا دوڑندی کے کنارے شاہ محمد کے مقام پر لکھن سنگھ کو شکست دی اور وہ مارا گیا۔ سکھ فوج سرائے صالح کو چھوڑ کر اٹک کے سکھ گورنر حکما سنگھ کے پاس پہنچ گئی حکما سنگھ نے اہل ہزارہ کی تادیب کے لئے لاہور سے کمک منگائی، جس کا سالار دیوان رام دیال تھا، ترینوں اور تنان زیوں اور مشوانیوں نے متحد ہوکر اس فوج کو کوہ گنگر کے دامن میں ناڑا مقام پر شکست دی، رام دیال اس لڑائی میں مارا گیا۔

اس کے بعد امر سنگھ مجیٹھ کو ہزارے کا گورنر بنا کر بھیجا گیا، اس نے نرمی اور ملائمت کی پالیسی اختیار کی، ایک کشمکش میں وہ بھی مارا گیا۔ پھر کنور شیر سنگھ اور اس کی نانی مائی سداکور ہزارے پہنچے، مائی سداکور نے محمد خاں ترین کو منہ بولا بیٹا بنا کر ساتھ ملا لیا اور

تربیلہ میں ایک گڑھی کی بنیاد رکھی۔

مائی سداکور کی پالیسی کامیاب ہورہی تھی کہ اچانک ہری سنگھ نلوہ ہزارے کی سٹیج پر نمودار ہوا۔ یہ شخص معمولی حیثیت سے اٹھ کر سکھ فوج میں جرنیل بنا تھا ظلم وتشدد اور سنگدلی کی وجہ سے سکھوں میں بڑی شہرت حاصل کرلی تھی رنجیت سنگھ نے اسے کشمیر کا گورنر بنا دیا پھر شکائتیں پہنچیں کہ ہری سنگھ نے روپے میں بہت تغلب کیا ہے۔ رنجیت سنگھ نے حساب کتاب کی غرض سے لاہور بلایا تو اسے خیال ہوا کہ کوئی بڑا کارنامہ انجام دیئے بغیر محاسبے اور بازپرس سے بچنا محال ہے اس نے ہزارے کو فتح کرنے کا ارادہ کرلیا وہ سات ہزار منظم فوج کے ساتھ مظفرآباد اور گڑھی حبیب اللہ خاں کے راستے ہزارے میں داخل ہوا، مانسہرے اور ایبٹ آباد کے درمیان درۂ مانگل میں پہنچا تو جدون اور تنولی راستہ روکے کھڑے تھے خونریز جنگ ہوئی، ہزارہ کے بے قاعدہ دستے سکھوں کی منظم فوج کا مقابلہ نہ کرسکے، ہری سنگھ نے اپنی عادت کے مطابق ایک جدون کے گھر سے تاوان وصول کیا۔ چونکہ کئی مرتبہ کی شکستوں کے بعد سکھوں کو فتح حاصل ہوئی تھی اس لئے رنجیت سنگھ، ہری سنگھ کے اس کارنامے پر بہت خوش ہوا، نہ محض محاسبہ چھوڑ دیا بلکہ اس کو ہزارے کا گورنر بنا دیا۔

محمد خاں ترین مائی سداکور کا بیٹا بن کر لاہور پہنچ گیا تھا، ہری سنگھ نلوے نے پچپن ہزار روپے دے کر اسے رنجیت سنگھ سے لے لیا۔ پھر اس غریب کو قیدخانے میں کھار کی روٹی کھلاکر مار ڈالا۔ رنجیت سنگھ کو جو رقم دی تھی وہ بھی تاوان لگاکر گھر گھر سے وصول کرلی۔ اگرور کونش اور ٹکری کی وادیوں پر بھی حملے کئے اور گاؤں جلاڈالے۔ خصوصاً سربلند خاں پلال تنولی کے مرکز شنگرائی کو توراکھ کا ڈھیر بناکر رکھ دیا اس کے فرزند شیر خاں کو پھانسی دی، سکندرپور کے قریب ہرکشن گڑھ کے نام سے ایک قلعہ تعمیر کرایا۔ اس کے آس پاس نئی بستی آباد ہوگئی، اس بستی کو بعد میں ہری پور کہنے لگے

یہی تحصیل ہری پور کا صدر مقام ہے۔

یہ حالات تھے جب سید صاحب یوسف زئی پہنچے اور ان کی جہاد آرائی کی بدولت سرحدی علاقوں کی یاس افزا تاریکی میں امید کی ایک نئی کرن چمکی۔ اب تمام تباہ حال خوانین و رؤسا سید صاحب کے دامن میں پناہ لینے لگے۔

سردار پایندہ خاں تنولی والیٔ امب کے کئی علاقے ہری سنگھ نے دبا لئے تھے۔ اس نے بھی اطاعت نامہ بھیجا۔

سلیمان شاہ والیٔ چترال پہلے لکھ ہی چکا تھا کہ اگر سیّد صاحب کشمیر کا رخ کریں تو میں فوج لے کر گلگت کے راستے اعانت کے لئے پہنچ جاؤں گا[1]۔ ان مصلحتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے سید صاحب پکھلی (ہزارہ) کی طرف انتظامِ جہاد کے امکانات سے فائدہ اٹھانے کے لئے سعاً تیار ہو گئے۔

سیّد صاحب نے تمام رؤسا پکھلی کو لکھ بھیجا کہ مجاہدین کے جیش جلد پہنچیں گے آپ لوگ تیار رہیں اور جن سرداروں کی عملداری میں سے مجاہدین کو گزرنا ہے، وہ ضرورت کی چیزیں مہیا کر دینے کا خیال رکھیں۔

اس اثنا میں مشہور ہو گیا کہ غازی ڈمگلہ پر حملہ کرنے والے ہیں۔ اس کے فتح ہو جانے سے مظفر آباد و کشمیر کی طرف پیش قدمی کا راستہ کھل سکتا تھا۔ ہری سنگھ نلوہ حاکم ہزارہ نے مہاں سنگھ کو تین ہزار آدمیوں کے ساتھ ڈمگلہ کی حفاظت کے لئے بھیج دیا۔ پھر اس

---

[1] سلیمان شاہ کے مکتوب کا متعلقہ حصہ یہ تھا کہ اگر کشمیر کی طرف توجہ فرمائیں تو انشاء اللہ تعالیٰ این خادم سادات و علماء و فقراء ہر وقتے کہ اعلام فرمایند در مقدمہ ملک مذکور (کشمیر) شریک می شوم کہ بہ مایان قریب است راہ است بہ حدود کشمیر بہ پایاں میسر است / ہر خدمتے کہ بطرف کشمیر بودہ باشد، آمادہ ایم (مکاتیب شاہ اسماعیل صفحہ ۲۰۴ رسید احمد شہید)

پاس کی گڑھیوں سے مزید تین ہزار سکھ اس کی کمک کے لئے روانہ کر دیئے اس افراتفری میں اس گڑھی کا محاصرہ بھی اٹھا لیا گیا، جس میں حبیب اللہ خاں کا بیٹا محصور تھا۔ اس طرح ہزارے کے خوانین کا فوری مقصد پورا ہو گیا۔

ڈمگلہ میں سکھوں کے اجتماع کی خبر سن کر مولانا اسمٰعیل نے مناسب نہ سمجھا کہ ان پر ضرب لگائے بغیر پیچھے ہٹ جائیں، انہیں یہ امید بھی ہو گی کہ ممکن ہے اس سر بازار اقدام سے خوانین درّوسا، ہزارہ کا سویا ہوا جذبۂ غیرت بیدار ہو جائے اور وہ قلّتِ وسائل پر تذبذب کے جس دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں، اس سے باہر نکل کر بے باکی کے ساتھ اعانت کے لئے تیار ہو جائیں دعوتِ جہاد کو عوام تک پہنچانے کا بھی یہ ایک نہایت مؤثر طریقہ تھا لیکن سکھوں کی فوج بہت زیادہ تھی اس لئے شب خون مارنے کا فیصلہ کیا خود مولانا شکیاری کے قریب ٹھہر گئے۔ جو ڈمگلہ سے تین میل پر درۂ بھوگڑ منگ کے سامنے ایک مشہور مقام ہے، وہاں کی گڑھی میں سکھوں کا ایک جیش رہتا تھا، سید مقیم رام پوری کو ایک سو غازیوں کا سالار بنا کر ڈمگلہ پر یورش کے لئے بھیج دیا۔ چودہ پندرہ سو ملکی ان غازیوں کے ساتھ شامل ہو گئے، مولوی خیرالدین شیر کوٹی کو سید محمد مقیم کا مشیر و نائب بنا دیا گولی بارود کے علاوہ بارود بھرے ہوئے نل بھی غازیوں کو دے دیئے اور ہدایت فرما دی کہ سکھ لشکر گاہ کے قریب پہنچ کر پہلے نل اندر پھینکے جائیں پھر چھاپہ مارا جائے چھاپے کے دوران میں بھی جہاں جہاں سکھوں کا ہجوم نظر آئے نل پھینک کر انہیں منتشر کیا جائے غازیوں نے کچھ چار پائیاں بھی ساتھ لے لیں تاکہ لشکر گاہ کی خار بندی کے ساتھ کھڑی کر کے بہ آسانی اندر پہنچ سکیں۔

سیّد محمد مقیم منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہوئے، ڈمگلہ اگرچہ دور نہ تھا لیکن وہاں تک پہنچتے پہنچتے صرف تین چار سو ملکی رہ گئے باقی سب اِدھر اُدھر چھپ گئے سیّد موصوف صاحبِ عزم آدمی تھے، اپنے رفیقوں کی اس خلافِ توقع تقلیل سے بالکل پریشان نہ ہوئے لشکر گاہ

کے پاس پہنچ کر پہلے بارود بھرے نل پھینکے، پھر چار پائیاں خار بندی سے لگا دی گئیں اور سب سے پہلے جس شخص نے لشکر گاہ میں قدم رکھا وہ ان غازیوں کا بہادر سالار محمد مقیم تھا۔ پورے زور سے نعرۂ تکبیر لگا کر حملہ کیا، سکھ غول غول بن کر کئی جگہ جمع ہو گئے، مجاہد نل داغ داغ کر پھینکتے تو بکھر جاتے۔ پھر قرابینیں مارتے ہوئے ان پر ہلہ کرتے سید محمد مقیم اور ان کے ساتھیوں نے جوانمردی کے وہ جوہر دکھائے کہ رستم و اسفندیار کی داستانیں فراموش ہو گئیں [۱]

جو ملکی ادھر ادھر چھپ گئے تھے۔ اب وہ بھی آ پہنچے، لیکن انہوں نے لڑائی میں کوئی حصہ نہ لیا۔ اور مال و اسباب اٹھا کر بھاگنے لگے۔ سکھوں نے پھوس کے چند چھپروں کو آگ لگا دی۔ آگ بھڑکی تو ماحول دور دور تک روشن ہو گیا اور لشکر گاہ کے اندر کی ایک ایک چیز نظر آنے لگی۔ اس وقت سکھوں کو معلوم ہوا کہ لڑنے والے غازی بہت کم ہیں اور ملکی لوگ صرف مال اٹھا اٹھا کر بے ترتیبی سے نکلے جا رہے ہیں۔ چنانچہ وہ پھر منظم ہو ہو کر مقابلے کے لئے آنے لگے۔

مولوی خیر الدین نے یہ حالت دیکھی تو مشورہ دیا کہ اب نکل جانا ہی بہتر ہے۔ چنانچہ مولوی صاحب خود ایک جماعت کو لے کر سکھوں کا مقابلہ کرنے لگے، باقی غازیوں کو حکم دیا کہ اطمینان سے باہر نکل جاؤ۔ اور زخمیوں کو بھی اٹھا لو۔ چھ سات زخمیوں کو اٹھا لیا گیا دو کی حالت نازک تھی۔ ایک عبدالخالق محمد آبادی، دوسرے سید لطف علی، ان دونوں نے خود کہا کہ ہمارے ہتھیار لے لو اور اٹھانے کی تکلیف گوارا نہ کرو ہمیں اسی میدان میں جان دے دینا پسند ہے۔

جب سارے غازی نکل گئے تو مولوی خیر الدین بھی قدم بہ قدم پیچھے ہٹتے ہٹتے

---

[۱] منظورہ صفحہ ۹۴۴ (سید احمد شہید)

باہر نکل گئے۔ سکھوں پر اتنی ہیبت طاری تھی کہ کسی کو سنگھر سے باہر نکل کر تعاقب کی ہمت نہ پڑی۔ اس شبخون میں چند غازی شہید ہوئے، چند زخمی ہوئے۔ ان میں سے ایک سالارِ لشکر سید محمد مقیم تھے۔ جن کی ٹانگ پر تلوار لگی تھی، سکھ مقتولین کی تعداد تین سو تھی۔

ادھر غازیوں کی بڑی جماعت شب خون کے لئے ڈمگلہ آئی ہوئی تھی۔ ادھر مولانا کو شنکیاری کے پاس اچانک جنگ پیش آگئی۔ مولانا کے ساتھی دو ناقے کاٹ چکے تھے کسی قدر غلہ ملا تو وہ کھانے کے انتظام میں لگ گئے۔ بعض کھا چکے تھے۔ بعض کھا رہے تھے، اور بعض ابھی پکانے ہی میں مصروف تھے، اچانک سکھوں کا ایک گروہ گرامی شنکیاری سے باہر نکلا وہ جوار کاٹنے کی غرض سے نکلے تھے۔ مولانا نے دور سے دیکھا تو سمجھے کہ جنگ کی غرض سے آئے ہیں۔ فوراً غازیوں کو حکم دے دیا کہ مورچے پکڑ کر بیٹھ جاؤ۔ سامنیں اور بندوقیں چلنے لگیں۔ سکھ نزدیک پہنچ گئے تو غازی قرابینیں مارنے لگے بالکل پاس آگئے تو تلواریں نکال لیں۔ تھوڑی ہی دیر میں سکھ بھاگ نکلے۔ زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ ایک بولا "یہ تو بہت تھوڑے آدمی ہیں بھاگے کیوں جا رہے ہو؟ چنانچہ وہ پھر پلٹے اس وقت مولانا کے ساتھ صرف بارہ آدمی تھے۔ لیکن ایک انچ بھی پیچھے ہٹنا گوارا نہ کیا مارے تلواروں کے لاش پر لاش بچھا دی۔ کئی سکھ مولانا کے ہاتھ سے قتل ہوئے، وہ پھر بھاگے تو گڑھی میں پہنچ کر دم لیا۔ اس لڑائی میں دو ڈھائی سو سکھ مارے گئے[1] غازیوں میں سے چھ سات شہید اور نو دس زخمی ہوئے۔

سکھوں کی گولیاں مینہ کی طرح برستی رہیں، مولانا کی قبا چھلنی ہوگئی۔ لیکن نہ آپ میدان سے ہٹے، نہ مورچے کی پناہ لی اور نہ جنگ روکی۔

ڈمگلہ اور شنکیاری کے معرکوں نے سکھوں پر سخت سراسیمگی طاری کر دی تھی کمال خاں اور ناصر خاں نے مولانا سے کہا کہ اب آپ اگرور تشریف لے چلیں تاکہ وہاں اطمینان سے مزید اقدامات کی تجویزیں سوچی جائیں۔ چنانچہ مولانا شنکیاری، ابغر، خاکی

---

[1] منظورہ صفحہ ۸۴۴ (سید احمد شہید)

بیر کھنڈ، ملک پورہ وغیرہ کے پاس سے گزرے۔ جب سکھوں کی گڑھی قریب آتی تو حکم دیتے کہ زور زور سے نقارہ بجاؤ تاکہ اگر کوئی مقابلہ کرنا چاہے تو باہر نکل کر دل کا حوصلہ نکال لے۔

اوگی پہنچ کر مولانا آٹھ روز ٹھہرے رہے۔ ارادہ یہ تھا کہ مناسب موقعوں پر غازیوں کو بٹھا کر گڑھیوں پر شب خونوں کا لا متناہی سلسلہ جاری کر دیں۔ اس اثنا میں سیّد صاحب کا فرمان آگیا کہ ہندوستان سے غازیوں کے بہت سے قافلے پہنچ گئے۔ آپ تشریف لے آئیں۔

باب ۶۵

یار محمد کا انجام

یار محمد کی غدّاری نے حالات کا رُخ بدل دیا، وہ ڈھونڈ کر اپنی بد عہدی اور غداری کے لئے جواز کے اسباب پیدا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اب اسے خادے خاں کا خون یاد آیا، حالانکہ جانتا تھا، خادے خاں بغاوت اور نقضِ بیعت کے جرم میں خود اپنی حرکتوں کے باعث قتل ہوا۔ اس کے قتل و ہلاکت کی ذمہ داری صرف اسی پر تھی، کسی اور پر نہ تھی اور اب خود یار محمد خاں بھی اسی کے راستے پر چل رہا تھا۔ پہلے اس نے سید صاحب کو زہر دے کر ہلاک کرنے کی کوشش کی، پھر عین جنگ کے موقع پر سکھوں سے سازباز کر لی اب لشکر چڑھا لایا۔ اس نے گلباز خاں کی سرکردگی میں چار علاؤں کو حضرت سید صاحب کی خدمت میں بھی یہ پیام دے کر بھیجا کہ آپ یہاں سے تشریف لے جائیں، ورنہ توپیں لگا کر اس مقام کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی اور غازیوں کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے روند ڈالا جائے گا۔ جواب میں آپ نے فرمایا۔

"کتنے لوگوں نے ہمیں صلاح دی کہ اسی ملک میں (یعنی ہندوستان میں) جہاد کرو۔ جو کچھ مال، خزانہ، سلاح وغیرہ درکار ہو، ہم دیں گے مجھ کو منظور نہ ہوا۔ اس لئے کہ جہاد موافق سنت کے چاہیئے بلوا کرنا منظور نہیں تھا۔

آپ کے اس ملک کے ولائتی بھائی بھی وہاں حاضر تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا ملک اس امر کے واسطے بہت خوب ہے۔ اگر آپ وہاں چل کر کسی جگہ قیام پکڑیں تو لاکھوں مسلمان وہاں کے جان و مال سے آپ کے شریک ہوں گے۔ خصوصاً اس سبب

سے کہ رنجیت سنگھ والیٔ لاہور نے وہاں کے مسلمانوں کو تنگ کر رکھا ہے طرح طرح کی اذیتیں پہنچاتا ہے ہتک حرمت اہل اسلام کی کرتا ہے، جب اس کی فوج کے لوگ اس ملک میں آتے ہیں مسجدوں کو جلا دیتے ہیں، کھیتی تباہ کرتے ہیں مال و اسباب لوٹتے ہیں، بلکہ عورتوں، بچوں کو پکڑ کر لے جاتے ہیں اور اپنے ملک پنجاب میں بیچ ڈالتے ہیں، اور اپنے ملک پنجاب میں تو وہ مسلمانوں کو اذان بھی نہیں کہنے دیتے اور مسجدوں میں گھوڑے باندھتے ہیں اور گاؤکشی تو کیا ذکر جہاں سنتے ہیں کہ کسی مسلمان نے گائے ذبح کی۔ اس کو جان سے مار ڈالتے ہیں۔ اس پر میں نے کہا کہ یہ سچ ہے بہتر یہ ہے کہ ہندوستان سے ہجرت کر کے وہیں چل کر ٹھہریں اور سب مسلمانوں کو متفق کر کے کفار سے جہاد کریں۔

یار محمد خاں سے بعد سلام کہنا، ہم مسلمان ہیں اور ہندوستان سے ہجرت کر کے مسلمانوں کے ملک میں آئے ہیں صرف اس لئے کہ سب بھائیوں کو متفق کر کے جہاد کریں تاکہ دین اسلام ترقی کرے اور قوت پکڑے، آپ بھی مسلمان رئیس والیٔ ملک اور نامور ہیں، آپ کو بھی لازم ہے کہ ہمارا ساتھ دیں نہ کہ کافروں اور باغیوں کے حمائتی اور طرفدار بن کر ہم سے لڑیں۔ ہم نے خادے خاں کو جو قتل کیا اور اس کا قلعہ چھین لیا تو وہ ہمارے ہاتھ پر بیعتِ امامت کر کے باغی ہو گیا تھا اور کئی بار سکھوں کو مسلمانوں پر چڑھا لایا تھا، اپنی دانست میں اس نے ہماری خونریزی اور بدخواہی میں کوتاہی نہ کی۔ مگر اللہ تعالے ہمارا حافظ و ناصر تھا اس نے ہم لوگوں کو اس کے شر سے محفوظ رکھا۔ اب آپ اس باغی۔ کے خون کا دعویٰ کر کے ہم سے لڑتے آئے ہیں یہ حرکت آپ کی شان سے بعید ہے، واجب ہے کہ آپ اس بات سے توبہ کریں، خدا سے ڈریں، اپنے ملک کو چلے جائیں اور دائرہ اسلام سے قدم باہر نہ دھریں حدِ شریعت سے تجاوز نہ فرمائیں اگر نہ مانیں گے تو دنیا میں رسوا و شرمسار اور قیامت کے دن عذاب

الٰہی میں گرفتار ہوں گے لے۔

سید صاحب نے یہ جواب دے کر ملا صاحبان سے کہا کہ چھ گھڑی میں اس کا جواب لا دیجئے۔ وہ مقررہ وقت پر نہ آئے۔ تو سید صاحب نے اپنی طرف سے چار آدمیوں کو بھیج دیا۔

یار محمد خاں نے سید صاحب کے پیغامِ مصالحت کا نہایت درشت جواب دیا۔ آخر میں یہ بھی کہہ دیا کہ اگر اب کوئی شخص صلح کا پیام لایا تو اس کا سر اڑا دوں گا سید صاحب نے اسی وقت حکم دے دیا کہ تمام غازیوں کو باہر کے مورچوں سے بستی میں بلا لیا جائے۔

آخر مولانا اسمٰعیل کی سرکردگی میں تین سو غازی اور چار سو ملکی حضرت سید صاحب کی حسبِ ہدایت قصدِ جنگ سے باہر نکلے۔

مولانا نے غازیوں کو گڑھی سے نکال کر میدان میں کھڑا کیا، دیر تک ننگے سر ہو کر دعا کرتے رہے۔ پھر ایک رہبر کے پیچھے پیچھے منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہوئے، چلتے چلتے ایک سو سوار ہنڈ کی طرف سے آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ غازی ان پر گولیاں چلانا چاہتے تھے۔ مولانا نے سب کو روک دیا۔

سوار عین سامنے پہنچ گئے تو انہوں نے غازیوں کو دیکھ لیا۔ ایک نے پشتو میں پوچھا "سوکے"؟ (یعنی کون ہو) شیخ علی محمد دنبی بے تکلف پشتو بولتے تھے۔ انہوں نے جواب دیا "اخیل" (یعنی اپنے ہی لوگ ہیں) سوار نے پھر پوچھا "کم جاے راغلے؟" (کہاں سے آئے ہو) شیخ نے جواب دیا "لگرادتان زئی" (اوتمان زئی سے لشکر آیا ہے) یہ سن کر ایک سوار قریب آیا۔ غازیوں کو پہچان کر شور مچاتا ہوا بھاگا "داغازیان دے"

لے وقائع صہ ۱۱۲۴ (سید احمد شہید)

"دا غازیان دے" (یہ غازی ہیں، یہ غازی ہیں) باقی سوار بھی بھاگ گئے۔ غازیوں نے نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے حملہ کر دیا۔

مولانا نے گڑھی سے نکلتے ہی اپنے غازیوں اور ملکی لشکریوں کی ٹولیاں الگ الگ بنا دی تھیں، اپنے غازیوں کو تین جماعتوں میں تقسیم کر دیا تھا، پہلے سے بتا دیا گیا تھا کہ حملہ اس جگہ کیا جائے گا، جہاں توپیں اور شاہینیں ہیں، توپوں سے گولے چھوٹنے لگے تو مولانا نے اپنے غازیوں کی ایک جماعت کو توپوں کے دائیں جانب دوسری کو بائیں جانب بڑھنے کا حکم دیا، تیسری جماعت کو لے کر خود عین سامنے سے پیش قدمی کی، گولے برابر آ رہے تھے، دو مرتبہ پہلے فائر ہوا تھا۔ تین مرتبہ بعد میں ہوا اس میں مولانا نے پانچ توپوں پر قبضہ کر لیا چھٹی توپ وہاں سے کسی قدر فاصلے پر کنڈ دہ کی جانب تھی۔ اس سے تیزی کے ساتھ فائر ہونے لگے مولانا نے چالیس پچاس بندوقچیوں اور رقرابین چیوں کو اس کے عقب سے حملے کے لئے بھیج دیا دو گولہ انداز گرفتار ہو گئے تیسرا بھاگ گیا اور وہ توپ بھی قبضے میں آگئی گویا درانی لشکر کا سب سے کارگر اور دہشت انگیز سامانِ جنگ غازیوں کے ہاتھ آگیا۔

اس اثنا میں یار محمد خاں کا ایک مصاحب پکڑا گیا، جس کی پشت پر تلوار لگی تھی اس سے اور دوسرے اسیروں سے یار محمد خاں کا پتہ پوچھا گیا۔ تو معلوم ہوا کہ وہ کنڈدہ والی توپ کے پاس تھا اس کے گولی لگی اور ساتھی اسے اٹھا کر لے گئے۔

اس توپ سے چند فائر کرنے کے بعد غازیوں نے لشکرگاہ میں پھر پھر کر دیکھنا شروع کیا تو زیادہ تر خیمے خالی پائے۔ بعض خیموں سے دو دو چار چار آدمی سراسیمہ وار بھاگ رہے تھے۔ بعض لوگ یار محمد خاں کی امداد کے لئے ادھر اُدھر سے جمع کئے گئے تھے انہوں نے یا للہ پلٹنے" دیکھا تو جو مال ہاتھ لگا اٹھا کر اپنے گھروں کو فرار ہو گئے۔

مولانا نے مال غنیمت جمع کرایا تو مندرجہ ذیل چیزیں تھیں۔

ایک ہاتھی، ساٹھ ستر اونٹ، کچھ کم تین سو گھوڑے، چھ توپیں، پندرہ سولہ شاہینیں، تلواروں اور بندوقوں کا شمار نہ تھا، ملکی لوگ جو مال اٹھائے لئے جا رہے تھے اسے حسن تدبیر سے واپس لیا بستر اور خیمے سب محفوظ پڑے تھے۔ اکثر لوگ جوتے بھی چھوڑ گئے تھے۔ پلاؤ کی دیگیں تیار پڑی تھیں، منوں خشک میوہ موجود تھا بعض خیموں سے مستورات نکلیں جنہیں سردار کے لشکری عیش رانی کی غرض سے زبردستی پکڑ لائے تھے انہیں مولانا نے فوراً ان کے گھروں میں بھیج دیا۔

یار محمد خان کے کاری زخم لگا تھا۔ اسے بہ مشکل گھوڑے پر سوار کرکے میدان سے باہر پہنچا یا گیا وہ ہریانے اور دوڈھیر کے درمیان لبا در میں یا اس کے آس پاس فوت ہوا میّت کو پشاور پہنچا کر دفن کیا گیا اس یورش میں یار محمد خاں کے تین سو ساتھی مارے گئے جن میں سے سات بڑے سردار تھے۔ ایک ہزار گھوڑے ان ملکیوں کے قبضے میں چلے گئے جنہیں یار محمد خاں نے دھمکا کر ادھر ادھر سے اپنے لشکر میں شامل کر لیا تھا۔

مال غنیمت میں یار محمد خاں کے کچھ کاغذات بھی ملے تھے جن میں رنجیت سنگھ کا ایک فرمان تھا۔ اس کا مضمون یہ تھا۔

۱۔ غازیوں پر لشکر کشی کی جائے۔

۲۔ لیلیٰ، مروارید، صبا کہا وغیرہ گھوڑے دنتورا کے حوالے کر دیئے جائیں، یہ تینوں گھوڑے سلطان محمد خاں کے تھے اور اس عہد میں اپنی خوبصورتی اور تیز رفتاری کے باعث دور دور مشہور تھے۔ لیلیٰ کی قیمت ساٹھ ہزار روپے بتائی جاتی تھی۔

۳۔ سید صاحب اور ان کے ساتھیوں کو جلد سے جلد ملک سے نکال دیا جائے

۴۔ ہنڈ کو خاوے خاں کے متلقین کے حوالے کر دیا جائے۔

اگر ان تمام ہدایات کی تعمیل نہ ہوئی تو مجھے خود لشکر لے کر آنا پڑے گا[۱]

اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ یار محمد خاں اپنی غلط اندیشی کے باعث کس نوع کے نازیبا مقاصد کے لئے وقف ہو چکا تھا اور سکھوں کی نظروں میں اس نے اور خاوے خاں نے جو اعتبار حاصل کیا تھا اس کے لئے کس طرح انہیں اسلامیت کے تقاضوں سے یک قلم بے پروائی اختیار کرنی پڑی تھی۔

---

[۱] مکاتیب شاہ اسمٰعیل ۲۱۶ (سید احمد شہید)

باب ۶۶

کفر کا فتویٰ ــــ نیا جال

خادے خاں اور یار محمد کے قتل نے جاہ پرست اور خود غرض سرداروں اور امیروں میں ہلچل پیدا کر دی۔ انہوں نے سوچا، اگر یہ مجاہد اور غازی اسی طرح اپنے راستے سے کانٹے ہٹاتے رہے تو ہمارا حشر بھی وہی ہوگا جو ہمارے دوستوں اور ساتھیوں کا ہو چکا ہے۔

سلطان خاں، یار محمد خاں کا بھائی تو انگاروں پر لوٹ رہا تھا، اس لئے کہ اب پشاور بھی مجاہدوں کے تصرف سے باہر نہ تھا، لیکن ماں کے طعنوں، دوستوں کی نصیحتوں اور ساتھیوں کے مشوروں سے اس نے بیعت سے بھی انحراف کر لیا۔ لیکن یار محمد خاں کا حشر آنکھوں کے سامنے تھا۔ اتنی ہمت نہیں تھی کہ کھل کر سامنے آتا۔ ایک مجلس مشاورت بیٹھی تو اس میں اس کے معتمد مشیر شریک ہوئے، گلباز خاں سب میں پیش پیش تھا۔ کافی دیر تک بحث و گفتگو کے بعد رائے یہ طے پائی کہ فریب کا راستہ اختیار کیا جائے۔ اور ان مجاہدوں اور غازیوں کا خاتمہ کر دیا جائے۔ لیکن وہ فریب کا راستہ کیا ہو؟ یہ کہ ایک طرف سید بادشاہ سے صلح کر لی جائے۔ ان سے عقیدت کا اظہار کیا جائے۔ ان کے مقاصد کی تائید کی جائے۔ اور دوسری طرف ان کے خلاف وہ فتویٰ کفر جو کرتار سنگھ نے رنجیت سنگھ کے حکم کے ماتحت بہت سے ملاؤں کے دستخط کرانے کو بھیجا ہے۔

اس کی ناواقف عوام میں خوب تشہیر کی جائے۔ اس لئے کہ جب تک سرحد کے عوام سید بادشاہ سے برگشتہ نہ ہوں گے۔ مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو

سکتی - اور برگشتہ کرنے کی تدبیر وغیرہ یہ ہے کہ انہیں یقین دلا دیا جائے۔ سید بادشاہ اور ان کے ساتھی سرے سے مسلمان ہی نہیں ہیں یہ جو نماز پڑھواتے زکواۃ وصول کرتے اور عشر حاصل کرتے ہیں، یہ محض ڈھکوسلا ہے۔ لوگوں کو بے وقوف بنانے، اپنی جیبیں بھرنے اور اپنی حکومت قائم کرنے کی اس سے آسان اور صورت کیا ہو سکتی ہے؟ یہ دار جب کامیاب ہو تو پھر یہ نئی دوستی جو کی جا رہی ہے، توڑ دی جائے۔ اور سب کا صفایا کر دیا جائے۔

سلطان خاں نے گلباز خاں اور اس کے ہمنواؤں کی یہ بات تسلیم کر لی اور اس پر عمل درآمد کرنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ پشاور کی چھنی ہوئی حکومت صرف اسی طرح حاصل ہو سکتی تھی۔

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ حضرت سیّد صاحب کی خدمت میں سلطان محمد خاں کی طرف سے توبہ اور عفو تقصیر اور اطاعت کا پیامبر بن کر کون جائے۔ گلباز خاں نے رائے دی یہ کام ارباب فیض اللہ خاں ہی اپنی شخصیت اور وجاہت کے سبب خوبی سے انجام دے سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ سیّد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

ارباب فیض اللہ خاں نے عرض کیا کہ سلطان محمد خاں توبہ کے لئے تیار ہے اس کی تقصیریں معاف کر دیجئے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر کوئی کافر آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہے کہ میں ایمان لانا چاہتا ہوں تو کیا اسے حلقۂ اسلام میں داخل نہیں فرمائیں گے؟ میں تو مسلمان ہوں اور مسلمان زادہ ہوں، پھر میری خطاؤں پر عفو کھینچنے میں کیوں تامّل ہے؟ میرا ملک مجھے دیجئے۔ مدت العمر اطاعت گزار رہوں گا۔

ارباب نے یہ بھی عرض کیا کہ صلح کا محرک میں ہوں، میرے نزدیک قومی مصلحت صلح ہی کی متقاضی ہے درانیوں سے بھی میرا پرانا تعلق ہے آپ کی خدمت میں بھی ارادت کا شرف حاصل ہے۔ بے شک آپ فتح حاصل کر چکے ہیں لیکن سرداروں

کے پاس اب بھی خاصا لشکر اور ساز و سامان ہے، اگر صلح نہ ہوئی تو اندیشہ ہے کہ باہمی رزم و پیکار کا لامتناہی سلسلہ جاری ہو جائے گا اور جو مقصد ہم سب کو عزیز ہے وہ خطرے میں پڑ جائے گا۔

ارباب نے یہ گفتگو فارسی میں کی، غازیوں میں سے جو اصحاب فارسی جانتے تھے انہیں یہ باتیں اچھی معلوم نہ ہوئیں۔ لیکن سید صاحب عادت شریف کے مطابق انتہائی نرمی اور ملائمت سے جواب دیتے رہے، آپ نے فرمایا۔

ہم دین کی تائید کے لئے یہاں آئے تھے، مسلمانوں کو کار و بار جہاد میں شریک کرنے کی کوشش کی، آپ کے سردار نے کج فہمی سے کام لیتے ہوئے ہمارا ساتھ چھوڑ کر غیر مسلموں سے اتفاق کر کے اس کے بڑے بھائی یار محمد خاں نے خواہ مخواہ ہمارے ساتھ جنگ کی اور اپنی جان گنوائی۔ پھر ہم نے آپ کے سردار کو خطوں کے ذریعے سے نصیحت کی وہ دین اسلام کی حمایت کے لئے تیار ہو جائے اور غیر مسلموں کا ساتھ چھوڑ دے یہ نصیحت اس پر اثر انداز نہ ہوئی اور جنگ کی نوبت آئی، خدا کی مدد سے اسے شکست ہوئی اور ہمارا لشکر اس کے تعاقب میں یہاں تک پہنچ گیا۔"

ارباب نے آخر میں یہ بھی کہا کہ میں وکیل بن کر صلح کرا رہا ہوں، اگر سردار سلطان محمد خاں اور اس کے بھائی اس کے بعد بھی اپنے وطیرے پر قائم رہے تو میں بھی ان کی رفاقت چھوڑ دوں گا اور آپ کے ساتھ مل جاؤں گا۔

سیّد صاحب نے فرمایا۔

جائیے! میں نے ملک اسے دے دیا۔ شرط یہ ہے کہ وہ بُرے افعال سے خلوص کے ساتھ توبہ کرے۔ غیر مسلموں کی اعانت سے دست کش ہو جائے اور جب ہمیں غیر مسلموں سے مقابلے کی نوبت آئے تو جان و مال اور لشکر سے ہمارا ساتھ دے ساتھ ہی یہ بھی واضح فرما دیا کہ ہم فاتحانہ نہیں بلکہ بطور مہمان پشاور جائیں گے

اور سردار سے عہد و پیمان مستحکم کرکے واپس چلے جائیں گے۔

ظہر کے وقت غازی پشاور کی طرف روانہ ہوئے۔ پیادے سب سے آگے تھے سوار سب سے پیچھے، سیّد صاحب پیادوں کے ساتھ سبزہ رنگ گھوڑے پر سوار تھے ہر جماعت کے ساتھ اس کا نشان تھا۔ بندوقچیوں نے فتیلے روشن کر لئے تھے۔ کہ مبادا اتفاقیہ کوئی ناگوار صورت سامنے آجائے۔ روانگی سے پیشتر سیّد صاحب نے عاجزی کے ساتھ دعا مانگی، عصر اور مغرب کی نمازیں راستے میں ادا کیں، کابلی دروازے سے شہر میں داخل ہوئے۔

سیّد صاحب نے پشاور میں داخل ہونے سے پہلے سب غازیوں پر واضح فرما دیا تھا کہ ہم بطور مہمان جا رہے ہیں، اس لئے کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا جائے۔ غازی بھوکے تھے لیکن امام کے حکم کی پابندی میں کھانے کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا۔ رات اس حالت میں گزار دی صبح بازار سے کھجوریں خرید کر سب کو ناشتے کے لئے دیں پھر ارباب بہرام خاں نے بنیوں کو بلا کر رسد کا انتظام کیا۔ گھوڑے اور اونٹ بھی رات بھر بھوکے رہے صبح کو ان کے چارے کے لئے تگ و دو شروع ہوئی۔

اگرچہ احتیاطاً اعلان کر دیا گیا تھا کہ لشکر کے داخلے کے وقت سب لوگ دکانیں بند کر دیں۔ لیکن چونکہ اکثر لوگوں کو معلوم تھا کہ غازی کسی چیز کو نہیں چھیڑتے۔ اس لئے دکانیں عام طور پر کھلی رہیں۔ بعض دکانوں میں چراغاں کا انتظام تھا۔ ہزاروں مرد اور عورتیں کوٹھوں پر جمع تھیں، غازیوں کی نظریں نیچی تھیں، سب خدا کی حمد و ثنا اور شکر کے پیکر بنے ہوئے تھے سرائے کے دروازے پر پہنچ کر بعض نے بندوقیں سر کرنی چاہیں سید صاحب نے انہیں منع فرما دیا، ارباب بہرام خاں نے سیّد صاحب کے حکم سے یہ اعلان بھی کر دیا کہ سب لوگ اطمینان سے اپنا کاروبار جاری رکھیں۔ کسی کو قطعاً کوئی آزار نہ پہنچے گا اور ایک حبّہ کا بھی نقصان نہ ہوگا۔ البتہ بھنگ خانے اور فواحش خانے

بالکل بند ہو جاتے چاہئیں۔

جب تک کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا سیّد صاحب کے تمام رفقا خاموش تھے جب انہیں معلوم ہوگیا کہ پشاور کو درّانیوں کے حوالے کر دینے کا فیصلہ ہوگیا ہے تو بعض مخلصوں کے دل میں اضطراب پیدا ہوگیا۔ ان کے سامنے درّانیوں کی بدعہدیاں اور خود غرضیاں تھیں وہ جانتے تھے کہ یہ لوگ مجبور ہو جائیں تو ہر شرط قبول کر لینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ جب مطلب نکل جائے، تو انہیں نہ خدا اور رسول کا خوف رہتا ہے نہ دنیا کی شرم۔

ہندوستانی غازیوں کے علاوہ خوانین سمہ، غازیانِ قندھار، دتگر بار اور ملکی لوگوں کو بھی حوالگی پشاور سے اختلاف تھا۔ چنانچہ ارباب بہرام خاں نے سیّد صاحب سے بات کی درّانیوں کے ظلم و ستم اور بدعہدیاں ایک ایک کرکے جتائیں، سیّد صاحب نے فرمایا۔

"رضائے حق کے سامنے ہفت اقلیم کی تاجداری ہیچ ہے۔ اب سلطان محمد خاں تائب ہے۔ دل کا حال خدا جانے۔ حکم شریعت کا مدار تو ظاہر پر ہے ہم کیوں اس کا عذر نہ مانیں؟ ہمارے پاس اس پر کون سی دلیل اور حجّت ہے؟"

یہ ارشاد سن کر سب کے آنسو نکل آئے۔ ارباب نے عرض کیا، مجھ سے غلطی ہوئی معافی چاہتا ہوں۔ آپ میرے لئے دعا فرمائیں۔

مراتب صلح طے ہو چکے تو ارباب فیض اللہ خاں یہ پیام لائے کہ سردار سید صاحب سے ملاقات کے آرزومند ہیں تاکہ بے واسطہ بیعت کر لیں۔ دوسرے دن حضرت سید صاحب سے سلطان محمد خاں کی ملاقات ہوئی۔

اس ملاقات میں سلطان محمد خاں نے تاوان کا مسئلہ چھیڑا۔ سیّد صاحب نے فرمایا آپ ہمارے بھائی ہیں۔ تاوان یا جرمانے کا کوئی معاملہ اب باقی نہیں رہا۔ پھر

سلطان محمد خاں نے ایک محضر دکھایا اور کہا اسی نے ہمیں گمراہ کیا تھا۔ اس میں سید صاحب پر یہ تہمت لگائی تھی کہ وہ انگریزوں کے فرستادہ اور مخبر ہیں۔ یہ محضر لاہور میں رنجیت سنگھ کے کہنے پر تیار ہوا تھا اور اسی کے ذریعے سے سلطان محمد خاں کے پاس پہنچا تھا۔ اس محضر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان علما کی طرف سے سید صاحب اور آپ کے رفقا پر کئی الزام لگائے گئے تھے مثلاً۔

۱۔ سید صاحب اور آپ کے رفقا الحاد و زندقہ میں مبتلا ہیں۔ ان کا کوئی مذہب و مسلک نہیں ہے۔ نفسانیت کے پیرو ہیں اور لذاتِ جسمانی کے جویا۔

۲۔ وہ ظلم و تعدی کے خوگر ہیں۔

۳۔ بلاوجہ شرعی مسلمانوں کے اموال و نفوس پر دست درازی کرتے ہیں۔

۴۔ سید صاحب انگریزی رسالے میں ملازم تھے، مولانا اسمٰعیل اور بعض دوسرے لوگوں نے انہیں مہدی موعود قرار دیا۔ انگریزوں نے ان کو ملک سے نکال دیا۔

۵۔ وہ مکہ معظمہ پہنچے، وہاں سے براہ مسقط بلوچستان قندھار گئے۔

۶۔ خادے خاں کو ملا عبدالغفور راتوند سوات کے ذریعے سے صلح کے بہانے بلایا اور قتل کرادیا۔

۷۔ وہ افغانوں کی لڑکیوں کو جبراً "جدید الاسلام" ہندوستان کے حوالے کرتے ہیں۔

صلح کی شرطیں طے ہوگئیں اور ملاقاتیں ہوچکیں تو سید صاحب نے مولوی مظہر علی کو پشاور کا قاضی مقرر کیا۔ مولوی قمرالدین عظیم آبادی اور چند اور غازیوں کو ان کے ساتھ رہنے کا حکم دیا۔ پھر سید صاحب جانے کے لئے تیار ہوگئے، ارباب فیض اللہ خاں نے ہزارخانی میں دعوت کا انتظام کیا اور پورے لشکر کے لئے دنبوں کا پلاؤ پکوایا، سید صاحب دوپہر کے وقت ہزار خانی پہنچے۔ عصر کے وقت وہیں سے براہ مردان پنجتار روانہ ہوگئے۔

سید صاحب چارسدہ سے روانہ ہوئے۔ تو گڑھی امان زئی میں ٹھہرے وہاں

کاکا احمد خاں ایک سن رسیدہ شخص تھا۔ اس نے عرض کیا کہ یہاں لڑکیوں کا نکاح گراں قدر رقمیں لے کر کیا جاتا ہے رقمیں مقرر کر کے نکاح کر دیئے جاتے ہیں۔ جب تک دولہا کی طرف سے رقم پوری نہیں ہو جاتی۔ دلہنوں کی رخصتی عمل میں نہیں آتی وہ گھروں میں بیٹھی بیٹھی بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ خود عورتوں نے بھی سیّد صاحب کے پاس پیغام بھیجا تھا کہ آپ سب کی اصلاح فرماتے ہیں۔ ہمارے حالِ زار پر بھی توجہ مبذول فرمایئے۔

سیّد صاحب نے حسب عادت شریف اگلے دن بستی والوں کو بلا کر وعظ و نصیحت فرمائی۔ لوگوں نے آپ کا حکم قبول کر لینے کا اقرار کیا تو فرمایا کہ جن لڑکیوں کے نکاح ہو چکے ہیں اور ان کے شوہر چار چار کوس کے اندر ہیں، ان کو آٹھ روز کے اندر رخصت کر دیا جائے جن لڑکیوں کے شوہر دُور گئے ہوئے ہیں، ان کی رخصتی کے لئے ایک ماہ کی مہلت مناسب ہو گی۔ جو شوہر غیر ممالک میں ہیں، ان کی بیویوں کو تین ماہ میں شوہروں کے گھر بھیج دیا جائے

سلطان محمد خاں کے عہد اطاعت کے بعد خیبر سے لے کر امب تک پورے علاقہ سرحد کے وسائل سیّد صاحب کی دسترس میں آگئے تھے مخالف عناصر ختم ہو چکے تھے اب اطمینان کے ساتھ ایک زبردست لشکر منظم کر کے سکھوں پر کامیاب یورش کے بہترین امکانات پیدا ہو گئے تھے۔ اگر سیّد صاحب کشمیر کی طرف پیش قدمی کرتے تو سلیمان شاہ والی چترال زیادہ سے زیادہ امداد کے لئے تیار تھا اور کشمیر پر سکھوں کا قبض و تصرف خاصا کمزور نظر آ رہا تھا، جسے ختم کر دینا مشکل نہ تھا۔ پنجاب کی طرف بڑھتے تو غلزئی قبیلے کے سردار ساتھ دینے پر آمادہ تھے۔ ابتدائی کامیابی کے بعد افغانستان، بلوچستان اور سندھ کو بھی رفاقت پر آمادہ کر لینے کے قوی امکانات موجود تھے، سلطان محمد خاں کو جو علاقہ واپس کیا گیا تھا۔ زرخیز تھا اس علاقے کی آمدنی بدنظمی کی حالت میں بھی دس لاکھ سے کم نہ تھی، سیّد صاحب جب سے سرحد پہنچے تھے۔ سازگار حالات کا ایسا روشن دور کبھی نہ آیا تھا۔

سردارانِ پشاور جب اطمینان سے بیٹھ گئے تو خفیہ خفیہ سازش کا بندوبست شروع کر دیا۔ جگہ جگہ ان کے قاصد دوڑنے لگے تاکہ ڈھب کے آدمی ساتھ ہو جائیں اور سید صاحب کے بکھرے ہوئے غازیوں کو ایک ہی وقت میں جا بجا شہید کر دیا جائے۔

سرحدی پٹھان صدیوں سے قبائلی طریقوں کے خوگر چلے آتے تھے۔ جو چیزیں مرزمان سے ان کی زندگی کا لاینفک جزو بن چکی تھیں انہیں شرعی احکام کی طرح مان رہے تھے اور ان کا ترک گوارا نہ تھا۔ کلمۂ توحید پر وہ بے شک ثابت قدم تھے۔ اسلام کے ساتھ محبت بھی تھی۔ لیکن اسلامی نظم وجمعیت سے یا تو کبھی شناسا ہی نہ ہوئے تھے یا یہ شناسائی باقی نہیں رہی تھی، سید صاحب نے انہیں ضروریاتِ دین سے آگاہ کیا تو ان میں اصلاح کی ایک روچلی، بیعت بھی کر لی۔ لیکن اس بیعت کا مطلب ان کے نزدیک صرف یہ تھا کہ نماز ادا کرتے رہیں گے، جب ہر مقام پر باقاعدہ تحصیلدار مقرر ہو گئے اور ان کے ساتھ حساب کتاب کے لئے محرّر بیٹھ گئے تو یہ امر بعض لوگوں خصوصاً ملّاؤں پر بہت شاق گزرا۔ بے خبر اور سادہ لوح پٹھانوں کے اسلام کی زمام ملاؤں ہی کے ہاتھ میں تھی انہوں نے خفیہ خفیہ سیّد صاحب کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا اور پٹھانوں کو اسلام کے نام پر اسلام کے خلاف مشتعل کرنے لگے۔ سید صاحب نے پٹھانوں کی مجلسی اور اخلاقی اصلاحات کا کام سرگرمی سے جاری کیا تو ملّاؤں کو اشتعال انگیزی کا ایک مؤثر حربہ مل گیا۔ وہ پٹھانوں سے کہنے لگے کہ دیکھو اب تو تمہاری ناموس بھی محفوظ نہیں رہے یہ حالات سردارانِ پشاور کے لئے عین حسبِ مراد تھے۔ انہوں نے پورا فائدہ اٹھایا اور خودغرض ملّاؤں کے ذریعے سے پورے علاقے میں سازش کا وسیع جال بچھا دیا۔

پٹھانوں کے دل تو شرعی پابندیوں پر راضی نہ تھے۔ لیکن سیّد صاحب کے خلاف قدم اٹھاتے ہوئے انہیں یہ اندیشہ ضرور پریشان کر رہا تھا کہ یہ مخالفت کہیں خدا کی طرف سے وبال کا سرچشمہ نہ بن جائے، اس موقع پر سلطان محمد خاں نے وہ محضر ملّاؤں

کے حوالے کر دیا۔ ملاؤں نے اسی محضر کو دکھا دکھا کر پٹھانوں کو اطمینان دلایا کہ سیّد صاحب کی مخالفت حقیقت میں دین کی بہت بڑی خدمت ہے اور اس کے لئے خدا کی بارگاہ سے اجر و ثواب ملے گا۔ اس طرح سازش کی کامیابی کے لئے سازگار فضا مہیا کر لی گئی ظاہر ہے کہ جب ایک چیز ناگوار خاطر ہو اور اس کی مخالفت کے لئے دینی سہارا بھی مہیا کر دیا جائے۔ تو مخالفت میں کسے تامل ہوگا ؟

سیّد صاحب اور سردارانِ پشاور کے درمیان مصالحت ارباب فیض اللہ خاں نے کرائی تھی۔ ارباب نے سیّد صاحب سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر اب کے سرداروں کی طرف سے کوئی بے جا حرکت یا بے عنوانی سرزد ہوئی تو میں ان کا ساتھ چھوڑ کر غازیوں کی معیّت اختیار کر لوں گا۔ مصالحت سے تھوڑے ہی دن بعد اس نے بھانپ لیا کہ سرداروں کی نیّت صاف نہیں ہے، جب اسے مخالفانہ جوڑ توڑ کی اطلاعات میں تو سات دل سے مولوی مظہر علی صاحب قاضی پشاور کو آگاہ کر دیا کہ ان لوگوں کی نیّت میں فتور ہے۔ یہ غدّار بغاوت کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ آپ امیرالمومنین کو اطلاع دے کر اپنے لئے مناسب احکام لے لیں۔

مولوی صاحب نے مناسب سمجھا کہ عجلت کے بجائے خود حالات کا پورا اندازہ کرنے کے بعد سیّد صاحب کو لکھیں، اس اثنا میں ایک روز سلطان محمد خاں نے انہیں بلا لیا۔ وہاں کچھ علماء جمع تھے اور یار محمد خاں کے قتل کی باتیں ہو رہی تھیں۔ مولوی مظہر علی صاحب کے پہنچتے ہی سلطان محمد خاں نے پوچھا کہ میرے بھائی (یار محمد خاں) کو کیوں مارا گیا ؟ مجلس کے ہر فرد نے جوش و خروش کے ساتھ یہی سوال دہرایا مولوی صاحب نے اطمینان سے جواب دیا کہ شور مچانے سے کچھ فائدہ نہیں۔ ٹھنڈے دل سے سوال کرو اور ایک ایک بات کا جواب سنتے جاؤ۔ پھر مختلف سوالوں کے جواب میں بتایا کہ خادے خاں کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے یار محمد خاں نے کمر باندھی، امیرالمومنین نے ہر چند سمجھایا، خان پر

کچھ اثر نہ ہوا۔ لہٰذا جو کچھ پیش آیا، اس کے ذمہ دار امیرالمومنین کیوں کر ہو سکتے ہیں؟

پھر مولوی صاحب سلطان محمد خاں سے مخاطب ہوئے اور پوچھا کہ اگر آپ کے دل میں اس معاملے کے متعلق کوئی خلش تھی تو امیرالمومنین کی بیعت سے پیشتر اس کا ازالہ کیوں نہ کرا لیا۔ ؟ سردار نے جواب دیا کہ اس وقت ہمارے علماء سید صاحب کے عساکر کے خوف سے پہاڑوں میں جا چھپے تھے اور ہمیں کچھ معلوم نہ تھا، تحقیقات کے بغیر بیعت کر لی۔

مولوی مظہر علی کی طرف سے یہ روداد پنجتار پہنچی تو مولانا شاہ اسمٰعیل نے سید صاحب کے حکم سے ایک مفصل مکتوب مولوی مظہر علی کے نام بھیج دیا۔

جس روز قاصد مولانا اسمٰعیل کا مندرجہ بالا مکتوب لے کر پشاور روانہ ہوا اسی روز شیخ حسن علی کا بھائی عبدالعزیز دکھاڑے سے پنجتار پہنچا اور عرض کیا کہ مسجد دکھاڑا کے امام سید محمد اصغر کو خوانین سمہ کی ایک سازش کا علم ہوا ہے، جس کا مدعا یہ ہے کہ سید صاحب کے جو غازی دیہات میں جا بجا بکھرے ہوئے ہیں ان پر رات کے وقت اچانک حملہ کر کے شہید کر ڈالا جائے۔

سید صاحب کو اپنی پاک نفسی پر یقین نہ آیا اور فرمایا۔

"شیخ بھائی! یہ بات خیال میں نہیں آتی، غلط سی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس ملک میں سب رئیس اور خوانین ہمارے موافق ہیں ہم کو ان سے ہرگز ایسی امید نہیں۔ غالباً ہمارے اور ان کے درمیان نا اتفاقی ڈالنے کے لئے یہ خبر اڑائی گئی ہوگی۔"

شیخ نے واپس جا کر اپنے بھائی اور سید محمد اصغر کو سید صاحب کی رائے سنا دی تو انہیں بڑا افسوس ہوا۔ سید محمد اصغر نے دوبارہ شیخ صاحب کو پیغام دے کر بھیجا کہ میری اطلاع غلط نہیں ہے آپ تمام غازیوں کو فی الفور اپنے پاس بلا لیں اور اس معاملے

میں دیر بالکل نہ کریں شیخ عبدالعزیز نے دوبارہ حاضر ہوکر معروضہ پیش کیا، سید صاحب نے از راہ شفقت ان کی پیٹھ تھپکتے ہوئے فرمایا۔

بھائی! یہ بات غلط ہے۔ سمے کے خوانین اور ملک ہمارے دوست ہیں۔ شائد کسی مفسد نے یہ خبر اس غرض سے مشہور کی ہے کہ مسلمانوں میں تفرقہ پڑ جائے۔ آپ جائیں اور اپنے گھر میں دلجمعی سے بیٹھیں۔

شیخ عبدالعزیز دوبارہ دکھاڑے پہنچے اور سید محمد اصغر کو سید صاحب کی گفتگو سنائی تو فرط قلق سے اس پیکر اخلاص کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں، بولا۔ میری اس بات کو یاد رکھنا دو تین روز میں حقیقت آشکارا ہو جائے گی۔

اور ایک روز یکایک منشی امام الدین بیبی والا پشاور سے آدھی رات کو پنجتار پہنچا محمد امین خاں قصوری کی روایت ہے کہ میں پہرے پر کھڑا تھا حضرت برج کے کوٹھے پر محو آرام تھے ایک سوار نے آواز دی۔ میں نے پوچھا کون ہو؟ اور کہاں سے آئے ہو؟ جواب ملا۔ امام الدین بیبی والا ہوں اور پشاور سے آیا ہوں۔ حضرت کو ابھی اطلاع کرو۔

سید صاحب کو اطلاع ہوئی تو برج کی کھڑکی کھول کر پوچھا، کیا بات ہے؟ عرض کیا گیا کہ امام الدین بیبی والا پشاور سے آیا ہے۔ فرمایا خیر ہے؟ پھر اسے اوپر بلالیا اس نے بتایا کہ سرداروں نے مولوی مظہر علی صاحب اور ان کے ساتھی غازیوں نیز ارباب فیض اللہ خاں کو شہید کرڈالا، میں اپنی تلوار صیقل گر سے لینے گیا تو راستے میں ایک شخص نے مجھے الگ لے جاکر واقعہ شہادت بتایا اور کہا کہ فوراً بھاگ جاؤ۔ ورنہ تم بھی مارے جاؤ گے۔ میں وہاں سے نکلا، ہزار خانی سے گھوڑا لیا۔ اس پر زین بھی نہ ڈالی دریا کو عبور کرکے حمزہ علی رسالدار کے پاس پہنچا ان سے دوسرا گھوڑا لے کر یہاں آیا ہوں لے

واقعہ یہ ہوا کہ سلطان محمد خاں نے مولوی صاحب کو مشورے کے بہانے ایک کوٹھڑی میں بلایا۔ وہاں پہلے سے چند آدمی تلواریں لے کر کھڑے تھے جونہی مولوی صاحب

کوٹھڑی میں پہنچے، ان پر ایک دم تلواریں پڑیں اور وہ واصل بہ حق ہوئے۔ ان کے ساتھیوں کو بعد میں شہید کر ڈالا گیا۔ منشی امام الدین اس وجہ سے بچ گیا کہ قیامگاہ پر موجود نہ تھا ارباب فیض اللہ خاں کو اس وجہ سے جام شہادت پلایا گیا کہ وہ مرحوم قول کا سچا اور عہد کا پکا تھا سرداروں کی کمینہ حرکتوں کو مذموم جانتا تھا۔ ان کی سنگدلی اور محسن کشی ملاحظہ ہو کہ جس شخص نے انہیں ریاست دلائی تھی، اسے بھی بے تکلف موت کے گھاٹ اتار دیا یقیناً اس اندیشے کی بنا پر کہ اگر ارباب نے اپنے دعوے کے مطابق غازیوں کا ساتھ دیا تو سازش ناکام ہو جائے گی۔

---

[1] وقائع جلد سوم صفحہ ۲۵۱-۲۵۲ (سید احمد شہید)

باب ۶۷

اب پڑھاؤ نماز ـــــ!

کرتار سنگھ نے جو جال پھیلایا تھا، وہ کامیاب ثابت ہوا۔

رنجیت سنگھ اور دنتورا اور ایلارڈ کی فوجی تاختیں جس تحریک کو ناکام نہ کر سکیں اسے کرتار سنگھ اور ہری سنگھ اور بدھ سنگھ کے مسلمان آلۂ کار ناکام بنانے پر تل گئے۔

اس سازش اور مفسدہ پردازی کو کامیاب ہونے میں کافی دیر لگی، لیکن بہرحال یہ کامیاب ہوگئی۔ حضرت سید صاحب، مولانا اسمٰعیل اور ان کے رفقا، سچے اور پکے مسلمان تھے۔ انہوں نے کافروں کی تدبیروں کا توڑ کر لیا، مشرکوں کے لشکروں کو شکست دی غیر مسلموں کی کیادی اور مکاری کے جال میں نہ پھنسے۔ لیکن مسلمان سے دھوکا کھا گئے۔ اس لئے کہ وہ مسلمان کو ہر حالت میں مسلمان ہی سمجھتے تھے۔

سلطان محمد خاں اب بے نقاب ہوگیا۔ اس کے عزائم اور ارادے کھل گئے معلوم ہوگیا اس نے بیعت اس لئے کی تھی کہ اسے توڑے، اس نے پیمانِ وفا اس لئے استوار کیا تھا کہ جب ضرورت سمجھے کچے دھاگے کی طرح اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے

سب سے بڑا خطرہ سلطان خاں کو سرحد کے پُرجوش عوام کی طرف سے تھا۔ وہ جانتا تھا یہ عوام مذہب کے دیوانے ہیں، مذہب پر جان دیتے، سید بادشاہ کا قلادۂ اطاعت اسی لئے اپنی گردنوں میں ڈالے ہوئے ہیں کہ وہ خدمت الٰہیہ کے پیامبر تحریک اسلامیت کے علمبردار اور اخلاص مسلمین کے ترجمان ہیں، یہ عوام اس وقت تک سید بادشاہ سے اور ان کے مجاہدوں سے برگشتہ نہیں ہو سکتے تھے۔ جب تک انہیں

باور نہ کرا دیا جائے کہ یہ لوگ مسلمان نہیں کافر ہیں، راہ یاب نہیں گمراہ ہیں مصلح نہیں مفسد ہیں، اور اب یہ کام پورا ہو چکا تھا۔ سلطان خاں کے آوردوں نے گاؤں گاؤں اور دیہات دیہات گھوم کر سادہ لوح عوام کو یقین دلادیا تھا۔

کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہی رزکم عیار ہوگا۔

اوران سادہ لوح مسلمانوں نے پروپیگنڈے کی بے پناہ قوت سے متاثر ہو کر اس غلط بات کو مان بھی لیا تھا۔

سید صاحب نے منشی امام الدین کی بات سنتے ہی مولانا شاہ اسمٰعیل اور دوسرے مشیروں سے مشورہ کیا۔ قرار پایا کہ تمام غازیوں کو طلبی کا پیغام بھیج دیا جائے۔ یہ پیغام اسی وقت بھیج دینا چاہیے تھا لیکن شیخ ولی محمد نے عرض کیا کہ رات کے وقت قاصدوں کو بھیجنا مناسب نہ ہوگا۔ صبح انتظام کر لیا جائے گا۔

صبح ہوئی تو سید اسمٰعیل رائے بریلوی کو حکم ملا کہ سید صاحب کی سواری کے گھوڑے پر شیوہ پہنچیں وہاں مولوی محمد رمضان اور دوسرے غازیوں کو یہ سینہ راز یہ خبر سنا دیں۔ اور کہہ دیں کہ سب عجلت کے ساتھ پنجتار آجائیں۔ حمزہ علی خاں کو تاکید کر دی جائے کہ دو دو چار سوار مختلف دیہات میں بھیج کر سب غازیوں کو مراجعت کا پیغام پہنچا دیں۔ — مولانا شاہ اسمٰعیل نے توپیں مسجد کے جنوبی و مغربی گوشے میں نصب کرادیں۔

گڑھی امان زئی کا ایک شخص نصر اللہ خاں اس وقت پنجتار میں تھا۔ وہ سازش میں شریک تھا اور مخبری کی غرض سے پنجتار پہنچا ہوا تھا۔ غازیان پشاور کی شہادت کا واقعہ راتوں رات پنجتار میں سب کو معلوم ہو چکا تھا۔ اس فیصلے کا بھی علم ہو گیا تھا کہ غازیوں کو بہ تاکید بلا لیا گیا ہے۔ نصر اللہ خاں فوراً روانہ ہو گیا اور ہر بستی کے لوگوں کو بتا تا گیا کہ جس کام کے لئے پرسوں رات کا وقت مقرر ہو چکا ہے۔ اسے کل رات ہی پورا کر لینا چاہیے اگر یہ نہ ہوا تو غازی سلامت نکل جائیں گے اور سازش بالکل بے نتیجہ رہے گی۔

سید اسمٰعیل راستے بریلوی شیوہ پہنچے تو حاجی حمزہ علی خاں نے سوار مختلف دیہات میں بھیج دیئے۔ ان کے ذریعہ سے یہی پیغام بھیجا جا سکتا تھا کہ جلد سے جلد پنجتار پہنچو۔ اصل واقعہ بتانا قرین مصلحت نہ سمجھا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غازیوں کو فوری روانگی کا احساس نہ ہوا۔ اکثر نے سمجھا کہ شاید پشاور پر دوبارہ حملہ ہونے والا ہے اور لشکر تیار ہو رہا ہے اس وجہ سے وہ اپنے دیہاتی دوستوں اور شناساؤں سے باطمینان وداعی ملاقاتیں کرتے رہے۔ ان ملاقاتوں میں دیہاتیوں کو غازیوں کے اوقات روانگی کا بھی علم ہو گیا حالانکہ اسے مخفی رکھنا بے حد ضروری تھا۔

مولوی مظہر علی کی شہادت کے بعد غازیوں پر حملوں کا آغاز موضع اسماعیلیہ سے ہوا۔ حاجی بہادر شاہ خاں سید صاحب سے مل کر گڑھی امان زئی جا رہے تھے۔ اسماعیلیہ پہنچے تو لوگوں نے باصرار ایک رات کے لئے ٹھہرا لیا۔ اہل اسماعیلیہ ہی نہیں ساری رزڑ قوم کو حاجی صاحب سے خاص عقیدت تھی وہ ٹھہر گئے۔ انہیں پر تکلف کھانا کھلایا اور عشا کی نماز میں امام بنایا۔ جب وہ پہلی رکعت کے سجدے میں گئے تو موضع کے خاں، اسمٰعیل خاں نے تلوار سے ان کا سر تن سے جدا کر دیا اور اس مرحوم کی روح پاک سبحان ربی الاعلیٰ کے ذکر میں ڈوبی ہوئی اعلیٰ علیین میں پہنچ گئی۔ سبحان اللہ! کیا موت تھی۔ جس پر تقویٰ اور شب بیداری کی سینکڑوں زندگیاں بے تکلف قربان کی جا سکتی ہیں[1]

حاجی بہادر شاہ خاں کی شہادت کے ساتھ ہی اسماعیلیہ میں نقارہ بجا اس کی آواز سن کر بستی بستی نقاروں کا تار بندھ گیا۔ قرارداد کے مطابق یہ اس امر کا اعلان تھا کہ جو کچھ باہم طے کر چکے تھے اس پر عمل کا وقت آ گیا۔ بعض مقامات کے غازیوں کے

---

[1] منظورہ صفحہ ۹۸۰-۹۸۱ (سید احمد شہید)

نقارہ کوبی کو غیر معمولی فعل سمجھ کر وجہ پوچھی تو بے دردوں نے بتایا کہ جندروس کوبی دیوار کوٹنے کے لئے لوگوں کو جمع کرنا منظور ہے تاکہ جلد سے جلد اس کام سے فارغ ہو جائیں پھر عشر حضرت امیرالمومنین کے پاس پہنچا دیں۔ اصل میں "جندروس کوبی" پہلے سے ایک اصطلاح مقرر کرلی تھی جس سے مراد غازیوں کا قتل تھا۔ لیکن غازی بے چارے اس اصطلاح کے حقیقی مطلب سے کیوں کر آگاہ ہو سکتے تھے؟

جو غازی شیوہ میں تھے ان میں سے حافظ عبداللہ، الشیخ ناصرالدین، مولوی محمد رمضان اور شیخ غلام کے سوا سید امیر علی اور حافظ عبدالعلی پھلتی ابن حافظ قطب الدین عشر کی تحریر پر مامور تھے۔ اور اس سلسلے میں دیہات کا دورہ کرتے رہتے تھے، وہ بھی اتفاقیہ شیوہ پہنچ گئے۔ قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں خطرے کا کچھ نہ کچھ احساس تھا۔ نقارے کی آواز سنی تو بھانپ گئے کہ شرارت ہونے والی ہے۔

سید امیر علی کے پاس بیت المال کا پانچ ہزار روپیہ جمع تھا۔ انہیں سب سے پہلے یہ خیال آیا کہ اس روپے کو پنجتار پہنچا دینا لازم ہے۔ چنانچہ فوراً گھوڑے پر سوار ہوئے۔ اور حافظ عبدالعلی کو ساتھ لے کر گاؤں کے باہر پہنچ گئے۔ پھر حافظ صاحب یہ کہتے ہوئے لوٹ گئے کہ میں اس نازک وقت میں اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا آپ کے پاس بیت المال کی امانت ہے گاؤں سے باہر آچکے ہیں۔ آپ چلے جائیں سید امیر علی نے گھوڑا سرپٹ ڈال دیا۔ راستے میں انہیں ایک جانب ذرا فاصلے پر مفسدوں کا گروہ نظر آیا۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی قریب نہ پہنچ سکتا تھا۔

بقیہ غازی ہتھیار سنبھال کر مقابلے کے لئے تیار ہو گئے اسی وقت آنند خاں اور مشکار خاں دوڑے ہوئے مولوی محمد رمضان کے پاس پہنچے اور بہ منت التماس کی کہ ہمارے ہاں چلے چلیے؛ وہاں کسی کو آپ پر حملے کا حوصلہ نہ ہوگا۔ مولوی صاحب نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اس وقت محافظ حقیقی کی حفاظت کے سوا کوئی

جائے پناہ نہیں۔ اگر یہ لوگ ہمیں ختم کر دینے پر ہی تلے بیٹھے ہیں تو ہم سے اپنے بچاؤ کے لئے جو کچھ ہو سکے گا اس میں توقف نہ کریں گے۔

گاؤں والوں نے پورے گاؤں کا محاصرہ کر لیا تھا اور باہر نکلنے کے تمام راستوں پر پہرے بٹھا دیئے تھے۔ غازی باہم یہ طے کر کے بیٹھ گئے کہ رات بھر نگہبانی کا بندوبست جاری رہے، دن نکلے گا تو کسی نہ کسی تدبیر سے محاصرے کو توڑ کر پنجتار چلے جائیں گے۔

نرلانڈی گاؤں والوں نے راتوں رات باہر جانے کے تمام راستوں پر پہرے بٹھا دیے تھے۔ غازیوں کو اس کی ناکہ بندی کا کچھ علم نہ تھا۔ ٹکھمیر خاں کو غسل کی حاجت تھی۔ بڑے تڑکے اٹھے اور ندی کا رخ کیا۔ ایک آدمی نے پوچھا کہاں جا رہے ہو؟ بتایا: "غسل کے لئے ندی پر جا رہا ہوں"۔ ان کا خیال غالباً یہ ہوگا کہ یہ غسل کے بعد واپس آئے گا تو خود بخود مارا جائے گا۔ ابھی تڑکے ہی ہنگامہ بپا ہوا تو دوسرے غازی متنبہ ہو جائیں گے۔

غسل کرتے کرتے اُجالا ہو گیا۔ ٹکھمیر صرف پاجامہ پہن کر نماز کے لئے کھڑے ہو گئے۔ اسی اثنا میں دو آدمی آئے۔ ایک نے ان کی تلوار اٹھالی، دوسرے نے کپڑے سنبھال لئے۔ سلام پھیر کر دیکھا تو سمجھے کہ خوش طبعی کر رہے ہیں۔ اچانک ایک نے زور سے مکا مارا اور دھکا دیا۔ پھر دونوں نے ایک ایک ہاتھ پکڑ لیا۔ اور کھینچتے ہوئے گاؤں کی طرف لے چلے۔

ان آدمیوں میں سے ایک نے دوسرے سے کہا کہ کیوں خواہ مخواہ تکلیف اٹھائیں؟ یہیں اس کا خاتمہ کر دینا چاہیئے۔ دوسرا بولا کہ نہیں اسے بھی وہیں لے جا کر ماریں گے۔ جہاں اس کے ساتھی مرے پڑے ہیں۔ یہ بات سن کر ٹکھمیر کو اندازہ ہو گیا کہ گاؤں میں کیا کچھ پیش آ چکا ہے اور ان کے ساتھیوں کا کیا انجام ہوا ہے۔

اسی رات کھیل سے پیر خاں موذئیں سے پینتیس غازیوں کے ساتھ پہنچ گئے اور شاہ ولی خاں کی مسجد میں اترے۔ ان کی طرف سے رمضان یہ پیغام لے کر آیا کہ پینتیس آدمیوں کی رسد دے دی جائے۔ داؤد خاں نے رسد تول دی۔ غازیوں نے کھانے سے فارغ ہو کر وہیں رات گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس وقت تک غازیوں کے خلاف سازش کی خبر عام ہو چکی تھی۔ ایک نیک دل مُلّا نے پیر خاں کو بہ صیغۂ راز یہ خبر پہنچائی اور مشورہ دیا کہ یہاں سے فوراً نکل جایئے یہ غازی لمبی منزل طے کر کے پہنچے تھے اور پیش آنے والے واقعات کا انہیں قطعاً اندازہ نہ تھا۔ بولے۔ ذرا سستا لیں، پھر روانہ ہو جائیں گے۔ ملّا بیچارے نے دلسوزی سے کہا کہ میں نے سمجھا دیا اب آپ مختار ہیں۔ غازیوں نے کچھ خیال نہ کیا اور اطمینان سے سو گئے۔

ان میں سے دو آدمی نکل کر گودام میں پہنچ گئے۔ ایک یوسف علی خاں، دوسرا حبیب خاں۔ اس طرح گودام میں پانچ غازی جمع ہو گئے اور مسجد میں تینتیس غازی رہے گودام والوں نے باہم فیصلہ کیا کہ چار سو جائیں اور ایک پہرہ دے۔ یکایک گولی چلی۔ خدا بخش رام پوری نے پوچھا۔ پہرے پر کون ہے؟ معلوم ہوا داؤد خاں ہے پوچھا گولی کدھر سے آئی؟ جواب ملا قبلے کی سمت سے۔ پھر دوسری گولی چلی خدا بخش نے ساتھیوں کو ہوشیار کیا۔ باہر صحن میں نکل کر دیکھا تو معلوم ہوا گودام کا محاصرہ ہو چکا ہے۔ بلکہ پچھواڑے سے بعض لوگ چھت پر پہنچ چکے ہیں۔

گودام کے غازیوں میں سے یوسف علی خاں اور حبیب خاں کے پاس تلواریں بھی تھیں۔ بندوقیں بھی۔ مولوی خدا بخش کے پاس صرف تلوار تھی اور داؤد خاں کے پاس صرف نیزہ تھا۔ پانچویں رفیق کے پاس صرف لاٹھی تھی۔

یکایک چھت پر سے پتھر برسنے لگے۔ داؤد خاں نے ایک آدمی کی طرف نیزہ

تا نا اس نے کوٹھے پر سے نیزہ پکڑا کر اوپر کھینچ لیا۔ سب غازی کمرے میں گھس گئے اور اندر سے کنڈا لگا لیا، بلوائی صحن کی دیواریں پھاند کر اندر آ گئے، گودام کے کمرے کا قفل توڑا اور رسد لوٹنے لگے۔ کمرے کے دروازے سے دیوار میں نقب لگانے کی آوازیں آئیں غازیوں نے طے کیا کہ باہر نکلیں۔ دروازہ کھولا۔ بلوائی لوٹ میں لگے ہوئے تھے چاروں ساتھی صحن کے دروازے کی طرف بڑھے۔ خدا بخش بیماری کے باعث کمزور ہو گیا تھا اور زیادہ چل نہ سکتا تھا۔ کھسکتا کھسکتا صحن کے اس حصے میں پہنچا جہاں دیوار کے ساتھ لکڑیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ڈھیر پر سے ہوتا ہوا دیوار پر جا بیٹھا۔ دوسری طرف ایک مُلّا کا گھر تھا کہ ایک ملّا داؤد خاں کو لایا اور اپنی اندھی والدہ کو کہا کہ اسے کہیں چھپا دو۔ میں پھر باہر جاتا ہوں شاید کوئی اور مظلوم مل جائے۔ اور اسے بچا کر لے آؤں۔

یہ سن کر اس کی ڈھارس بندھی۔ تلوار میان میں کی، کالے کمبل میں لپٹا ہوا آہستہ آہستہ مُلّا کے گھر میں اتر گیا اور صحن میں توت کے درخت کے پیچھے جا کر بیٹھ گیا۔ اس اثنا میں مُلّا کی بیوی باہر نکلی وہ کہہ رہی تھی کہ اس گاؤں کے لوگ کافر ہو گئے ہیں اور بے چارے غازیوں کو ناحق قتل کرتے ہیں اچانک اس کی نظر خدا بخش پر پڑی۔ پوچھا، ہندوستانی ہے؟ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ اسے بھی اندر اس جگہ لے گئی جہاں داؤد خاں پہلے سے موجود تھا۔ پھر یوسف علی خاں کو مُلّا لے آئے۔

اس طرح رات کو تو بچ گئے لیکن یہ اندیشہ لگا رہا کہ صبح ہوتے ہی دیکھیے کیا پیش آئے۔ مُلّا نے داؤد خاں اور یوسف خاں کو صبح ہونے سے پہلے باہر بھیج دیا خدا بخش بیمار ہونے کے باعث جا نہیں سکتے تھے، صبح ہوئی تو بلوائیوں نے خانہ تلاشی شروع کی۔ ملّا کے گھر پہنچے تو اس نے صاف صاف بتا دیا کہ میرے پاس تین غازی تھے۔ دو چلے گئے، تیسرا بیمار ہے، اسے ہرگز نہ دوں گا، اگر زور سے کام ہو گا تو میں بھی اپنے ساتھیوں کو بلا کر لڑائی کروں گا۔ اس طرح خدا بخش کی جان بچی۔

اب پیر خاں اور اس کے ساتھیوں کا حال سنیئے، جو تھکے ماندے آئے تھے اور تھوڑی دیر آرام کی غرض سے مسجد میں ٹھہر گئے تھے۔ راتوں رات اس مسجد کے گرد گھیرا ڈال لیا گیا۔ علی الصباح لڑائی شروع ہوگئی۔ خدا بخش رام پوری نے اپنی پناہ گاہ سے مُلّا کو بھیجا کہ ان کی خبر لا دیجئے۔ اس نے واپس آکر بتایا کہ ابھی جنگ ہو رہی ہے غازیوں کے بچ نکلنے کی کوئی راہ نہیں۔ بلوائی چھتوں پر بھی بندوقیں اور پتھر لئے بیٹھے ہیں۔ غازیوں کی گولیاں ان تک نہیں پہنچتیں۔

غازیوں کے پاس مقابلے کے لئے سامان نہ رہا تو وہ مسجد کے اندر چلے گئے کسی کو ان کے قریب جانے کی جرآت نہ تھی۔ آخر بلوائیوں نے فیصلہ کیا کہ مسجد کو آگ لگا دی جائے۔ پھر چند علما اور سیّد آگئے۔ انہوں نے بلوائیوں سے کہا کہ ان غازیوں کو کیوں مارتے ہو؟ یہ حاجی ہیں، مہاجر ہیں، تمہارا انہوں نے کیا بگاڑا ہے؟ بعض عورتوں نے بھی اس ظلم کے خلاف نفرت کا اظہار کیا۔ بستی میں جو ہندو رہتے تھے انہوں نے بھی کہا کہ تمہیں روپے چاہئیں تو ہم سے لے لو اور ان غازیوں کو ہمارے حوالے کر دو۔ ہم انہیں سیّد بادشاہ کے پاس پہنچا دیں گے۔ شاہ ولی خاں (برادر معز اللہ خاں رئیس غنیؒ) بھی دوڑا آیا اور بولا میں اپنی مسجد کو نقصان نہ پہنچنے دوں گا۔ بلوائیوں نے کسی کی نہ سنی اور مسجد کو آگ لگانے کا فیصلہ ہوگیا۔

غازی یہ سب باتیں سن رہے تھے۔ جب انہیں یقین ہوگیا کہ خانۂ خدا میں بھی امن سے بیٹھے رہنے کی کوئی صورت نہیں رہی تو تلواریں سونت کر باہر نکل آئے پیر خاں سب سے آگے تھے۔ اتفاق سے انہوں نے ٹھوکر کھائی اور گر پڑے۔ ایک جوان نے ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ پوری جماعت بہ جانب مشرق روانہ ہوگئی۔ ان کے پاس کوئی نہیں آتا تھا۔ بلوائی ان کا چھوڑا ہوا مال و اسباب لوٹنے لگے۔ غازی ندی پر پہنچ گئے رات بھر کے پیاسے تھے بے اختیار پانی پر لپکے۔ اس اثنا میں ایک ہجوم عظیم ان کے سر پر پہنچ

گیا۔ غازی ندی کے بہاؤ میں تھے۔ ان پر پتھروں اور نیزوں اور تلواروں کی بارش شروع ہوگئی۔ صرف آٹھ آدمی بچ کر اِدھر اُدھر نکل سکے پچیس یا چھبیس اسی ندی میں ابدی نیند سو گئے۔

حاجی محمود خاں پندرہ غازیوں کے ساتھ سدم میں مقیم تھے۔ بلوا ہوا تو محمود خاں اپنی جماعت کو لے کر گاؤں سے باہر ندی پر جا ٹھہرے۔ گاؤں والے انہیں دور سے آوازیں دیتے تھے قریب کوئی نہیں آتا تھا۔ اس اثناء میں مبین خاں رئیس سدم بھی پہنچ گیا۔ اسی نے اسماعیلیہ میں حاجی بہادر شاہ خاں کو شہید کرایا تھا۔ حاجی محمود خاں کے پاس بیٹھ کر دیا کاروں کی طرح اظہار اخلاص کرنے لگا اور بولا دن کو تو ممکن نہیں ذرا ٹھہر جائیے، رات کو پنجتار پہنچا دوں گا۔ محمود خاں اس کے فریب میں آگئے اور جس دام بلا سے رہائی پا چکے تھے۔ اس میں خود دوبارہ جا پھنسے۔

غازی گاؤں میں پہنچ گئے۔ تو مبین خاں نے چکنی چپڑی باتیں کر کر کے ان کے ہتھیار بھی لے لئے۔ سب نہتے ہوگئے تو ایک دم ان پر بلّہ بول دیا۔

ہر کسے را بے رحمی تمام بہ زخمہائے شمشیر و کارد تمام ساختند۔ بعضے را بہ زمین غلطانیدہ چوں میش و بُز ذبح کردند چنانکہ عظیم اللہ خاں برادر حاجی محمود خاں را پدر زوجۂ شاں بہ سینہ سوار شدہ ذبح نمود، ہمراہ ایں گروہ قربان راہِ مولائے حقیقی شدند۔

ہر شخص کو تلوار اور چھری سے بے دردانہ شہید کر ڈالا۔ بعض کو بھیڑوں اور بکریوں کی طرح زمین پر لٹا کر ذبح کر دیا گیا۔ مثلاً عظیم اللہ خاں برادر حاجی محمود خاں کو اس کے خسر نے چھاتی پر بیٹھ کر ذبح کیا۔ اس طرح یہ گروہ اپنے مولائے حقیقی کی راہ میں قربان ہوگیا۔

حیرت اس بات پر ہے کہ حاجی محمود خاں سدم والوں کے ہم قوم تھے اسی وجہ سے ان کے بھائی نے سدم میں شادی کی تھی۔ لیکن سنگدلی ملاحظہ ہو کر خسر نے چھُری

ے کر اپنے داماد کو ذبح کیا اور بیٹی کو بیوہ بنایا. ستر آدمیوں میں سے صرف دو اس طرح بچ کر بھاگ کر ایک بڑھیا کے گھر میں گھس گئے۔ اس نے از راہ خدا ترسی انہیں بھس میں چھپا دیا۔ بعد میں وہ راتوں رات پنجتار پہنچ گئے اور یہ خونچکاں داستان سنائی۔

مظلوم غازیوں میں سے ایک حافظ الٰہی بخش تھا۔ صرف تیرہ چودہ برس کی عمر، قرآن کا حافظ، اپنے ماموں نور خاں کے ساتھ کسی گاؤں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ دونوں آرام سے سو رہے تھے کہ دفعتاً نقارہ بجا۔ نوعمر مجاہد نے ماموں کو جگایا۔ نور خاں دریافت حالات کے لئے باہر نکلا۔ بلوائیوں کا شور سن کر مجاہد نے کو آواز دی کہ میری تلوار دو۔ تلوار پہنچنے سے پیشتر شیر دل غازی کا جسم خاک و خون میں لوٹنے لگا۔ ایک شقی نے نوعمر حافظ کے سر پر تلوار ماری۔ دوسرے نے اسے روک دیا کہ یہ حافظ قرآن ہے میں اسے غلام بناؤں گا۔[1]

اس طرح الٰہی بخش کی جان بچ گئی۔ بچانے والا اسے اپنے گھر لے گیا اور بچوں کو قرآن پڑھانے پر مامور کر دیا۔ الٰہی بخش پشتو خوب سمجھتا تھا لیکن یہ راز کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ اس کے سر پر زخم تھا۔ جس جراح کو علاج کے لئے مقرر کیا گیا۔ وہ بدبخت ایسا مرہم لگاتا رہا جس سے زخم اچھا ہونے کے بجائے بگڑتا جائے۔

حافظ جس دن سے ان ظالموں کے قبضے میں آیا تھا۔ برابر تدبیریں سوچتا رہا کہ کس طرح نجات حاصل کروں قرآن پڑھنے کے لئے ایک بالغ شاگرد بھی اس کے پاس آتا تھا۔ اس کے اخلاص کا اندازہ کر کے اپنا ہم راز بنایا۔ پانچ روپے اجرت طے کی۔ موقع پا کر اس کی رہنمائی میں سدم سے نکلا۔ سید صاحب اس زمانے میں پنجتار سے

---

[1] سید صاحب کے سامنے یہ واقعہ بیان ہو رہا تھا۔ راوی جب ان الفاظ پر پہنچا تو حضرت نے فرمایا اور الٰہی بخش غلام خداست کسے را چہ یارا کہ اورا بہ غلامی بگیرد (منظورہ صفحہ ۹۰۰ سید احمد شہید)

ہجرت کرکے راج دواری پہنچ چکے تھے، حافظ الٰہی بخش وہیں خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی اسیری کی کہانی سنائی۔

سر کا زخم بدستور تھا۔ سیّد صاحب نے اسی وقت نور بخش جراح کو علاج کا حکم دیا جراح نے زخم دیکھا تو کہا کہ پہلے معالج نے بدخواہی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ سر کی ایک ہڈی خراب ہو چکی ہے، اسے کاٹے بغیر زخم اچھا نہیں ہو سکتا۔ الٰہی بخش نے صبر و سکون کے ساتھ ہڈی کٹوائی اور پٹی بندھوائی، جب غازیوں نے اسے اٹھا کر بستر پر پہنچانا چاہا تو انکار کر دیا کہ میرے پاؤں زخمی نہیں ہیں، اٹھانے کی ضرورت ہو۔ تھوڑی دیر بستر پر لیٹا رہا۔ پھر خود چل کر ایک ایک غازی کے ڈیرے پر گیا اور سب سے ملا۔ تمام غازی اس نوعمر کی جرأت اور تحمل شدائد پر حیران تھے۔

یہ لوگ تھے جو سیّد صاحب کی صحبت میں تیار ہوئے تھے۔ تیرہ چودہ برس کا لڑکا اس کی دانائی اور دوراندیشی پر غور کیجئے۔ کہ دشمنوں کے درمیان مہینے گزار دیئے ان سب کے راز معلوم کرتا رہا اور اپنا کوئی راز ان پر ظاہر نہ ہونے دیا بلکہ انہیں یہ بھی پتہ نہ لگ سکا۔ کہ حافظان کی ساری باتیں سمجھتا ہے، ہمت و استقامت کو سامنے لایئے کہ ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے اصل مرکز سے غافل نہ ہوا۔ مشکلات کے باوجود اس ارادے پر قائم رہا کہ جلد سے جلد سیّد صاحب کے پاس پہنچ جائے پھر خود ہی رہبر کا انتظام کیا ایک نوعمر بچے کے لئے یہ اندازہ کر لینا سہل نہ تھا کہ جس شخص کو رہبری کے لئے چنا گیا ہے، ضبط راز کی صلاحیت میں اس کا پایہ کیا ہے؟ تحمل شدائد کی ہمت دیکھئے کہ سر پر گہرا زخم لگا اور اسے برداشت کر لیا۔ سدم سے راج دواری تک کٹھن سفر سے نہ گھبرایا۔ سر کی ہڈی کاٹی گئی اور آہ تک نہ کی۔ غازیوں نے اٹھا کر بستر پر لٹانا چاہا تو بولا اس کی ضرورت نہیں اور خود بستر پر گیا پھر ذرا آرام کر کے سب سے ملا۔ مسلمانوں کی کتنی بدنصیبی تھی کہ ان اخلاق اور ان صفات کے مجاہد بے دردی سے موت کے گھاٹ اتر گئے۔

آتش بہ دوست خویش در خرمن خویش
چوں خود زدہ ام چہ نالم از دشمن خویش
کس دشمن من نیست، منم دشمن خویش
اے وائے من و دست من و دامن خویش

قتل کرنے والوں نے اسلامیت تک کی پروا نہیں کی۔

وقتے عشا بعضے را در نماز و بعضے را در تہیۂ آں مثل طہارت وغیرہ گرداگرد شاں محیط شدہ قتل آغاز نہادند و در بعضے دیہہ وقت نیم شب و در بعض ساختند کم کسے بود کہ فرصت یافتہ فرار نمود یا در جائے محفوظ خزید[1]

عشا کے وقت بعض نماز میں مشغول تھے، بعض نماز کی تیاری کے سلسلے میں طہارت وغیرہ کر رہے تھے کہ ان کے گرد گھیرا ڈال کر کشت وخون کا آغاز کر دیا بعض دیہات میں آدھی رات کو، بعض نمازِ فجر سے پیشتر یا عین حالت ادائے نماز میں نمازیوں کو قتل کر ڈالا۔ کم لوگ تھے جو فرصت پا کر بھاگ سکے یا کسی محفوظ جگہ گھس سکے۔

شقاوت کی انتہا یہ ہے کہ شہیدوں کی لاشوں کو گھوڑوں کے پاؤں تلے روندتے اور کہتے کہ اٹھو اور نماز کی تاکید کر دیا عُشر لو[1]

---

[1] یہ واقعات سیرت سیّد احمد شہید، غلام رسول مہر، سے ماخوذ ہیں۔

باب ۶۸

نہیں بھولتا آہ رخصت کا وقت

زلیخا اور فاطمہ میں اب ملنا جلنا تقریباً بند ہو چکا تھا زلیخا کی باتوں سے پہلی مرتبہ وہ جتنی متاثر ہوئی تھی، گلباز خاں کے ایک انجھر نے سارا تاثر ختم کر دیا حبیب خاں سے رشتہ اور قرابت کی بنا پر اسے جو ہمدردی تھی رفتہ رفتہ وہ بھی زائل ہو چکی تھی وہ گلباز خاں کو حق پر سمجھتی تھی اور حبیب کو باطل پر، یار محمد خاں کے قتل کے بعد گلباز خاں کے عروج و فروغ کا دروازہ کھل گیا یار محمد خاں بھی اس کی قدر کرتا تھا۔ انعام واکرام سے نوازتا تھا لیکن سلطان محمد خاں کی چشم عنایت نے دوسرے درآنی سرداروں کو بھی اس پر مہربان کر دیا تھا۔ اب جب کبھی اپنے گاؤں آتا تھا تو فاتحانہ اور امیرانہ شان سے آتا تھا۔ سب لوگ اس سے مرعوب رہتے تھے۔ حبیب خاں کو پہلے وہ بے وقوف سمجھتا تھا اب حقیر اور کم مایہ سمجھنے لگا تھا۔ حبیب خاں دنیاوی جاہ و منزلت میں اس کا کہاں سے مقابلہ کر سکتا تھا؟ یہی جذبہ رفتہ رفتہ فاطمہ میں بھی بڑھا۔ زلیخا نے یہ رنگ دیکھا تو خاموشی کے ساتھ الگ ہو گئی گویا وہ فاطمہ سے واقف ہی نہیں ہے۔

گاؤں میں سید بادشاہ اور ان کے ساتھیوں کی ناکامی کی خبریں تیزی سے پہنچتی رہتی تھیں۔ ان خبروں کا ذریعہ خود گلباز خاں تھا یا اس کے آدمی۔ ادھر کچھ عرصہ سے پشاور اور دوسرے مقامات مجاہدوں اور غازیوں کے قتل عام اور ہلاکت و بربادی کے جو حادثات رونما ہو رہے تھے وہ بھی گاؤں کے گھر گھر میں پہنچ رہے تھے۔ زلیخا سنتی تھی اور خاموش رہتی تھی۔ اس نے گھر میں لوگوں سے بات چیت کم کر

دی تھی۔ لاڈو، لاکھ لاکھ اس کا جی بہلانے کی کوشش کرتی، لیکن زلیخا کچھ ایسی کھوئی گئی تھی کہ اس کی باتوں میں بھی دلچسپی نہیں لیتی تھی۔ وہ ہر وقت خاموش رہتی تھی نہ جانے کس خیال میں ڈوبی ہوئی گھر کی عورتیں اس کی دل رہی اور دلجوئی میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کرتی تھیں۔ اس لئے کہ اس کے اخلاق، اوصاف اور وضع وطریق نے گھر کے ہر فرد پر ایک نقش قائم کر دیا تھا۔ لیکن ان دلجوئیوں سے بھی دل کی مرجھائی ہوئی کلی نہیں کھلتی تھی۔

وہ بڑی حوصلہ مند عورت تھی۔ اب تک اس کی آنکھ سے آنسو کا ایک قطرہ بھی نہیں ٹپکا تھا۔ اب تک اس کی زبان شکوہ وشکایت سے آشنا نہیں ہوئی تھی۔ اب تک اس کے عزم واستقامت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ لیکن اس کے بعد ہر شخص اسے دیکھ کر سمجھ سکتا تھا۔ کوئی غم ہے جو اندر ہی اندر گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے اور وہ غم حبیب کی جدائی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا؟

جب سے حبیب خاں گیا تھا اس کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ اس کا کوئی حال معلوم نہیں ہوا تھا۔ اس کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں آتی تھی، اور اب حالت یہ ہوگئی تھی کہ وہ اس کے بارے میں کچھ پوچھتے ہوئے بھی احتیاط کرتی تھی۔ کہیں کوئی ایسی خبر نہ سننا پڑے جس سے دل کے ٹکڑے ہو جائیں اور دماغ جواب دے دے۔

وہ حبیب کی سرگرمیوں سے واقف تھی۔ اس کے اغراض ومقاصد سے اتفاق رکھتی تھی، لیکن جب تک وہ زندہ تھا اس سے غافل کیوں کر ہو سکتی تھی؟

پھر وہی رات کا وقت تھا۔ لاڈو اس کے پاس بیٹھی پاؤں دبا رہی تھی اور سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی، وہ آنکھیں بند کیے چپ چاپ لیٹی تھی۔ نہ جانے کس جہان کی سیر کر رہی تھی کہ کانوں میں ایک دلنواز جاں پرور اور روح افزا نغمہ گونجا۔

" زلیخا! ——————۔

اس نے آنکھ کھولی تو حبیب خاں کھڑا مسکرا رہا تھا۔

حبیب خاں کے آتے ہی لاڈو چلی گئی، وہ زلیخا کے پاس اس جگہ جہاں لاڈو بیٹھی تھی۔ بیٹھ گیا۔ محبت اور پیار سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"کیسی طبیعت ہے؟"

زلیخا نے ہاتھ چھڑالیا اور روٹھے ہوئے لہجہ میں جواب دیا۔

"خدا کا شکر ہے"

حبیب خاں:۔ (مسکراتے ہوئے) کچھ خفا معلوم ہوتی ہو۔

زلیخا:۔ آپ کو کیا؟ ——— اگر میں خفا ہوں تو کیا آپ منالیں گے؟

حبیب خاں:۔ ہاں، ضرور منالوں گا۔

زلیخا:۔ تو منائیے پھر۔

حبیب خاں:۔ من جاؤ۔

زلیخا:۔ واہ کہیں اس طرح منتے ہیں؟

حبیب خاں:۔ پھر اور کس طرح منتے ہیں۔ بتاؤ وہ ترکیب بھی کر دیکھوں گا۔

زلیخا:۔ (سنجیدگی سے) یہ باتیں چھوڑیئے، بتایئے اتنے دن سے کہاں تھے؟ کیا آپ نے یہ سمجھ لیا تھا کہ زلیخا مر گئی؟ زلیخا کی پرواہ نہیں تھی، تو اس ننھی سی جان کا تو کیا ہوتا، جو بہت جلد عالم وجود میں آنے والی ہے۔

حبیب خاں:۔ مجھے تو جو کچھ پروا اور خیال ہے وہ صرف ایک ہی جان کا ہے۔ جو بظاہر تو بڑی ہے لیکن درحقیقت ننھی ہی ہے۔

زلیخا مسکرانے لگی۔

"اس طرح آپ اپنی کوتاہیوں کو چھپا لیتے ہیں، ہیں اب الفاظ کے جادو میں

نہیں آؤں گی۔"

حبیب خاں: الفاظ وہی اثر کرتے ہیں، جن میں سچائی ہو۔

زلیخا: چھوڑیئے بھی اس ذکر کو، یہ بتایئے آپ نے آنا کیوں چھوڑ دیا ہے؟

حبیب خاں: دیکھو، ذرا سا موقع پایا اور آگیا۔

زلیخا: کب واپس جائیں گے؟

حبیب خاں: ابھی تھوڑی دیر میں۔

زلیخا: یعنی آج بھی نہیں رہیں گے؟

حبیب خاں: (متاثر ہوکر) نہیں ——— تم نہیں جانتیں، سید بادشاہ اور ان کے ساتھی اس وقت کس دور سے گزر رہے ہیں۔ زمین دشمن ہے آسمان دشمن ہے، دوست اور ساتھی دشمن ہیں، وفادار اور عقیدت مند دشمن ہیں۔

زلیخا: (کڑھتے ہوئے) ہاں مجھے معلوم ہے ——— فاطمہ اور گلباز کے ذریعے تمام خبریں ہر ہر گھر میں مشتہر ہوتی رہتی ہیں۔

حبیب خاں: سید بادشاہ نے یہ تحریک اس لئے شروع کی تھی کہ دشمنوں سے لڑیں گے، کافروں کے سر کاٹیں گے، کافروں سے لڑتے ہوئے، ان کے مجاہد اور غازی جامِ شہادت نوش کریں گے، لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ ہمیں اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے ہاتھوں کافروں اور مشرکوں کے نہیں خاص مسلمانوں کے ہاتھوں شہید ہونا پڑے گا۔ ہمارا مقصد تو بہرحال شہادت تھا، اور وہ حاصل ہے، لیکن ہم پر تلوار کی مشق کرنے والے مسلمان کیا جواب دیں گے۔ خدا کو ——— کبھی موقع ہو تو ذرا فاطمہ سے پوچھنا۔

زلیخا: اس نے تو ملنا ہی چھوڑ دیا۔

حبیب خاں:۔ یہی سلوک میرے ساتھ گلباز خاں کا ہے۔

زلیخا:۔ آخر انجام کیا ہوگا؟

حبیب خاں:۔ خدا کے سوا کون بتا سکتا ہے۔؟

زلیخا:۔ نہ جانے کتنے مجاہد اور غازی ان کم بختوں کے ہاتھوں شہید ہو چکے ہوں گے؟

حبیب خاں:۔ بہت زیادہ۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں ——— (گلوگیر آواز میں)
یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اپنے گھر بار، فرزند و زن، اہل و عیال، مال و دولت وطن اور خاندان سب سے منہ موڑ کر اس سرزمین کو مشرف کیا تھا، ان کے آتے ہی کفر کی گھٹائیں چھٹ گئی تھیں، گمراہی کے بادل پھٹ گئے تھے۔ جہالت کی رسمیں نابود ہوگئی تھیں۔ کافروں کے لشکر سہمے سہمے رہتے تھے۔ مہاراجہ اور اس کے حوالی موالی مجاہدوں کا نام سن کر لرز جاتے تھے، نہ جانے کتنے معرکوں میں ان مجاہدوں نے ان کی گردنیں کاٹیں، انہیں شکست دی، ان کا مقصد حکومت نہ تھا مال نہ تھا، اقتدار نہ تھا، صرف خدا کے دین کی سربلندی تھی لیکن آج ——— یہاں کے مسلمان ان کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ ان کی گردنیں کاٹ رہے ہیں انہیں ہلاک و برباد کر رہے ہیں۔

زلیخا:۔ (بھرائی ہوئی آواز میں) خدا ضرور انتقام لے گا ان سے۔

حبیب خاں:۔ نہیں زلیخا! یہ نہ کہو، ہمارے سید بادشاہ یہ نہیں چاہتے کہ خدا ان سے انتقام لے وہ تو یہ دعا کرتے ہیں کہ خدا ان کے دل بدل دے انہیں راہ راست دکھائے۔ خدمتِ اسلام کی توفیق دے۔

زلیخا:۔ کتنے اچھے ہیں سیّد بادشاہ۔

حبیب خاں:۔ ہاں بہت زیادہ۔ وہ انسانوں میں فرشتہ ہیں۔

زلیخا:۔ بے شک دنیا میں ایسے انسان کم ہی پیدا ہوتے ہیں۔ مگر مسلمانوں ہی نے ان

کی قدر نہ جاتی ــــــــ آپ اچھی طرح کیوں نہیں بیٹھتے مسافروں کی طرح بیٹھے ہوئے ہیں۔

حبیب خاں:۔ ہاں زلیخا! میں مسافر ہی کی حیثیت سے آیا ہوں اور مجھے بہت جلد واپس جانا چاہیئے۔

زلیخا:۔ آخر اتنی جلدی کیا ہے؟ ــــــــ کل چلے جائیے گا۔

حبیب خاں:۔ تمہاری کوئی بات نہیں ٹال سکتا لیکن اس وقت مجبور ہوں۔ تمہیں اندازہ نہیں، اس وقت ہمارے لئے ایک ایک لمحہ بڑا قیمتی ہے۔ ایک لمحہ بھی ضائع نہ ہونا چاہیئے، ایک بہت ضروری کام درپیش نہ ہوتا تو آج بھی نہ آتا شاید۔

زلیخا:۔ آپ کس کام سے آئے ہیں۔

حبیب خاں:۔ ہاں زلیخا! بڑا ضروری کام ہے۔ تم سے

زلیخا:۔ کہیے ــــــــ کہتے کیوں نہیں؟

حبیب خاں:۔ ہمت نہیں پڑتی۔ راستہ بھر میں جتنی ہمت پیدا کی تھی وہ تمہیں دیکھتے ہی جواب دے گئی۔

زلیخا:۔ متبسّم ہوکر، پھر وہی الفاظ کا طلسم۔

حبیب خاں:۔ سچ کہتا ہوں ــــــــ خیال آتا ہے نہ جانے تم میرے بارے میں کیا خیال کرو۔

زلیخا:۔ میں آپ کے بارے میں جو خیال قائم کر چکی وہ پہاڑ کی طرح اٹل ہے۔ تلوار کی نوک بھی اس میں تبدیلی نہیں کر سکتی۔

حبیب خاں:۔ مجھے یقین ہے زلیخا!

زلیخا:۔ تو کہہ ڈالئے ــــــــ پھر سوچ کیا رہے ہیں؟

حبیب خاں:۔ رتاثر کے عالم میں رکتے رکتے، میں تمہاری خدمت نہ کر سکا تمہیں

ذرا بھی آرام نہ پہنچا سکا۔

زلیخا:۔ ایسی باتیں کر کے مجھے شرمندہ نہ کیا کیجئے۔ کیا ایک عورت کے لئے شوہر کی محبت سے بڑھ کر کوئی آرام اور سکھ ہو سکتا ہے ۔؟

حبیب خاں:۔ اب تم مجھے شرمندہ کر رہی ہو۔ لیکن وقت کم ہے، جو کچھ کہنا ہے جلدی کہوں گا ——————— کیا تمہارے منہ سے میں یہ الفاظ سن سکتا ہوں کہ تم نے میری تمام خامیاں اور کوتاہیاں معاف کر دیں ؟ بحث نہ کرو۔ جواب نہ دو۔ صرف ہاں یا نہیں ؟

زلیخا:۔ (انتہائی تاثر کے عالم میں) ہاں ———————

حبیب خاں:۔ (ممنون نگاہوں سے دیکھ کر) شکریہ اب ایک التجا اور ہے۔ میں تمہارا مہر بھی ادا نہ کر سکا۔ اگر اس قرض کو ادا کئے بغیر میں اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں تو کیا اسے بھی معاف کر دو گی ؟

زلیخا:۔ (جذبات کی شدت کو دباتے ہوئے بہت مشکل سے) ہاں ——————— میں نے معاف کر دیا۔

حبیب خاں:۔ زلیخا! اب میں جاتا ہوں (اٹھ کھڑا ہوتا ہے) اور شاید اب واپس نہیں آسکوں گا۔ اب تمہارا دیدار، ان آنکھوں کو کبھی میسر نہیں آئے گا تمہاری محبت بار بار میرے قدموں کی زنجیر بنی۔ لیکن تمہارے مجاہدانہ الفاظ نے ہر مرتبہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ اب امتحان کی گھڑی آگئی ہے۔ جو کچھ میں کہتا تھا اسے ثابت کر دوں۔ جو کچھ تم کہتی تھیں اس پر عمل کر کے دکھاؤں میں یہاں سے میدانِ جنگ کی طرف نہیں، شہادت گاہ کی طرف جا رہا ہوں جہاں مسلمانوں کی تلواریں میری گردن کاٹیں گی، جہاں مسلمانوں کے گھوڑے میری لاش کو روندیں گے۔ جہاں سے میری لاش بھی صحیح سلامت نہ مل سکے گی۔

دعا کرو کہ خدا مجھے استقامت دے، وعدہ کرو کہ اس حادثہ کو وقار کے ساتھ جھیل لوگی؟

زلیخا:۔ (رک رک کر) دعا کرتی ہوں ——— وعدہ کرتی ہوں۔

پھر وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ اس کی آواز لرزنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں موتی چمکنے لگے۔

حبیب خاں جھکا، اس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور اس کی طرف دیکھے بغیر رخصت ہوگیا ———!

باب ۷۹

بالاکوٹ!

آخر وہ دن آگیا جب دیدارِ الٰہی کے تمنائیوں نے اپنی جانیں اس مقصدِ عظیم و جلیل پر قربان کر دیں۔

ایک طرف بہت بڑا لشکر تھا جو ہر طرح کے ساز و سامان سے لیس تھا، جسے کسی چیز کی کمی نہ تھی، جس کی سپاہ بے حساب، روپیہ ان گنت، وسائل بے شمار۔ دوسری طرف خدا کے چند وہ بندے تھے جو بے سر و سامان تھے، جن کی جیبیں خالی تھیں، جن کے لباس تار تار تھے، جن کے پیٹ خالی تھے۔ لیکن جن کے دل عشقِ الٰہی سے سرشار تھے۔ جو گھر سے اسی لئے نکلے تھے کہ خدا کے دین کو سربلند کریں گے۔ یا اپنی جان قربان کر دیں گے۔ لوگ موت سے ڈرتے ہیں، یہ موت کے منتظر تھے۔ لوگ زندگی کو عیش و مسرت کے ساتھ گزارنے کے متمنی رہتے ہیں۔ ان کا عیش اسی میں تھا کہ راہِ مولا میں زخمی ہوں، ان کی مسرت یہ تھی کہ دین کے دفاع میں زندگی، جاں آفریں کو سپرد کر دیں یہی وجہ تھی کہ حریف چوکنا تھا۔ محتاط تھا اور یہ من چلے تھے نہ کسی رکاوٹ کو خاطر میں لاتے تھے نہ کسی پیش بینی کے قائل تھے۔ جو مرنے کا تہیّہ کر چکا ہو، ان چیزوں پہ غور بھی کیوں کرے۔

پھر ایک بات اور بھی تھی، ملکی اور غیر ملکی فتنہ نے مجاہدوں کے سالار سیّد بادشاہ اور دوسرے اکابر میں اب یہ جذبہ پیدا کر دیا تھا کہ جن لوگوں کے لئے ہم نے یہ تکلیفیں جھیلیں جب وہی عزّت پر ذلّت کو، آزادی پر غلامی کو، حکومت پر محکومی کو ترجیح دیتے

ہیں ۔ وہی جب ہمارے خون کے پیاسے ہیں تو پھر اس خون کو ایک مرتبہ بہہ جانا چاہیے۔

بالاکوٹ، اس جنگ کا آخری مورچہ تھا ———————— آخری اور فیصلہ کن۔

بالاکوٹ، ضلع ہزارہ کی تحصیل مانسہرہ کا مشہور قصبہ ہے اور تحصیل کے شمالی و مشرقی گوشے میں وادی کاغان کے جنوبی دہانے پر پاسبان کی حیثیت میں کھڑا ہے اردگرد کے پہاڑی سلسلوں کو پیشِ نظر رکھا جائے تو بالاکوٹ وادی کاغان کا ایک حصّہ معلوم ہوگا۔

مانسہرے سے جو سڑک پہاڑوں کے نشیب و فراز سے گزرتی اور پیچ و خم کھاتی ہوئی مظفرآباد اور سری نگر جاتی ہے، وہ پندرھویں یا سولھویں میل پر وادی کنہار میں داخل ہوتی ہے، وہاں اس کی دو شاخیں ہو جاتی ہیں۔ ایک شاخ دریا کے مغربی کنارے کے ساتھ ساتھ جنوب کو گئی ہے۔ قریباً ڈیڑھ میل پر ایک پُل ملتا ہے۔ اس سے گزر کر مشرقی کنارے پر جائیں۔ تو تھوڑی دور گڑھی حبیب اللہ خاں کی آبادی ملتی ہے۔ یہی سڑک مظفرآباد اور سری نگر جاتی ہے، دوسری شاخ کنہار کے کنارے کے ساتھ ساتھ شمال کو گئی ہے، اس کے دسویں میل پر بالاکوٹ واقع ہے، اس سے آگے بڑھتے ہی وادی کاغان میں داخل ہو جاتے ہیں۔

دس میل کی اس مسافت میں سڑک کی حالت یکساں نہیں۔ ابتدا میں یہ صاف اور ہموار ہے۔ اس کے بعد خطرناک چڑھائی آجاتی ہے، جس میں بہت سے پیچ و خم ہیں۔ پھر سڑک مستقیم اور ہموار ہو جاتی ہے۔ بیچ میں ایک اور چڑھائی آتی ہے، آخری حصہ پھر ہموار ہے۔

سڑک کے آغاز سے بالاکوٹ کے قریب تک پہاڑ کی دو دیواریں قریباً متوازی چلی گئی ہیں، بیچ میں خلا ہے، جس کا عرض زیادہ سے زیادہ آدھ میل ہوگا۔ اسی خلا میں

سے دریائے کنہار پیچ وخم کھاتا ہوا گزرا ہے کہیں مشرقی سمت کی دیوار سے جا ٹکرایا ہے کہیں مغربی سمت کی دیوار سے آملا ہے، دونوں جانب کے پہاڑوں سے نالے اتر اتر کر دریا میں ملتے گئے ہیں۔ چونکہ پانی کی افراط ہے۔ اس لئے دونوں جانب کھیتی باڑی خوب ہوتی ہے۔ بالاکوٹ تک سڑک کے آس پاس کئی آبادیاں ہیں۔

پوڑیاں گاؤں بالاکوٹ سے میل سوا میل جنوب میں ہوگا۔ اس کے پاس سے وادی کنہار کی مغربی سمت کی دیوار دریا سے پیچھے ہٹ گئی ہے اور اس کا رُخ شمال مغرب کے بجائے بالکل شمال میں ہوگیا ہے۔ اس طرح وادی کاغان کے جنوبی دہانے کے باہر پہاڑوں کے درمیان سطح مرتفع کا ایک خاصا وسیع حلقہ پیدا ہوگیا ہے۔

حلقے کے عین بیچ میں ایک ٹیلہ یا قدرتی پشتہ ہے جس پر بالاکوٹ آباد ہے۔ پشتے کی جنوبی سمت پاس کی زمین سے چھ سات سو فٹ بلند ہوگی۔ مشرقی سمت اس سے بھی زیادہ بلند ہے۔ شمالی سمت میں ٹیلہ ڈھالوان ہے۔ یہاں تک کہ اس کا آخری گوشہ زمین کے برابر ہوگیا ہے۔ مغربی سمت بھی ڈھالو ہے۔

سیّد صاحب کے زمانے میں یہاں تین مسجدیں تھیں۔ مسجد بالا یا مسجد کلاں مسجد متوسط اور مسجد زیریں۔ مسجد بالا یا کلاں قصبے کے جنوبی و مغربی حصے میں تھی سیّد صاحب واصل خاں کی حویلی میں ٹھہرے تھے۔ مسجد بالا کے مشرق میں تین فٹ چوڑی ایک گلی ہے۔ اس کے دوسری جانب مسجد کے سامنے واصل خاں کی حویلی تھی۔ مسجد کلاں کے نیچے شمال کی سمت میں ایک دالان تھا، اس میں مولانا شاہ اسمٰعیل اپنی جماعت سمیت مقیم ہوئے تھے۔ توشہ خانہ اور نقشی خانہ قریب قریب تھے توشہ خانہ کے مہتمم شیخ ولی محمد تھے، اور نقشی خانے کے افسر اعلیٰ نشی محمدی انصاری تھے۔

کل مقام پر آج کل پختہ پل بنا ہوا ہے۔ یہاں سید صاحب کے زمانے میں

بھی لکڑی کا معمولی پل تھا۔ اور غازیوں کی ایک جماعت اس کی حفاظت پر مامور تھی شیر سنگھ اوائل شوال میں گڑھی حبیب اللہ کے پاس تھا۔ سیّد صاحب بالاکوٹ سے دو ڈھائی کوس نیچے، اس کے لئے بالاکوٹ پر حملے کی دو ہی صورتیں تھیں یا وہ پچھلی جانب سے پہاڑ پر چڑھتا اور مٹی کوٹ کے ٹیلے پر پہنچ کر نیچے اترتا۔ اس راستے سے بھاری سامان اور توپیں لے جانا ممکن نہ تھا۔ یا کنہار کے مشرقی کنارے کے ساتھ ساتھ بالاکوٹ کے سامنے پہنچتا۔ اس نے دوسری صورت اختیار کی۔ اس کے ڈیرے اور خیمے بالاکوٹ سے نظر آ رہے تھے۔

سیّد صاحب کے لئے بالاکوٹ پہنچتے ہی پہلا کام یہ تھا کہ مختلف ناکوں اور گزرگاہوں کی حفاظت کا پورا بندوبست ہو جائے۔

سکھ جس جگہ مشرقی کنارے پر ٹھہرے ہوئے تھے وہاں جانور چرانے کے لئے کافی جگہ نہ تھی۔ اس لئے انہوں نے مغربی کنارے پر جانور لانے کے لئے ایک پل بنا لیا تھا سید صاحب کے غازی موقع پا کر یورشیں کرتے رہتے تھے۔ اور کئی مرتبہ وہ جانور بھی پکڑ کر لے آئے۔

شیر سنگھ کو کئی روز کے غور و مشورہ کے بعد پہاڑی پگ ڈنڈی کے ذریعے سے پہنچنا مناسب معلوم ہوا۔ اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ اگر یہ راستہ ٹھیک ہو اور مٹی کوٹ پر مضبوط مورچہ بن جائے تو لشکر کو اسی راستے لے جائے۔ یہ تجویز پختہ ہو گئی تو اس نے آہستہ آہستہ لشکر کا بڑا حصہ پل کے ذریعے سے مغربی کنارے پر پہنچا دیا۔

ایک دن ظہر کے وقت میرزا احمد بیگ والے مورچے کی طرف سے گولیوں کی آواز آئی۔ تمام پہرہ داروں نے اپنے لشکروں کے سالاروں کو متنبہ کر دیا عصر

کے قریب میرزا کی طرف سے قاصد آیا اور بتایا کہ سکھوں نے پگڈنڈی سے پہاڑ پر چڑھ کر میرے میرزا کے مورچے پر حملہ کر دیا ہے۔

جب سکھوں نے میرزا کے مورچے پر حملہ کر دیا تو ان کی کثرت تعداد سے بالکل بے پروا ہو کر بہادر میرزا نے مقابلہ شروع کر دیا اور ایک قاصد کے ہاتھ حملے کی خبر سید صاحب کے پاس بھیج دی۔ اس مقابلے میں میرزا کی جماعت کے آٹھ آدمی شہید ہوئے۔ لیکن وہ دو چار سو کو روک سکتے تھے، ہزاروں لوگوں کو روکتے جو پہاڑ پر چڑھ آنے کے بعد جس طرف چاہتے آگے بڑھ سکتے تھے؛ نتیجہ یہ نکلا کہ میرزا اور ان کے لقیۃ السیف ساتھی اس سیل میں تنکوں کی طرح بہتے بہتے پیچھے ہٹتے گئے۔

سید صاحب نے اطلاع پاتے ہی پہلے ایک جیش کو ابراہیم خاں اور فرح اللہ عرب کی ماتحتی میں بھیجا، ان کے بعد سید نور اللہ شاہ کو ایک گروہ کے ساتھ دوڑایا۔ پھر ارباب بہرام خاں کو حکم دیا کہ آپ بھی کچھ آدمی لے کر جائیں، آخر میں سید جعفر علی نقوی کو تھوڑے سے آدمی دے کر بھیج دیا اس طرح تھوڑی ہی دیر میں دو سو غازی مٹی کوٹ کے ٹیلے پر پہنچ گئے۔ میرزا احمد بیگ ملے تو انہوں نے بتایا کہ اب مورچے پر پیش قدمی سے کچھ فائدہ نہ ہوگا اس لئے کہ سکھ اتنی تعداد میں پہاڑ پر آگئے ہیں کہ دو تین سو آدمی نہیں روک بھی نہیں سکتے چہ جائیکہ پیچھے ہٹا دیں ارباب بہرام خاں نے میرزا کے بیان کی تائید کرتے ہوئے فرمایا کہ دو چار راستے ہوں تو انہیں روکا جا سکتا ہے پہاڑ پر چڑھنے کے بعد سکھوں کے لئے بیسیوں راستے پیدا ہو گئے ہیں، ہم ایک دو یا تین چار کو روکیں گے، سکھ انہیں چھوڑ کر اور راستے اختیار کر لیں گے۔

سید جعفر علی سے ارباب نے کہا حضرت امیر المومنین کو لکھ کر بھیجے کہ اب بہتر یہ ہے کہ سکھوں کی لشکر گاہ پر جو دریائے کنہار کے مشرقی کنارے پر ہے حملہ کیا جائے۔ وہاں کم آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ اگر ہمارے پہنچتے پہنچتے وہ لوگ دو چار مرتبہ تو پیں سر بھی کریں گے تو مضائقہ نہیں۔ ہم لشکر گاہ پر قابض ہو کر سکھوں کو بالاکوٹ میں بند کر دیں گے۔ ہمارا لشکر اگرچہ زیادہ نہیں پھر بھی اشیائے خوردنی فراہم کرنے میں دقتیں پیش آرہی ہیں، سکھ اتنے بڑے لشکر کو کہاں سے

کھلائیں گے؟ یا تو بھوکے مریں گے یا واپس چلے جائیں گے۔

سید جعفر علی کے پاس قلمدان نہ تھا اس لئے ایک آدمی کے ہاتھ زبانی پیغام بھیجا گیا سید صاحب کی طرف سے جواب آیا کہ ارباب خود بالاکوٹ پہنچ کر گفتگو کریں۔

ارباب بہرام خاں کو غروب آفتاب کے بعد منی کوٹ میں حکم ملا تھا کہ بالاکوٹ پہنچ کر اپنی تجویز خود سنا دیجئے۔ انہیں پہنچتے پہنچتے خاصی دیر ہو گئی انہوں نے جو تجویز قاصد کے ذریعے سے پیش کی تھی۔ اب خود حاضر ہو کر تفصیلاً عرض کی، سید جعفر علی نقوی بھی اس مجلس میں موجود تھے لشکرگاہ پر چھاپے کی تجویز کا جواب سید صاحب نے یہ دیا کہ ہم نے پل تڑوا دیا ہے اور اب مشرقی کنارے پر جانے کا کوئی ذریعہ نہیں، ارباب نے عرض کیا کہ مضائقہ نہیں، پل راتوں رات درست ہو سکتا ہے، سید صاحب نے فرمایا، اس بات کو چھوڑیئے، جو کچھ ہونے والا ہے یہیں ہو کر رہے گا جان نثار ارباب نے انگشت سے اپنی گردن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عرض کیا۔

این سر در راہ خدائے تعالیٰ حاضر است   یہ سر خدائے تعالیٰ کی راہ میں حاضر ہے

سکھ منی کوٹ کے ٹیلے پر چڑھنے میں کامیاب ہو گئے تو صاف واضح ہو گیا تھا کہ اب قصبے اور ٹیلے کے درمیانی میدان میں لڑائی ہو گی، اس لئے سید صاحب نے جو مورچے جابجا بغرض دفاع قائم کئے تھے، ان پر غازیوں کو بٹھائے رکھنا بے سود تھا۔ چنانچہ آپ نے مورچوں اور چوکیوں سے غازیوں کو بلا کر فرمایا کہ رات کو خوب دعائیں، مانگو، پروردگار کی بارگاہ میں آمرزش و استغفار کرو۔ صبح مقابلہ ہے۔ خدا جانے کس کی شہادت ہو اور کون زندہ رہے؟

مختلف جماعتوں نے رات رات میں مورچہ بندی مکمل کر لی۔ اس غرض کے لئے زیادہ تر پتھر استعمال کئے گئے اور بالاکوٹ میں اس جنس کی کمی نہ تھی۔ تختوں اور کواڑوں سے بھی کام لیا گیا سید صاحب نے عشا کی نماز کے بعد کھانا کھایا، پھر اپنے پارچوں میں سے کچھ جوڑے منگائے۔ ان میں سے ایک ارخالق، سفید پاجامہ دستار اور پشاوری لنگی منشی خواجہ محمد حسن پوری کو دی کہ صبح یہی پہننا۔ ایک ارخالق سفید پاجامہ اور دستار حکیم قمرالدین پھلتی کو دی کہ ایک

سرمئی ارخالق، سفید پاجامہ کا نگریزی دستار اور کشمیری ٹپکا وغیرہ چیزیں اپنے پہننے کے الگ کر لیں، پھر ساتھیوں سے فرمایا کہ اب آرام کرو، خود بھی بہ اطمینانِ خاطر سو گئے حسبِ معمول پچھلی رات کو اٹھ کر تہجد پڑھی، پھر ذکر و فکر میں مشغول ہو گئے۔

صبح کی نماز کے لئے مسجد بالا میں پہنچے جہاں بہت سے غازی پہلے ہی موجود تھے۔ سب نے آپ کی امامت میں نماز ادا کی ان فداکارانِ حق سے اکثر کی یہ آخری نماز تھی، اور خود امام کے لئے بھی اس کے بعد مصلّے پر بہ طور مقتدی کھڑا ہونا مقدّر نہ تھا، نماز سے فارغ ہو کر آپ قیام گاہ پر تشریف لے گئے اور دیر تک وظائف میں لگے رہے، سورج نکل آیا تو اشراق کی نماز پڑھی، پھر نور محمد جراح کسبت لے کر آ گیا آپ نے لبیں ترشوائیں، ریش مبارک میں کنگھی کی، سرمہ لگایا اور رات کے وقت جو لباس الگ کر رکھا تھا، اسے پہن کر تیار ہو گئے ایک پستول، ایک ولائتی چھری اور ایک کٹار لی، ایک تلوار باندھی جو ارباب بہرام خاں نے نذر کی تھی، لباس پہن کر اور ہتھیار سج کر آپ مسجد بالا میں پہنچ گئے۔ اس وقت دن چڑھے ہوئے قریباً ڈیڑھ گھنٹہ گزرا تھا۔

معمول یہ تھا کہ جنگ کے موقع پر توشہ خانے کا سارا اسباب کسی محفوظ مقام پر رکھوا دیا جاتا جنگ سے ذرا پہلے شیخ ولی محمد مہتمم توشہ خانہ نے ایک آدمی بھیج کر پچھوایا کہ اسباب کہاں رکھوا دیا جائے فرمایا، جہاں پڑا ہے وہیں رہنے دیجئے۔

سکھ ایک دن پہلے ہی پہاڑ پر پہنچ گئے تھے، لیکن انہوں نے رات ہو جانے کے باعث پیش قدمی نہیں کی تھی، سورج نکل آیا تو مٹی کوٹ کے شمالی گوشے میں نمودار ہوئے آہستہ آہستہ ان کی تعداد بڑھنے لگی ان کی گولیاں قصبے اور مسجد بالا میں آ رہی تھیں شاہینوں کے گولے قصبے کے اوپر سے نکل رہے تھے۔ غازیوں کے لشکر میں دو لڑکے ذرا اسپانے تھے ایک حافظ الٰہی بخش، دوسرا علیم الدین یہ دونوں چلے ہوئے گولے اٹھا اٹھا کر غازیوں کو دینے لگے۔

سید صاحب مسجد میں پہنچ کر سائبان کے نیچے بیٹھ گئے، جو سکھوں کے گولوں کی زد میں

تھا۔ ساتھیوں نے عرض کیا کہ آڑ میں ہو جائیں، فرمایا، ہر جگہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت چاہیئے، ارباب بہرام خاں ساتھ تھے، اسی جگہ بیٹھے بیٹھے ایک گولی ان کے ٹخنے سے چھوتی ہوئی نکل گئی اور خفیف سا زخم آیا۔ اس اثنا میں غازی اِدھر اُدھر سے کواڑ اٹھا کر لے آئے اور مسجد کی مغربی سمت میں جو مٹی کوٹ کے سامنے تھی، کواڑ کھڑے کر کے حفاظت کا بندوبست کر لیا قصبے کے بیشتر باشندے ایک دن پہلے ہی گھر بار چھوڑ کر باہر جا چکے تھے صرف غازی باقی رہ گئے تھے

سیّد صاحب نے ایک روز پہلے تاکید فرمادی تھی کہ تمام غازی بھائی صبح کی نماز کے ساتھ ہی کھانے سے فارغ ہو جائیں۔ اکثر کھانا کھا چکے تھے۔ بعض کھا رہے تھے۔ پٹیالے کے سید چراغ علی دیگچی میں کڑچھا ہلاتے جاتے تھے اور وقتاً فوقتاً سکھوں کو دیکھ لیتے تھے، اچانک ان پر ایک خاص کیفیت طاری ہوگئی، آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور بولے، بھائیو! دیکھو وہ حور سرخ کپڑے پہنے چلی آرہی ہے یہ کہتے ہی کڑچھا اٹھا کر دیگچی پر مارتے ہوئے کہا۔ بس اب حور ہی کے ہاتھ سے کھانا کھائیں گے۔ پھر اٹھے اور تیزی سے مٹی کوٹ کے ٹیلے کی طرف دوڑے جدھر سے سکھ نیچے آرہے تھے، یہ سب آناً فاناً ہوا اور ساتھیوں کو انہیں روکنے کا موقع نہ مل سکا جب ان کی توجہ سید چراغ علی کی طرف ہوئی تو وہ اتنی دور جا چکے تھے کہ ان کے پیچھے جانا بے سود تھا اسی حالت میں ان کے گولی لگی اور شہید ہوگئے، یوم بالاکوٹ کے یہ پہلے شہید تھے۔

سکھ لشکر کے جو دستے نیچے اتر چکے تھے انہوں نے تیزی سے قصبے کی جانب پیش قدمی شروع کر دی باقی لوگ سیل کی طرح اتر رہے تھے، سیّد صاحب سائبان کے نیچے لیٹ گئے شیخ لکھمیر پاؤں دابنے لگے۔ اس اثنا میں محمود خاں لکھنوی نے عرض کیا حضرت آرزو ہے کہ آپ دست مبارک میرے چہرے پر پھیر دیں سیّد صاحب اٹھ بیٹھے اور داہنا ہاتھ محمود خاں کے چہرے پر پھیر کر ان کے لئے دعا کی، وہ خوش خوش اپنے مورچے میں چلے گئے۔

سیّد صاحب اندر دعا میں مشغول تھے۔ غازی سائبان میں بیٹھے تھے۔ مسجد میں اس وقت تین نشان تھے۔ ایک دادا ابوالحسن کا، دوسرا ابراہیم خاں خیر آبادی کا یہ دونوں سیاہ تھے تیسرا

نشان سرخ وسپید ملکیوں کا تھا۔ یکایک اندر کا دروازہ کھلا اور سید صاحب مسجد سے باہر نکل گئے تمام غازی بھی اٹھ کر ساتھ ہو گئے جب معلوم ہوا کہ آپ میدان کی طرف جا رہے ہیں تو بعض غازیوں عرض کیا کہ حکم ہو تو نشان ساتھ لے لیں۔ فرمایا دادا ابوالحسن کا نشان ہمارے آگے آگے چلے

سید صاحب مسجد زیریں میں پہنچے تو مسجد کا صحن غازیوں سے بھرا ہوا تھا۔ بعض باہر کھڑے تھے، بعض دائیں جانب کی گلی میں تھے سید صاحب کچھ دیر وہاں ٹھہرے رہے اسی وقت سکھوں کی گولیاں اولوں کی طرح برس رہی تھیں۔ بعض غازی زخمی ہو گئے سید صاحب نے فرمایا کہ کواڑوں کی اوٹ بنالی جائے چنانچہ کچھ غازی کواڑا ٹھالائے، اور اوٹ بنانے لگ گئے۔ عام خیال یہی تھا کہ مسجد میں ٹھہر کر ان سکھوں کے نیچے پہنچ جانے کا انتظار کریں گے، جو پہاڑ پر سے اتر رہے تھے اس اثنا میں آپ نے مسجد کے کونے کی آڑ سے سکھوں کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ قرابین دار لمبی مار کی بندوق والے ہمارے آگے چلیں، یہ فرماتے ہی تکبیر کہتے ہوئے تیزی سے باہر نکلے اور مٹی کوٹ کے ٹیلے کی طرف چل پڑے اس پر سب کو تعجب ہوا، اس لئے کہ لڑائی کی جو سکیم پہلے طے ہو چکی تھی وہ یہ تھی کہ جب تک سکھ نشیب میں نہ پہنچ جائیں ان پر حملہ نہ کیا جائے وہ ابھی نشیب سے دور تھے کہ خود سید صاحب نے حملہ کر دیا۔

مولانا اسمٰعیل نے فرمایا کہ قرابین دار سید صاحب کے گرد و پیش رہیں، آپ آہستہ آہستہ تکبیر کہتے ہوئے جا رہے تھے دلدل پہنچے تو اس کے کنارے ایک بھاری پتھر تھا۔ اس پر دونوں ہاتھوں کا سہارا لے کر بیٹھ گئے۔ ارباب بہرام خاں آپ کے بائیں جانب تھے۔ شیخ ولی محمد کو قصبے سے شاہین لانے کا حکم دیا۔ عرض کیا گیا کہ تند حاریوں کی طرف سکھوں کا زور معلوم ہوتا ہے، مناسب ہو گا کہ ادھر کمک بھیجی جائے۔ فرمایا جتنے لوگ وہاں ہیں وہی کافی ہیں۔ ایک شخص نے کہا کہ ممکن ہے۔ سکھ جنوبی سمت سے قصبے پر یورش کر دیں۔ ادھر کی جماعت کیلئے کمک بھیجنی مناسب ہو گی۔ فرمایا جو لوگ وہاں ہیں وہی کافی ہیں، ایک شخص نے تلوار لے کر دلدل میں اترنا چاہا، لوگوں نے اسے یہ کہہ کر روک دیا کہ حضرت کے حکم کے خلاف ورزی کیوں کرتا ہے؟

سیّد صاحب نے بیٹھے بیٹھے ارباب بہرام خاں سے فرمایا۔ دل چاہتا ہے کہ سکھوں کا جو گروہ نیچے اتر آیا ہے اس پر حملہ کر دیا جائے۔ ارباب نے عرض کیا جو لوگ نیچے آچکے ہیں، انہیں مار لینا مشکل نہیں، لیکن جو ابھی پہاڑ پر ہیں یا پہاڑ سے اتر رہے ہیں، ان پر یورش کی کیا صورت ہے؟ فرمایا بہتر ہے، بڑے گروہ کو نیچے آ لینے دیں کہ یکایک سیّد صاحب تکبیر کہتے ہوئے آگے بڑھے اور مسجد کی طرف سے سکھوں پر حملہ آور ہوئے تمام مجاہدین آپ کے ہمراہ تھے۔ جب مسجد سے نکل کر دھانوں کی کیاریوں میں پہنچے، وہاں جابجا متفرق ہو گئے اور کیاریوں کی آڑ میں مورچے پکڑ کر سکھوں پر گولیاں مارنے لگے۔

دھان کی کیاریوں میں پہنچے اور تلوار چلنی شروع ہو گئی۔ اس وقت یہ حال تھا کہ جو سکھ غازیوں کے مقابلے پر تھے، ان کے ہاتھوں اور بدنوں پر رعشہ پڑ گیا، بندوقیں نہ چلا سکے غازی لوگ ایک ہاتھ سے ان کی بندوق پکڑتے، دوسرے ہاتھ سے تلوار مارتے اور قرابین والے قرابین مارتے تھے، اور سکھ پیچھے ہٹتے ہٹتے پہاڑ کی طرف چلے جاتے تھے بے شمار سکھ اس وقت مارے گئے۔

یہ حملہ اتنا زوردار تھا کہ جتنے سکھ نیچے آ چکے تھے، ان میں سے اکثر مارے گئے، باقی پیچھے پلٹ کر پہاڑ کی جڑ میں پہنچ گئے۔ کچھ اوپر چڑھنے لگے جنگ سے ایک روز پیشتر بارش ہوئی تھی، لیکن لڑائی کے وقت مطلع صاف تھا اور دھوپ نکل آئی تھی، تاہم بارود کا دھواں اتنا زیادہ تھا کہ تھوڑے فاصلے پر بھی آدمی نظر نہ آتا تھا۔ کارتوسوں کے کاغذ ہوا میں اس طرح اڑتے تھے جیسے تیتریاں اڑا کرتی ہیں۔

سکھ افسر نے یہ حالت دیکھ کر ترم بجایا اور اس آواز میں کچھ کہا۔ سکھ پھر پلٹے اور غازیوں پر باڑھیں مارنے لگے، محمد امیر خاں قصوری کے بیان کے مطابق سیّد صاحب کے حملے نے بقیۃ السیف سکھوں کو پہاڑ کی جڑ میں پہنچا دیا تھا۔ وہ پہاڑ پر چڑھ رہے تھے، غازی ان کی ٹانگیں پکڑ پکڑ کر کھینچتے اور تلواریں مار مار کر ختم کرتے جاتے۔

غازیوں نے دشمن کو مار مار کر دامن کوہ تک میدان صاف کر دیا۔ پہاڑ پر چڑھنا دشوار تھا۔ سیّد صاحب دامن کوہ میں اپنی جماعت میں ایک پتھر پر کھڑے تھے۔ دشمن کی گولیوں کی بوچھاڑ آئی ادھر دیکھا تو سیّد صاحب پتھر پر نہ تھے سب ساتھی بھی شہید ہو گئے مگر کسی نے اپنی آنکھ سے انہیں گرتے نہ دیکھا اور نہ ان کی نعش دیکھی نہ ساتھیوں میں سے کسی نے آپ کو گرتے ہوئے یا بے جان پڑے ہوئے دیکھا[۱] البتہ یہ پتہ چلا کہ آپ کی ران میں گولی لگی تھی سر مبارک پر پتھر کا زخم تھا۔ قبلہ رو بیٹھے ہوئے تھے۔

سکھ فوج اگرچہ غازیوں کے مقابلے میں دس گنا تھی لیکن جس عزیمت و استقامت کے ساتھ سیّد صاحب نے جنگ شروع کی تھی، اسے پیش نظر رکھتے ہوئے سکھوں کا فتح یاب ہونا آسان نہ تھا۔ جب غازیوں کو یہ معلوم ہوا کہ سیّد صاحب کا کچھ پتہ نہیں ملتا تو اکثر اصحاب بے خود و بے اختیار ہو کر اس میدان میں سرگرداں پھرنے لگے جہاں اولوں کی طرح گولیاں اور پتھر برس رہے تھے، ہر ایک کی زبان پر صرف یہ کلمہ تھا کہ "حضرت کہاں ہیں؟"

پھر سکھوں نے بالاکوٹ کو گھیرا اور وہاں کے گھروں میں آگ لگا دی اور جو غازی بیمار اور اپنے ڈیروں پر رہ گئے تھے ان کو جا کر شہید کیا۔ ان میں سے بعض غازی سکھوں سے مقابلہ کر کے اور ایک دو کو مار کر شہید ہوئے اور بعض غازی، جو بیمار تھے وہ اپنے بستر پر شہید کئے گئے[۲]

---

[۱] کتاب العبرت مرتبہ سیّد عبدالجبار شاہ ستھانوی صفحہ ۶۳ ۲، سیّد احمد شہید،

[۲] مقتبس از سیرت احمد شہید، غلام رسول مہر،

باب ۷۰

توبہ

حضرت سید صاحب کی خبرِ شہادت نے بقیۃ السیف لوگوں میں مر مٹنے کا جذبہ اور زیادہ شدّت کے ساتھ پیدا کر دیا۔ بہت کم لوگ باقی تھے۔ ان باقی بچنے والے لوگوں میں زیادہ تر زخمی اور مجروح لوگ تھے۔ لیکن جواب تک کی رزم و پیکار کے باوجود صحیح سلامت تھے۔ ان کا جذبہ شہادت اور شوقِ سرفروشی تازہ تھا۔ انھیں اپنے بدن پر یہ سر بار معلوم ہو رہا تھا۔ ان کے وسائل و ذرائع ختم ہو چکے تھے۔ لیکن وہ اس بے جگری سے لڑ رہے تھے جیسے کوئی بہت بڑی کمک عنقریب ہی پہنچا چاہتی ہے۔

یہ مجاہد جواب تک میدانِ جنگ میں ڈٹے ہوئے تھے۔ گنے چنے چند لوگ تھے اور سکھوں کا لشکرِ گراں حدِ شمار سے خارج تھا۔ مولانا اسمٰعیل اور تحریک کے دوسرے اکابر بھی دادِ شجاعت دیتے ہوئے مرتبۂ شہادت پر فائز ہو چکے تھے۔ حبیب خاں زخموں سے چُور تھا۔ لیکن اب تک لڑے جا رہا تھا۔ اس کی تلوار ٹوٹ چکی تھی۔ اس کے خنجر کی دھار جواب دے چکی تھی۔ اس کا گھوڑا ادھ مُوا ہو چکا تھا۔ لیکن اس کے دم خم میں فرق نہیں آیا تھا۔ آخری زخموں کی تاب نہ لا کر گر پڑا۔ سکھوں نے اسے مُردہ سمجھ کر چھوڑ دیا اور کشتوں کے پشتے لگا کر پھر پہاڑ پر واپس چڑھ گئے۔

رات بھر حبیب خاں بیہوشی کے عالم میں پڑا رہا۔ صبح منہ اندھیرے آنکھ کھلی۔ ساری صورت حال اس کی سمجھ میں آگئی۔ آہستہ آہستہ اٹھا۔ لاشوں کے پاس سے ہوتا اور گزرتا وہ آگے بڑھا۔ ایک جگہ پر ایک تلوار پڑی ہوئی نظر آئی۔ اس نے اندازہ کر لیا مولانا اسمٰعیل

یہیں شہید ہوئے ہوں گے کیونکہ یہ تلوار انہی کی تھی۔ اس نے تلوار کو آنکھوں سے لگایا، بوسہ دیا۔ گلے میں حمائل کیا اور گرتا پڑتا پھر چل نکلا۔ شام ہوتے وہ ایک گاؤں کے قریب پہنچا۔ یہاں اسے ایک مسجد نظر آئی۔ وہ مسجد میں پہنچا تو اسے اپنے کئی ساتھی نظر آئے۔ یہ بھی زخمی تھے اور تاب و تواں سے محروم ہو چکے تھے۔ گفتگو کی تو معلوم ہوا، شکست کے بعد جس کا جدھر منہ اٹھا چل دیا۔ یہ لوگ اس طرف آ گئے اور خانۂ خدا میں پناہ گزیں ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا، اب کہاں جائیں۔ اس لیے کہ زمین سخت ہے، آسمان دُور ہے۔ ہر طرف دشمن ہی دشمن نظر آتے ہیں، جو ملتا ہے وہ خون کا پیاسا دکھائی دیتا ہے۔ نہ سکھوں سے امان مل سکتی ہے نہ مقامی مسلمانوں سے۔

حبیب خاں نے انھیں تسلی دی، دلاسا دیا اور کہا۔

"جب تک میں زندہ ہوں، تمھیں کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا۔ آؤ دوستو! ہم پھر سے عہد کریں کہ جب تک زندہ ہیں سیّد بادشاہ کے مشن کو، ان کی تحریک کو زندہ رکھیں گے۔ خواہ، اس راستہ میں جان ہی کیوں نہ کام آ جائے۔"

حبیب خاں کے ان الفاظ نے جادو کا سا اثر کیا۔ ان خستہ دل اور مجروح لوگوں میں ایک نئی زندگی پیدا ہو گئی۔ سب نے مل کر خدائے قادر و توانا سے اپنا یہ عہد دوہرایا اور اب بیٹھ کر سوچنے لگے کہ پہلے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کریں، پھر آگے روانہ ہوں۔

اتنے میں گرد اڑتی ہوئی نظر آئی۔ ان لوگوں نے سراپا اضطراب بن کر اس طرف ٹکٹکی لگا دی کہ دیکھنا چاہیے اب کون سی تازہ آفت آتی ہے؟

گرد کا دامن پھٹا، پچاس کے قریب سوار اسی طرف آتے ہوئے نظر آئے۔ گلباز خاں ان کے سردار کی حیثیت سے آگے آگے تھا۔

گلباز خاں نے ان لوگوں کو دیکھتے ہی سمجھ لیا یہ کون ہو سکتے ہیں؟ اس نے فوراً مسجد کا

محاصرہ کرلیا۔ حبیب خاں آگے بڑھا۔ اس نے للکار کر کہا۔
"تم کیا چاہتے ہو؟"
گلباز خاں مسکرایا۔
"آہا حبیب خاں تم ابھی زندہ ہو؟ بڑی خوشی ہوئی۔
حبیب خاں:۔ ہاں میں زندہ ہوں، بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟
گلباز خاں:۔ یقیناً یہ لوگ سید بادشاہ کے ساتھی ہیں؟
حبیب خاں:۔ تمہارا خیال صحیح ہے۔
گلباز خاں:۔ تو پھر یہ لوگ اب بچ کر نہیں جا سکتے۔ یہ اب زندہ نہیں رہ سکتے۔ میں سردار سلطان محمد خاں کی طرف سے سکھوں کو ان کی فتح و کامرانی کی مبارکباد دینے جا رہا ہوں۔ بہت سے تحائف میرے ساتھ ہیں۔ لیکن ان سے بڑھ کر کوئی تحفہ نہیں ہو سکتا کہ ان لوگوں کی گردنیں سردار لشکر کی خدمت میں نذر کے طور پر پیش کروں۔"
حبیب خاں:۔ (بگڑ کر) یہ نہیں ہو سکتا ——— تم مسلمان ہو، کچھ تو اپنے اسلام کی لاج رکھو۔
گلباز خاں:۔ تم میرے دوست ہو، عزیز ہو، ہم قوم اور ہم وطن ہو، تمھیں کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا۔ میرے پاس چلو، نہ صرف تمھیں امان ہے، بلکہ وعدہ کرتا ہوں کہ سلطان محمد خاں کے دربار میں تمھیں بڑے سے بڑا منصب حاصل ہوگا۔ وہ بہادروں کا قدردان ہے، تمھاری قدر تمھاری توقع سے زیادہ کرے گا۔
حبیب خاں:۔ شکریہ اس نوازش کا، مجھے اس اعزاز کی ضرورت نہیں۔
گلباز خاں:۔ میں پھر تمھیں موقع دیتا ہوں۔
حبیب خاں:۔ میں اس موقع کو ٹھکراتا ہوں۔
گلباز خاں:۔ ضد سے کام نہ لو، تمھیں زندہ رہنا چاہیئے۔ اپنے لیے نہیں اپنی بیوی

کے لیے جس سے تم بے انتہا محبت کرتے ہو۔ اپنے اس خوبصورت اور نہایت پیارے بچّے کے لیے جسے تم نے اب تک نہیں دیکھا ہے۔ اپنے خاندان کے لیے جس کے لیے تم مایۂ فخر ثابت ہو سکتے ہو۔

حبیب خاں:۔ میں نے حق کا ساتھ دینے کا عہد کیا ہے۔ اس عہد سے روگردانی نہیں کر سکتا۔ بیوی، بچّہ، خاندان، سب کو چھوڑ سکتا ہوں مگر حق کو نہیں چھوڑ سکتا۔

گلباز خاں:۔ حق ہمارے ساتھ ہے۔ باطل ان لوگوں کے ساتھ تھا جو ہلاک ہوئے، جن کا نام و نشان مٹ گیا۔

حبیب خاں:۔ نہیں —— حق بہرحال حق ہے، خواہ وہ جیتے یا ہارے۔!

گلباز خاں:۔ تم سے بحث کرنا بیکار ہے، جو چاہو کرو۔ جہاں چاہو جاؤ، ہمارے راستہ سے ہٹ جاؤ۔ ہمیں اپنا کام کرنے دو۔

حبیب خاں: جب تک میں زندہ ہوں تم اور تمہارے سوار ایک قدم آگے نہیں بڑھا سکتے۔

گلباز خاں:۔ تم سے کوئی تعرض نہیں کرے گا۔ تم شوق سے چلے جاؤ ہمیں بحث تو ان غیر ملکی (مجاہدین کی طرف اشارہ کرکے) لوگوں سے ہے۔

حبیب خاں:۔ اسلام ان تعصبات سے بالا ہے۔ تم سے میرا خونی رشتہ ہے لیکن میں تم سے نفرت کرتا ہوں۔ یہ لوگ میرے کوئی نہیں لیکن ان پر جان قربان کردونگا۔

گلباز خاں:۔ (غصّہ کے عالم میں آگے بڑھتے ہوئے) ہٹ جاؤ سامنے سے۔

حبیب خاں:۔ (تلوار میان سے نکال کر) ہرگز نہیں۔

گلباز خاں:۔ کیا تم لڑوگے؟ ان غیروں کے لیے ——؟

حبیب خاں:۔ ہاں، میں لڑوں گا۔ یہ غیر نہیں۔ میرے دینی اور اسلامی بھائی ہیں۔

گلباز خاں نے کوئی جواب نہ دیا۔ "بزن" کا حکم دیا اور آناً فاناً اس کے سوار اس

مجروح مجاہدوں پر ٹوٹ پڑے اور چشم زدن میں سب کا صفایا کر دیا۔ حبیب خاں زخمی تو پہلے ہی تھا، اب اور زیادہ نڈھال ہوگیا۔ گلباز خاں اس کے قریب آیا کہ تلوار سے حملہ کرے، لیکن اسے دیکھ کر نہ جانے حبیب خاں میں کہاں سے قوّت آگئی کہ اس نے تلوار کا بھرپور وار گلباز خاں پر کیا، تلوار اس کی گردن پر پڑی۔ وہ لڑکھڑا کر گرا۔ اتنی دیر میں اس کے کئی ساتھیوں نے مل کر حبیب خاں پر حملہ کیا اور اسے قیمہ قیمہ کر دیا۔ پھر یہ سوار سلطان محمد خاں کے پاس واپس آئے۔ ان میں چند نے جلدی سے پالکی کا انتظام کیا اور نیم جان گلباز خاں کو لے کر اس کے دیہات کی طرف روانہ ہونے لگے۔

گلباز خاں کی حالت اگرچہ نازک تھی، لیکن ہوش وحواس سلامت تھے۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"حبیب خاں کی لاش بھی اسی پالکی میں رکھ دو۔"

گلباز خاں حبیب خاں کی لاش لے کر اپنے دیہات پہنچا۔ اتفاق سے لاڈو دروازے پر کھڑی تھی۔ زلیخا نے اس کے ذمہ یہ خدمت کر رکھی تھی کہ وقتاً فوقتاً دروازے پر جا کر دیکھ آیا کرے، کہیں سے کوئی ایسا شخص تو نہیں آیا جو حبیب خاں کے بارے میں کچھ جانتا ہو۔

سپاہی حبیب خاں کا گھر جانتے تھے، انھوں نے اس کی لاش لاڈو کے حوالہ کی اور گلباز خاں کو اس کے گھر پہنچا دیا۔

حبیب کی لاش جب اندر پہنچی تو سارے گھر میں کہرام برپا ہوگیا۔ لاڈو تک پچھاڑیں کھانے لگی۔ لیکن ایک زلیخا سارے گھر میں ایسی ہستی تھی جو بالکل خاموش تھی۔ جس کی آنکھ سے آنسو کا ایک قطرہ بھی نہیں گرا۔

اسے اپنا عہد یاد تھا

حبیب خاں کی تجہیز و تکفین ہو گئی، گلباز خاں کے ہاں ہر شخص پیکرِ اضطراب بنا ہوا تھا۔ بڑے بڑے جراح بلوائے گئے لیکن خون نہ رکا۔ حالت اور زیادہ ابتر ہو گئی، فاطمہ اسے دیکھ دیکھ کر ماہئ بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ اس کے سوا وہ بیچاری کر بھی کیا سکتی تھی۔

گلباز خاں نے کمزور آواز میں فاطمہ کو اپنے پاس بلایا اور کہا۔

"رونے کے لیے ساری زندگی پڑی ہے۔ لیکن میں مر رہا ہوں اور مرنے سے پہلے چند ضروری باتیں تم سے کرنا چاہتا ہوں۔

فاطمہ نے آنسو پونچھے اور اس کی طرف دیکھنے لگی کہ کیا کہتا ہے۔

وہ بولا :-

"فاطمہ! میں نے حبیب خاں کی جان لی۔ اس نے مجھے کاری اور مہلک زخم پہنچایا۔

فاطمہ :- (روتے ہوئے) خدا اسے جہنم رسید کرے۔

گلباز خاں :- نہیں فاطمہ! یہ نہ کہو۔ وہ سیدھا جنت میں گیا۔ دوزخ کا کھٹکا مجھے ہے۔ وہ خدا کا نیک بندہ تھا۔ میں سگِ دنیا ہوں۔ اس نے خدا کے لیے جان دی میں دنیا کے شوق میں مارا گیا۔

آہ، پانی۔

فاطمہ نے جلدی سے اٹھ کر سہارا دیتے ہوئے اسے پانی پلایا اور پھر لٹا دیا۔ اس نے کمزور نحیف آواز میں کہا۔

حبیب کا مقصد پورا ہو گیا۔ میں اپنے مقصد میں ناکام رہا۔ اب ہم دونوں شاید ایک ساتھ خدا کے دربار میں حاضر ہوں گے، وہ سرخرو ہو گا اور میں ــــــ؟

وہ رونے لگا۔ ہچکیاں بندھ گئیں اس کی۔

پھر اس نے رکتے رکتے کہا۔

"آج میں محسوس کرتا ہوں وہ صحیح راستہ پر تھا۔ میں غلط راستہ پر تھا۔ آہ اب کیا ہوگا؟"

فاطمہ :۔ خدا غفور الرحیم ہے۔

گلباز خاں :۔ (چونک کر) کیا کہا خدا غفور الرحیم ہے، ہاں تم نے سچ کہا۔ بے شک وہ غفور الرحیم ہے۔

عصیان ما و رحمت پروردگار ما
ایں را نہایتے است نہ آں را نہایتے

بے شک وہ معاف کر دے گا۔ تم میری توبہ کی گواہ رہنا۔

فاطمہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

گلباز نے اس پر ایک نظر ڈالی اور کہا۔

"فاطمہ! مجھے سکون سے مرنے دو۔"

اس نے جلدی سے آنسو پونچھ لیے۔

گلباز خاں نے پھر اپنی بکھری ہوئی قوت مجتمع کی اور کہا۔

"حبیب میرا دوست تھا، عالی حوصلہ اور عالی ظرف۔ یقیناً داورِ حشر کے سامنے مجھے شرمندہ دیکھ کر وہ میری خطائیں معاف کر دے گا۔ لیکن تم نے زلیخا کا دل بہت دکھایا ہے۔ کیا تم اس سے معافی مانگ لوگی؟"

جوشِ گریہ نے فاطمہ میں جواب دینے کی سکت نہیں باقی رکھی تھی۔ اس نے گردن سے اشارہ کیا۔

ہاں ——

اور پھر جو اس کی طرف دیکھا تو گلباز خاں اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔

باب ۱۷

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ

بالاکوٹ کی جنگ ختم ہوگئی ـــــــــــــ !

وہ مقدس روح اعلیٰ علیین میں پہنچ گئی جسے شوقِ شہادت بیقرار رکھتا تھا ۔ وہ نیک اور صالح لوگ جوارِ رحمت میں پہنچ گئے جنھوں نے اپنے رب کی خوشنودی اور کلمۃ اللہ کی سربلندی کے لیے ترکِ وطن کرکے ایک اجنبی مقام پر تحریک جہاد کی داغ بیل ڈالی تھی۔ سکھوں کے دل سے وہ کانٹا نکل گیا جس نے ان کی شہنشاہیت کے قصر فلک رفعت میں زلزلہ ڈال دیا تھا۔ رنجیت سنگھ یہ خبر سن کر پہلی مرتبہ چین کی نیند سویا۔ پہلی مرتبہ بڑی مدت کے بعد، اس کے لب تبسم سے آشنا ہوئے۔ پہلی مرتبہ اس نے وفورِ شوق اور جوشِ بے اختیار سے بے تاب ہو کر جام و مینا کا شغل بے محابا شروع کر دیا۔ پہلی مرتبہ اس کے ایوانِ خاص میں ایک مدت دراز کے بعد نغمہ و سرود کی آواز گونجی۔ اس سارے عرصہ میں اس کا دماغی توازن بگڑا ہوا نظر آتا تھا۔ سروجنی کی موت نے اسے اور زیادہ چڑچڑا کر دیا تھا۔ کبھی وہ کھڑک سنگھ کو جھڑکتا تھا، کبھی دولت رام کو، کبھی ایلارڈ کو، کبھی ونتورا کو۔ کبھی شیر سنگھ کو، کبھی وزیر سنگھ کو۔ کبھی فقیر عزیز الدین سے ان کا انتہائی احترام ملحوظ رکھنے کے باوجود روٹھ جاتا تھا۔ کبھی ہری سنگھ نلوہ کی کارگزاریوں سے خوش ہونے کے باوجود اسے برطرف کر دینے پر آمادہ ہو جاتا تھا۔ لیکن "خلیفہ صاحب" کی خبر شہادت سنتے ہی اس کا دماغی توازن درست ہوگیا۔ اس کی تشویش دور ہوگئی اور وہ پھر وہی رنجیت سنگھ

بن گیا جو سیّد کے ورود و نزول سے پہلے تھا۔

دربار خاص میں رنجیت سنگھ تخت حکومت پر متمکن تھا۔ آج انعام واکرام کی بارش ہورہی تھی۔ دولت رام، دنتورا، ایلارڈ، شیر سنگھ سب کو توقع اور امید سے زیادہ انعام ملا۔ جب یہ لوگ چلے گئے تو رنجیت سنگھ، کرتار سنگھ سے مخاطب ہوا۔

"تم سب سے بڑے اور منہ مانگے انعام کے مستحق ہو۔ جن لوگوں نے جنگ کے میدان میں خلیفہ صاحب کو شکست دی۔ بے شک وہ قابلِ تعریف ہیں۔ لیکن یہ کچھ نہ ہو سکتا اگر تمھارے ڈالے ہوئے بیج پھل نہ لاتے۔ اگر تم نے درّانی سرداروں خصوصاً یار محمد اور سلطان محمد کو شیشے میں نہ اتار لیا ہوتا اور مولویوں سے خلیفہ صاحب اور ان کے ساتھیوں کے خلاف کُفر کے فتوے حاصل کر کے دیہاتوں میں ان کی تشہیر نہ کی ہوتی، واقعی اس آفت سے نپٹنا مشکل ہو جاتا۔

کرتار سنگھ :۔ یہ سب مہاراجہ کی عنایت ہے۔

رنجیت سنگھ :۔ تمھیں انعام ملے گا۔

کرتار سنگھ :۔ غلام کی التجا ہے کہ سلطان محمد خاں کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ اسے ضرور نوازا جائے۔

رنجیت سنگھ :۔ ٹھیک کہتے ہو۔ وہ قدردانی اور سرفرازی کا مستحق ہے۔

کرتار سنگھ :۔ بجا ارشاد ہوا۔

رنجیت سنگھ :۔ اور ہاں، امرت کور کا بھی کچھ پتہ چلا؟

کرتار سنگھ :۔ کل ہی ہمارا آدمی اس گاؤں سے خبر لے کر آیا ہے جہاں وہ رہتی ہے۔

رنجیت سنگھ :۔ (پہلو بدل کر) اور وہ شخص جو اسے بھگا لے گیا تھا؟

کرتار سنگھ:۔ وہ آخری جنگ میں کام آیا۔

رنجیت سنگھ:۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو بھی امرت کور کو اپنے گھر میں، اپنے ملک میں واپس آنا چاہیئے تھا۔

کرتار سنگھ:۔ عالی جاہ! میں اس کا نام بھی سُننا نہیں چاہتا۔ دنیا میں سب سے زیادہ میں اسی کو چاہتا تھا، لیکن اب اس سے نفرت کرتا ہوں۔ وہ ہمارے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔ مجھے اس کے نام سے بھی نفرت ہے۔

رنجیت سنگھ:۔ نہیں کرتار سنگھ! اتنا غصہ نہ کرو۔ وہ بھولی اور سادہ لوح تھی۔ ہمارا خیال ہے مسلمان جاسوس نے اسے فریب دیا اور وہ مبتلائے فریب ہو گئی۔ آخر نادان اور کم سن تھی۔

کرتار سنگھ:۔ اس نے میری محبت کی قدر نہ کی۔ اس نے خاندان کی ناک کٹوا دی۔ وہ ننگِ خاندان ہے۔

رنجیت سنگھ:۔ بڑے غصہ ور ہو ——— کہنا مانو۔ جاؤ اسے لے کر آؤ۔

کرتار سنگھ:۔ (حیرت کے ساتھ) اسے لے آؤں؟

رنجیت سنگھ:۔ ہاں ——— عزت و احترام کے ساتھ۔

کرتار سنگھ:۔ (برافروختہ ہو کر) اسے عزت و احترام کے ساتھ واپس لے آؤں؟

رنجیت سنگھ:۔ ہاں ——— یہ ہمارا حکم ہے اور تم ہمارے حکم کی ہمیشہ سے بسر و چشم تعمیل کرنے کے عادی رہے ہو۔ وضعداری بڑی چیز ہے اپنی وضع میں فرق نہ آنے دو۔

کرتار سنگھ:۔ لیکن عالی جاہ!

رنجیت سنگھ:۔ ہماری مرضی معلوم کرنے کے بعد بھی تم اگر مگر کیے جا رہے ہو؟ ——— بتاؤ کب جا رہے ہو اسے لینے؟

کرتار سنگھ :۔ اگر حکم ہو تو آج ہی۔

رنجیت سنگھ :۔ ہماری مرضی تو یہ ہے کہ ابھی جاؤ۔ نیک کام میں دیر کرنے کی ضرورت نہیں۔

کرتار سنگھ :۔ بہت خوب جاتا ہوں۔

رنجیت سنگھ :۔ شاباش ہمیں تم سے یہی امید تھی —— جلد جاؤ اور جلد تر آؤ۔ امرت کور کو یقین دلا دینا، ہم نے اس کی خطا معاف کر دی۔ اب بھی ہمارے دل میں اس کی جگہ ہے۔ اس کی جگہ آج تک خالی ہے اور وہ اسی دن پُر ہو گی جس روز وہ آ جائے گی۔

باب ۴۲

بھائی کے آنسو

فاطمہ نے زلیخا کو ساری سرگزشت سُنا دی۔ اس کے الفاظ میں درد تھا، کسک تھی، اثر تھا۔ زلیخا کی آنکھیں اس کی باتیں سُن کر اَب گوں ہوگئیں۔ اس نے صدق دل سے اسے معاف کر دیا۔ اب فاطمہ اپنا اکثر وقت زلیخا ہی کے پاس صرف کیا کرتی تھی۔ پچھلی تلخی پورے طور پر دور ہو چکی تھی اور دونوں میں وہی ربط و خلوص پیدا ہوگیا جس کی مثالیں دی جاتی تھیں۔

حبیب خاں کے حادثہ شہادت کے بعد سے زلیخا گھلتی چلی جا رہی تھی۔ اسے بُخار رہنے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک غائب ہو چکی تھی۔ اس کا رنگ روپ بگڑ چکا تھا۔ وہ اب بستر سے لگ گئی تھی۔ ذرا ادھر بات کرتی تھی تو دیر تک اُکھڑے ہوئے سانس سے پریشان رہتی تھی۔

ایک روز فاطمہ حسب معمول اس کے پاس بیٹھی تھی۔ زلیخا کا بچّہ اس کی گود میں تھا۔ زلیخا جب سے بستر پر پڑی تھی۔ فاطمہ نے اصرار کر کے اس کی نگرانی اور دیکھ بھال اپنے ذمہ لی تھی۔ وہی اس کی پرورش کرتی تھی۔ وہ راتوں کو جاگ جاگ کر اس کی خدمت کرتی تھی۔ ذرا اس کی طبیعت بے کل ہوئی اور وہ بیقرار ہو جاتی۔ شاید اپنی کوکھ کے بچّہ سے بھی وہ اس سے زیادہ محبت نہ کرسکی۔ جتنی گل حبیب سے کرتی تھی۔ اس نے بچّہ کا نام گلباز اور حبیب کی مشترک یادگار کے طور پر گل حبیب تجویز کیا تھا۔ اور زلیخا نے بڑی مسرت کے ساتھ یہ تجویز منظور کرلی تھی۔ گل حبیب اس کی گود میں مچل رہا تھا، اور وہ اسے سنبھال رہی تھی۔

زلیخا نے ایک بجھے ہوئے تبسّم کے ساتھ بچّہ اور فاطمہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرا آخری وقت قریب آ چکا ہے نہ جانے کب رُوح پرواز کر جائے!"

فاطمہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"بس اب نہ کہنا کچھ!"

زلیخا:۔ مجھے موت کی آرزو ہے۔ فکر جو کچھ تھی وہ اس لڑکے کی تھی، سو وہ تم نے دُور کر دی۔

فاطمہ:۔ ایسی یاس انگیز باتیں کیوں کرتی ہو؟ بیمار کون نہیں پڑتا۔ اچھی ہو جاؤگی۔

زلیخا:۔ اپنی حالت تم سے زیادہ جانتی ہوں۔ چل چلاؤ کا وقت آ پہنچا ——

(گل حبیب کی طرف دیکھ کر) کیوں رے! کبھی ہمیں بھی یاد کرے گا؟ چل ہٹ، تیری آنکھوں سے بے مروتی ٹپک رہی ہے تو کیوں یاد کرنے لگا۔ اچھا دیکھ اپنی فاطمہ خالہ کو بہت چاہا کرنا۔ ان کا اگر تو نے خیال نہ کیا تو دودھ نہیں بخشوں گی ——!

گل حبیب مسکرانے لگا۔ فاطمہ نے اسے بھینچ کر کلیجہ سے لگا لیا، اور کہا۔

"دیکھو تمھاری احمقانہ باتوں کا یہ مذاق اڑا رہا ہے۔"

زلیخا:۔ یہی تو کرے گا، اور اس سے توقع بھی کیا ہے ——

کنڈل رہے؟

یہ کہہ کر اس نے ذرا گھور کر گل حبیب کو دیکھا۔ وہ ہونٹ نکال کر رونے لگا۔

فاطمہ نے اسے پیار کرتے ہوئے زلیخا سے کہا۔

"چارپائی پر بیمار پڑی ہو، لیکن حرکتیں وہی ہیں۔ مُفت میں رُلا دیا، ننھے سے بچّے کو۔"

زلیخا مسکرانے لگی۔

یکایک لاڈو دوڑی ہوئی آئی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں، اس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ فاطمہ اور زلیخا اسے دیکھ کر گھبرا گئیں۔ دونوں نے ایک ساتھ پوچھا۔

"کیا ہوا لاڈو! تو اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہے؟"

اس کے منہ سے صرف ایک لفظ نکلا،

"کرتار سنگھ"

اور پھر وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ کرتار سنگھ کا نام سن کر زلیخا کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ وہ سب کچھ سمجھ گئی۔ اس کے دل نے خطرہ کا احساس کر لیا۔ اس نے کہا۔

"شاید وہ مجھے گرفتار کرنے آئے ہیں۔ شاید مہاراجہ نے انھیں بھیجا ہے"۔

لاڈو بولی:۔

"ہاں یہی بات ہے۔ ایک سپاہی یہی کہہ رہا تھا۔ اس گھر کا چاروں طرف سے سکھ سپاہیوں نے محاصرہ کر لیا ہے، اب کیا ہوگا؟"

یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔

زلیخا نے بڑے وقار اور شان کے ساتھ کہا۔

"پگلی کہیں کی، روتی کیوں ہے؟ جا فاطمہ کے گھر میں چھپ جا"۔

لاڈو بولی۔

"وہ تمہیں گرفتار کرنے جو آئے ہیں؟"

زلیخا نے اطمینان بھرے لہجہ میں کہا۔

"وہ احمق ہیں۔ میں اب مسلمان ہوں، ایک مجاہد کی عزت، ایک شہید کا ناموس، ایک غازی کی ماں ——— مجھ تک کسی کرتار یا رنجیت کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔ وہ

ہاتھ گل جائے گا۔ جو میری طرف بڑھے گا۔"

پھر وہ فاطمہ سے مخاطب ہوئی۔

"اب بھی خفا ہو گی کہ میں موت کی آرزومند کیوں تھی ——— ؛ لیکن خدا نے تمہاری نہیں سنی۔ میری سن لی۔ دیکھو میرے پاؤں سُن ہو چکے ہیں۔ میرے ملتھے پر ٹھنڈا پسینہ نمودار ہو چکا ہے۔ موت میرے پاس آ چکی ہے۔ میں تمہیں گواہ کرتی ہوں۔ خدا ایک ہے۔ محمدؐ اس کے رسولؐ برحق ہیں۔ گل کو تمہیں سونپتی اور خدا کے حوالہ کرتی ہوں۔ اور ہاں دیکھو۔ لاڈو کا بھی خیال رکھنا، میں اس سے بہت خوش ہوں۔ اس نے میری بڑی خدمت کی ہے۔"

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ اس کی گردن ڈھلک گئی اور اس کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

یہ سب کچھ اس قدر جلد ہوا کہ فاطمہ کئی سیکنڈ تک سمجھ بھی نہ سکی کہ یہ کیا ہو گیا۔ لاڈو کی ہچکیوں سے وہ چونکی۔ اس نے اپنے جذبات پر غالب آتے ہوئے اس سے کہا:۔

"دوسرے دروازے سے تو میرے گھر چلی جا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کرتار سنگھ تجھے دیکھ لے اور بدلہ لے۔"

وہ روتی ہوئی، سسکیاں لیتی چلی گئی۔

اسے گئے ہوئے مشکل سے ایک منٹ ہوا ہو گا کہ سپاہی گھر میں گھس آئے۔ کرتار سنگھ نے بلند آواز سے پوچھا۔

"امرت کور کہاں ہے؟"

کسی نے اس کمرہ کی طرف اشارہ کر دیا جو اس کا مستقل مسکن تھا۔ وہ پیکرِ غضب بنا اس کمرہ میں آ یا۔ فاطمہ کو دیکھ کر ذرا جھجکا۔ پھر کرخت آواز میں کہا:۔

"امرت کور کہاں ہے؟"

وہ بولی -

"میں جان گئی، آپ سردار کرتار سنگھ ہیں - ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ آپ ہی کا ذکر کر رہی تھی، اور یہی ذکر کرتے کرتے وہ سو گئی"

کرتار سنگھ نے ڈپٹ کر کہا -

"اسے بلاؤ"

فاطمہ نے زلیخا کے منہ سے چادر ہٹالی اور کہا۔

"یہ رہی، آپ جگا سکتے ہوں تو جگا لیجئے"

کرتار سنگھ اس کی طرف جھکا، اس نے ایک نظر میں پہچان لیا، امرت کور اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ وہ بے بسی کے ساتھ فاطمہ کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ کہنے لگی۔

"بہت چاہتی تھی آپ کو، لیکن دیکھیے کیسی بے خبر سو رہی ہے۔ ہمیشگی کی نیند - اب اسے کوئی نہیں جگا سکتا۔ اب یہ قیامت میں ہوشیار ہو گی۔ بھائیوں کا وجود بہنوں کے لیے زندگی کا پیام ہوتا ہے۔ آپ کتنے اچھے ہیں کہ اس کے لیے موت کے پیامی بن کر آئے۔ آپ کی تشریف آوری کی خبر سنتے ہی اُس نے صرف آپ سے نہیں، دنیا سے منہ موڑ لیا"

کرتار سنگھ نے کوئی جواب نہ دیا۔ آنکھوں پر رومال رکھ کر بچوں کی طرح چیخ چیخ کر رونے لگا۔

بلند پایہ مصنفین کے تاریخی ناول

الناصر — رئیس احمد جعفری
اندلس کے قصر زہرا کی ایک حسین و جمیل داستان — قیمت -/۶ روپے

ایک مہاجر — رئیس احمد جعفری
گزشتہ انقلاب کی تاریخی روئیداد — قیمت -/۵ روپے

حق و باطل — رئیس احمد جعفری
عبداللہ بن زبیر کی داستان — قیمت -/۷ روپے

خون بہتا رہا — رئیس احمد جعفری
ادب و انشاء کی خوبیوں کا مجموعہ — قیمت -/۱۰ روپے

سلطانہ — رئیس احمد جعفری
روس کے ایک مسلمان سردار قبیلہ کی لڑکی نشاط خانم کی خود نوشت سرگزشت — قیمت -/۶ روپے

مجاہد — رئیس احمد جعفری
۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۷ء تک کے لرزہ خیز واقعات — قیمت -/۶ روپے

بیرم خاں — حسین انور
ہمایوں کے عہد کی ایک حیرت انگیز رومانی داستان — قیمت -/۹ روپے

زیب النساء — حسین انور
ایک ناقابلِ فراموش تاریخی ناول — قیمت -/۹ روپے

خون — قیسی رامپوری
وحشت و بربریت کا عجیب و غریب مرقع — قیمت ۳/۵۰ روپے

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز ادبی مارکیٹ، چوک انار کلی لاہور

تاریخ وسیاست

تاریخ فرشتہ تالیف: ملا محمد قاسم ہندو شاہ فرشتہ — ترجمہ: عبدالحی خواجہ
عہد اسلامی کی تاریخ کا مستند مرقع (دو جلدوں میں) — قیمت -/۴۵ روپے

تاریخ شام تالیف: فلپ کے حتی — ترجمہ: غلام رسول مہر
دورِ قدیم سے دورِ حاضر تک اہل شام کی مستند تاریخ — قیمت: -/۲۴ روپے

تاریخ لبنان تصنیف: فلپ کے حتی — ترجمہ: غلام رسول مہر
دورِ قدیم سے دورِ حاضر تک اہل لبنان کے مکمل وجامع حالات — قیمت: -/۱۵ روپے

منتخب التواریخ تصنیف: ملا عبدالقادر ملوک شاہ بدایونی — ترجمہ: محمود احمد فاروقی
تاریخ مبارک شاہی اور نظام التواریخ کا صحیح انتخاب — قیمت -/۱۸ روپے

تاریخ اشاعت اسلام تالیف: شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی
عہد نبوی سے لے کر آج تک اشاعت اسلام کی مکمل و مستند تاریخ — قیمت -/۱۵ روپے

تاریخ اسلام — عبدالحکیم نشتر جالندھری
اسلام کی صحیح اور جامع تاریخ — قیمت ۱۳/۵۰ روپے

ظہیر الدین بابر اور ان کا عہد مصنف: ولیم ارسکن — مترجم: حسین انور
بابر اور ان کے عہد پر ایک مستند کتاب — قیمت -/۱۵ روپے

واجد علی شاہ اور ان کا عہد — رئیس احمد جعفری
واجد علی شاہ تاجدار اودھ کے مکمل حالات — قیمت -/۱۵ روپے

بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد — رئیس احمد جعفری
۱۸۵۷ء کے ہولناک غدر اور جنگ آزادی کے مفصل حالات — قیمت -/۲۵ روپے

تاتاریوں کی یلغار تالیف: ہیرلڈلیم — ترجمہ: عزیز احمد

ہیرلڈلیم کی شہرۂ آفاق تالیف (دوسرا ایڈیشن) — قیمت ۱۳/۵۰ روپے

جنگِ عظیم (باتصویر) تصنیف: رومیں ایل سنائیڈر — ترجمہ: غلام رسول مہر

دوسری عالمی جنگ کی ایک نہایت عمدہ تاریخ — قیمت -/۲۰ روپے

قسطنطنیہ تصنیف: ہیرلڈ ولیم — ترجمہ: مولانا غلام رسول مہر

ڈھائی ہزار سال کی سرگزشت — قیمت -/۸ روپے

انسائیکلوپیڈیا (تاریخ اسلام) مرتبہ: ولیم ایل لینگر — ترجمہ: غلام رسول مہر

مشرق ادنیٰ و مشرق اوسط کے ۱۹ اور ۲۰ ویں صدی کی سرگزشت — قیمت -/۱۴ روپے

انسائیکلوپیڈیا (تاریخ عالم) مرتبہ: ولیم ایل لینگر — ترجمہ: غلام رسول مہر

جلد دوم - ابتدا سے لے کر عہد نپولین تک کے مستند حالات — قیمت -/۱۴ روپے

انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم مرتبہ ولیم ایل لینگر — ترجمہ: مولانا غلام رسول مہر

جلد سوم - انقلابِ فرانس سے لے کر ۱۹۶۵ء تک کے حالات — قیمت -/۱۷ روپے

۱۸۵۷ء — مولانا غلام رسول مہر

۱۸۵۷ء تک کی جنگ آزادی پر اردو زبان میں پہلی کتاب — قیمت -/۹ روپے

۱۸۵۷ء کے مجاہد — مولانا غلام رسول مہر

پہلی جنگ آزادی میں حصہ لینے والوں کی مکمل سرگزشت — قیمت -/۶ روپے

جماعتِ مجاہدین — مولانا غلام رسول مہر

سید احمد شہید کی جماعت کے تنظیمی حالات — قیمت -/۸ روپے

سرگزشتِ مجاہدین — مولانا غلام رسول مہر

بہادر اور نڈر مجاہدین اسلام کی جاں نثاری کی مکمل داستان — قیمت ۱۳/۵۰ روپے

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی لاہور